الطاف حسین حالی نمبر

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر» میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 104، جنوری تا مارچ 2015

مولانا الطاف حسین حالی نمبر

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
مدیر منتظم : زاہدہ پروین

مدیر اعلیٰ : نگہت سلیم
مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آراء کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آراء نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل اس ایڈریس پر بھیجی جا سکتی ہیں:

☆☆☆☆

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)   40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)   160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ ف رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت: علی یاسر 051-9269712
سرکولیشن: میر نواز سولنگی 051-9269708

مطبع: NUST یونیورسٹی پریس،
سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

رابطہ: 051-9269721، 051-9269714
Email: nighatsalem.dir.ce.pal@gmail.com
ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو اداریہ 09

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں (مضامین)

ڈاکٹر احسان اکبر الطاف حسین حالی کی ملی شاعری 11
پروفیسر سحر انصاری الطاف حسین حالی: شاعر اور نثر نگار 19
خاور اعجاز حالی کی اردو غزل 25
محمد حمید شاہد تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی 45
ڈاکٹر جمال نقوی فکرِ حالی: غزل سے نظم تک 51
ڈاکٹر ضیا الحسن حالی کی غزل: جدید اردو غزل کا نقشِ اوّل 55
ڈاکٹر منور ہاشمی حالی کی کتاب ''یادگارِ غالب'' پر ایک نظر 67
ڈاکٹر نثار ترابی حالی کا ابتدائی نثری اسلوب 73
ڈاکٹر صلاح الدین درویش حالی کا نظریۂ سماجی تبدیلی 79
ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد ''مسدسِ حالؔی'' اور عہدِ حاضر میں اس کی معنویت 89
حمیدہ شاہین حالی کی نظم ''مناجات بیوہ'' 101
ایم خالد فیاض وارث علوی کا حالؔی 105
عابد خورشید الطاف حسین حالی کی یک کتابی طویل نظم 113
کلیم احسان بٹ عہدِ سرسید میں انگریزی اور حالی کی مقدمہ شعر و شاعری 119
سلطان فریدی مولانا حالی کی مرزا غالب سے اصلاحِ سخن 140
تسنیم صنم مولانا الطاف حسین حالی فن اور شخصیت کے آئینے میں 143
نعیم راجہ حالؔی کا تنقیدی شعور 146
شگفتہ پروین یادگارِ حالی 163
اختر رضا سلیمی زندگی نامہ (الطاف حسین حالی) 173

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر (توشۂ خاص)

ڈاکٹر اسد مصطفیٰ	حیاتِ حالی از منشا پانی پتی: ایک غیر مطبوعہ سوانح	177
قریش علی منشا پانی پتی	اخلاقیات و نجی حالاتِ زندگی	184

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں (غزلیات در زمینِ حالی)

انور شعور	مرا یار مجھ سے جدا ہو گیا	201
سلطان سکون	صحرا میں رہ کے خوش ہیں کہیں گلستاں سے ہم	202
صابر ظفر	معمورۂ ازل کی رہی ہے خبر کہاں	203
قاضی حبیب الرحمٰن	بس کہ...... از قسمِ مُمکنات نہیں	204
اعجاز گل	جب کوئی شہر طلب حاصل رفتار نہیں	205
ارشد جاوید	تھی مجھے مرغوب تنہائی بہت	206
خالد خواجہ	ہم نے کھیتوں سے بے وفائی کی	207
اخلاق عاطف	تھی کبھی اس میں پذیرائی بہت	208
امتیاز الحق امتیاز	دل پر جو دل نے مُہر لگا دی تو ڈر کہاں	209
شہاب صفدر	دیکھتے ہم نہ کسی راہگذر کی صورت	210
شہزاد بیگ	اس عہد ناسپاس میں قدر ہنر کہاں	211
خورشید ربانی	خامشی کو صدا کیا تُو نے	212
علی یاسر	آئینۂ تنہائی سرِ شام ہے درپیش	213
سلطان فریدی	یہی زندگی تو گزر جائے گی	214
اسد اعوان	یارانِ رفتگاں کی نشانی نہ پوچھیے	215
ثنااللہ ظہیر	یوں تو زمیں میں کتنے ہی آتش فشاں رہے	216
تجمل جرال	تو سامنے بھی ہو تو وہ ذوقِ نظر کہاں!	217
مسعود تنہا	میری نظر میں ایسا کوئی معتبر کہاں	218
فاخرہ نورین	آہِ رسا ہمیں سے گئی تھی مگر کہاں	219
جبار واصف	ٹھیک ہے میں نے بے وفائی کی	220
محمد لطیف سیف	صدقے جاؤں تری عطاؤں پر	221
عبادت حسین	ہم جو صحرا میں گھر بنانے لگے	222

منظوم خراجِ عقیدت

انور شعور	نذرِ حالی	223
رانا سعید دوشی	اپنے ماضی کا حال	224
اویس الحسن	بیادِ حالی	226

دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں (پاکستانی زبانوں کے ادب پر حالی کے اثرات)

ڈاکٹر فیاض لطیف / ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو	الطاف حسین حالی کے سندھی ادب پر اثرات	227
ارشاد شاکر اعوان	الطاف حسین حالی کے ہندکو ادب پر اثرات	233
نور خان محمد حسنی	الطاف حسین حالی کے براہوی ادب پر اثرات	246
زاہد حسن	الطاف حسین حالی کے پنجابی ادب پر اثرات	251
فہیم شناس کاظمی	الطاف حسین حالی کے سندھی ادب پر اثرات	260
ڈاکٹر گل عباس اعوان	الطاف حسین حالی کے سرائیکی ادب پر اثرات	267
محمد پناہ بلوچ	الطاف حسین حالی کے بلوچی ادب پر اثرات	275
اسد اللہ اسد	الطاف حسین حالی کے پشتو ادب پر اثرات	279

نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں (انتخابِ نثرِ حالی)

خودنوشت

الطاف حسین حالی	بیانِ حالی	283

مضامین

الطاف حسین حالی	دیوانِ حافظ کی فالیں	288
	مومن کے سوانحی حالات	292
	سید احمد خان اور اُن کے کام	300

سفرنامہ

الطاف حسین حالی	ایامِ تعطیل میں ایک سفر کی کیفیت	305

یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں (انتخابِ شعرِ حالی)

الطاف حسین حالی	مدوجزر اسلام سے انتخاب	313

غزلیات (دورِ اول)

الطاف حسین حالی	رنج اور رنج بھی تنہائی کا	318
	دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا	319
	آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم	320
	ہے جستجو کہ خُوب سے ہے خُوب تر کہاں	321
	کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں	322
	حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے	322
	دُھوم تھی اپنی پارسائی کی	323

غزلیات (دورِ دوم)

الطاف حسین حالی	گو جوانی میں تھی کج رائی بہت	325
	اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت	326
	جاذبِ رحمت ہے مقناطیسِ عصیاں اپنے پاس	327
	اِک ہم کو مہم بر سرِ ایام ہے درپیش	328
	درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص	328
	یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں	329
	جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجیے	330
	فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی	331

نظمیں (دورِ اول)

الطاف حسین حالی	جواں مردی کا کام	333
	برکھا رُت	336

نظمیں (دورِ دوم)

الطاف حسین حالی	آزادی کی قدر	343
	قانون	343
	تدبیرِ قیامِ سلطنت	344
	قوم کی پاسداری	344

رباعیات (دورِ اول)

الطاف حسین حالی	ہو عیب کی خُو، یا ہنر کی عادت	346
	مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے	346
	فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گُزرے	346
	کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ	347
	گر کُفر میں فرعون کا ثانی نکلا	347

رباعیات (دورِ دوم)

الطاف حسین حالی	ہستی تری گو نہیں ہے محتاجِ دلیل	348
	اے عقل کی فہم کی رسائی سے دُور	348
	سقراط مُنادی میں ترے کام آیا	348

مرثیہ

الطاف حسین حالی	مرثیۂ غالب کے چند بند	349

طنزیہ و مزاحیہ شاعری

الطاف حسین حالی	تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر	351
	سید احمد خان کی مخالفت کی وجہ	351
	قحطِ اہل اللہ	352
	رؤسائے عہد کی فیاضی	353
	ایمان کی تعریف	354

☆ ☆ ☆ ☆

اداریہ

الطاف حسین حالی نے اگر چہ 31 دسمبر 1914 کی شب وفات پائی، لیکن حالی کے سوانح نگاروں اور مورخین نے کسی بھی جگہ وفات کے وقت کا تعین نہیں کیا۔ ہماری رائے میں اگر ان کی وفات رات بارہ بجے سے پہلے ہوئی تو پھر 31 دسمبر ہی ان کا یومِ وفات ہے لیکن بصورت دیگران کا یوم وفات یکم جنوری 1915 بنتا ہے، جو ان کی تدفین کا دن بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو 2015 ہی حالی کی صد سالہ برسی کا سال بنتا ہے۔

حالی اردو ادب کے ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے کسی ایک صنف کو نہیں پورے اردو ادب کو متاثر کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے اثرات دیگر پاکستانی زبانوں تک بھی پہنچے۔

اکادمی ادبیات پاکستان اس سے قبل بھی کئی مشاہیرِ ادب پر ادبیات کے خصوصی نمبر شائع کر چکی ہے۔ جن میں: فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، جوش ملیح آبادی، احمد فراز اور منیر نیازی نمبر نے آپ جیسے صاحبان ذوق سے خصوصی داد پائی اور کئی نمبر ز دوبارہ شائع کرنا پڑے۔

ادبیات کا الطاف حسین حالی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر چہ اکادمی، معماران پاکستانی ادب کے سلسلے کے تحت بھی ان پر ایک کتاب تحریر کروا رہی ہے جو بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہو گی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حالی جیسی بڑی ادبی شخصیت کو کسی ایک کتاب تک محدود رکھنا (چاہے وہ کتنی ہی جامع کیوں نہ ہو) زیادتی ہو گی۔ پھر یہ بات بھی اہم ہے کوئی مصنف، چاہے وہ کتنا ہی غیر جانب دار کیوں نہ ہو حالی جیسی بڑی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اس خصوصی نمبر میں چوں کہ ملک کے ممتاز لکھنے والوں نے حالی کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر سے

تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور یوں ایک جریدے میں کئی لکھنے والوں کے نقطۂ نظر شامل ہو گئے ہیں، اس لیے اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

ایک ایسی شخصیت جس پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہو اس کے بارے میں کوئی نئی بات کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم نے آغاز ہی میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس خصوصی نمبر میں ''حالی کے پاکستانی زبانوں کے ادب پر اثرات'' کے لیے ایک خصوصی گوشہ مختص کیا جائے گا۔ تاکہ حالی کے پاکستانی ادب پر اثرات کے نئے گوشے بھی سامنے آئیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں؛ سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، براہوی اور ہندکو کے ممتاز لکھنے والوں کے مقالات میسر آ گئے۔ ہمارے خیال میں یہی اس نمبر کی انفرادیت ہے۔

اس شمارے کی ایک اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں حالی کی ایک غیر مطبوعہ سوانح عمری کا پورا باب بھی شامل ہے جو ان کے پڑنواسے قریش علی منشا پانی پتی نے لکھی تھی۔ واضح رہے کہ منشا پانی پتی آج سے ربع صدی قبل انتقال کر گئے تھے۔ اس غیر مطبوعہ سوانح پر ایک تحقیقی اور تنقیدی مضمون بھی شامل ہے تاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں اس سوانح عمری کا اجمالی خاکہ ابھر سکے اور تحقیق کی نئی راہیں کھلیں۔

ادبیات کے آئندہ شمارے میں ہم تحقیق و تنقید کے لیے الگ سے ایک حصہ مختص کر رہے ہیں جس میں ایچ۔ ای۔ سی کے طے کردہ قواعد و ضوابط کے مطابق مقالات شائع کیے جائیں گے۔ تاکہ دیگر تحقیقی مجلوں کی طرح ادبیات بھی ایچ۔ ای۔ سی کی فہرست میں شامل ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سلسلے میں محققین اور اساتذہ کا ہمیں تعاون حاصل رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

ڈاکٹر احسان اکبر

الطاف حسین حالؔی کی مِلی شاعری

اقبال نے جب کہا کہ

؎ مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

تو دراصل ایک بڑی تاریخی تہذیبی صداقت بیان کردی تھی۔ برصغیر کے ہندو مسلم مناقشات کے پس منظر میں تو یہ بات اکثر کو عجب معلوم ہوگی مگر جس کسی کو برصغیر میں مسلم مدنیت، تاریخی ارتقاء میں ذہن نشین رہی ہے اسے ذرا حیرت نہ ہوگی کیوں کہ مسلمان ہر عہد میں یہاں امن و عافیت سے رہنے کی سعی کرتے آئے ہیں۔ شہاب الدین غوری جسے برصغیر میں مسلم شناخت کا تاسیس گزار کہا جاتا ہے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کو یہ پیش کش کرتا ہے کہ سرہند، پنجاب وملتان ہمارے پاس رہ جائے باقی ہند تمہارا۔ اسی طرح کا امن دوست اور غیر متعصب رویہ شیر شاہ سوری سے سارے مغلیہ عہد تک چلتا ہے۔ عہدِ سلاطین میں اس کا مذکور یوں کیا گیا کہ تب ہندو عصبیت موجود ہی نہیں تھی۔ ۱۷۹۸ء سے قبل ہندو مسلم فسادات کبھی سنائی ہی نہیں دیتے تھے۔

مسلم ذہن وفکر کے نمائندہ کرداروں کے ہاں ہم آغاز ہی سے ہمہ دوستی کی فضا پاتے ہیں۔ سرسید ہندو مسلم کو اپنی دو آنکھیں قرار دیتے رہے۔ حالؔی جو مسلم تہذیبی شناخت کا پہلا ادبی حوالہ بنتے ہیں اس حوالے سے اور بھی نمایاں ہوتے ہیں کہ مسلم ماضی کی حسین یادیں ان کا موضوع بھی بنتی ہیں۔ ''مدوجزر اسلام'' ان کا "Magnum Opus" قرار پاتا ہے۔ مگر مجال ہے کہ کہیں انہوں نے برصغیر کی کسی غیر اسلامی شناخت کی تحقیر کا اشارہ بھی دیا ہو۔ یہ بے تعصبی اس مُحِبِ قوم کی بنیادی شناخت ہے۔

پوری علی گڑھ تحریک لے لیجیے، مسلم نشاۃ ثانیہ جس کا مقصود تھا۔ اہلِ قلم ہوں، معلمین ہوں کسی کے ہاتھ سیاہی سے آلودہ نہیں۔ حد یہ کہ ''ندوۃ العلماء اور دیوبند ایسی دینی تربیت گاہیں بھی تعصبِ مذہبی سے خالی اور پاک ملیں گی۔ حالؔی مسلم ماضی سے مسلمانوں کے حال تک پر نظر ڈالنے والے دانشور ہیں۔ ان کے ہاں موجود بے تعصبی ان کی شخصیت کی پہلی شناخت ہے۔ دیکھیے ''حُبِ وطن'' نامی نظم میں وہ سارے اہلِ ہند کے لیے کس طرح آغوش کشا ہیں:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بدھ مت ہو کہ یا ہو برہمو
جعفری ہو وے یا کہ حنفی ہو　　جین مت ہو وے یا کہ ہو ویشنو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آباد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد

تاریخِ ادب لکھتے ہوئے رام بابو سکسینہ حالی کی شاعری کو اس اتحادِ وطنی کی علامت قرار دیتے ہیں۔ حدیہ کہ "مسدسِ حالی" ایسی قومی نظم میں بھی حالی یہی لہجہ برقرار رکھتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے تو "مسدسِ حالی" کی اس ناتے خصوصیت سے تعریف کی جب کہا کہ:

> "یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ ادب ارتقائے اردو میں ایک سنگِ میل سمجھنا چاہیے۔۔۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔"

تاہم برصغیر میں امن کی فضا درجہ بدرجہ متاثر ہوتی چلی گئی۔ ہندوؤں میں مغربی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ جذبات وافکار کا اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۸۹۲ء کا زمانہ وہ تھا جب سر سید احمد خاں کو بھی یہ شک محکم ہو چکا تھا کہ اب یہ دونوں قومیں کسی کام میں دلی محبت سے شامل نہ ہو سکیں گی۔ تب حالی نے "شکوہ ہند" نامی نظم لکھی۔

رخصت اے ہندوستاں! اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں

حالی کے ہاں ہی نہیں برصغیر کے سارے مسلم اہلِ فکر کے ہاں وطن دوستی کا یہی رُخ رہا ہے۔ حدیہ کہ جو علمائے اسلام بھی رہے ہیں ان کے ہاں بھی ہندو دشمنی کبھی نہیں رہی۔ سر سید، حالی، شبلی، نذیر احمد تو مصلحینِ اسلام کہے جائیں گے۔ ان کے ہاں بھی ایسا تصور کبھی نظر نہیں آئے گا۔ علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، علامہ مشرقی، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبدالسلام، علامہ تاجور نجیب آبادی مذہبی بنیاد رکھنے والے اکابر اس تعصب سے آزاد تھے۔ خالد بن سعید ہندو مسلم مزاجوں کے مابین موجود اس فرق کے تناظر کو بڑی عمدگی سے بیان کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ:

> "ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرزِ فکر کی نمائندگی جس قدر یہ دو کتابیں الطاف حسین حالی کی "مسدس" اور بنکم چندر چیٹر جی کی "آنند مٹھ" کرتی ہیں کوئی اور کتاب نہیں

> کرتی۔ ’’آنند مٹھ‘‘ میں بدنامِ زمانہ اور انتہائی اشتعال انگیز ’’بندے ماترم‘‘ بھی شامل ہے۔ اس کے اندر بنگال میں مسلمانوں کے دورِ انحطاط کے دوران ہندو قومیت کے تصور نے جس طرح عروج حاصل کیا اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ہندوؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور سستی اور کاہلی کو خیر باد کہنے کی دعوت دی گئی ہے جب کہ ’’مسدسِ حالیؔ‘‘ میں سارا زور ہندوستانی مسلمانوں سے یہ التجا کرنے پر صرف کر دیا گیا ہے کہ وہ جہالت، خود غرضی اور آرام طلبی کو خیر باد کہہ کر ایک منظم، محنتی اور متحدہ قوم کا شعار اختیار کریں۔‘‘

’’مسدسِ حالیؔ‘‘ دراصل اسلام کے عروج سے لے کر مسلم قومی زوال تک کی داستان ہے۔ ایسی قومی دستاویز لکھتے ہوئے بھی حالیؔ کا قلم تعصب، ضد اور نفرت سے آزاد رہتا ہے۔ اگر اردو کی قومی اور ملی شاعری کا جائزہ لیا جائے گا تو اس کا حرفِ آغاز حالیؔ، شبلی، نذیر احمد اور آزادی کے عہد سے ہوگا۔ اس یادگار نظم سے ’’ظہورِ اسلام‘‘ کا قصہ دیکھیے:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی   عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی   اک آواز میں سوئی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے   کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

آنحضورؐ سے محبت میں یہ اشعار دیکھیے:

مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا   قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا   اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یہ ضرب المثل شاعری کیسے بھول سکتی ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا   مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا   وہؔ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ   یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

حالیؔ ہی کی جرأت تھی کہ وہ مسلمانوں میں موجود فہی افراط و تفریط پر گرفت کر سکے۔ فرماتے ہیں۔

نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں   اماموں کا رُتبہ نبیؐ سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں   شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے   نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

حالؔی سمجھتے تھے کہ برصغیر میں ہماری شکست تہذیبی شکست تھی سو تہذیبی عروج سے زوال کو روکا جا سکتا ہے۔ یہ عروج اسلام اور سیرتِ نبویؐ کے وسیلے سے ممکن ہے۔ ہمارے ہاں موجود ملی جمود اور ادبی بے مقصدیت بھی ان کی گرفت میں آئے۔ دُعا پر وہ مسدس کا خاتمہ کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا تھا کہ:

> ”تہذیب اور تاریخ کا پورا سوادِ اعظم حالؔی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے کھنڈر پر حالؔی بے پایاں انسانی دردمندی اور غیرتِ قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پر آنسو بہاتے ہیں۔ سوادِ رومۃ الکبریٰ میں اقبال حالؔی ہی کی آواز یا بازگشت ہیں۔ شاعری کا اتنا بڑا کینوس (Canvas) حالی اور اقبال ہی کے بس کا تھا۔ ہر بڑی تہذیب کے کھنڈر پر کوئی نہ کوئی حالؔی یا اقبال ضرور نمودار ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو وہ تہذیب بے ترکہ ہے جس کی تاریخ کے اوراق اور اقوام کی تقدیر میں کوئی وقعت نہیں۔ بڑے شاعروں کی شاعری میں تاریخی تہلکے انسانی تہذیب میں ڈھلتے ہیں۔ شاعری خوانچے والوں کی پکار نہیں ہوتی۔ انسانیت کے خاصانِ بارگاہ کی فغانِ نیم شبی اور گریۂ سحری ہوتی ہے۔ حالؔی اور اقبال کی شاعری اسی پایہ کی ہے۔“

محمد حسن عسکری ”جوہر“ اور ”شخصیت“ کی دو قسموں کے اندر حالؔی کی ذات کو بانٹتے ہیں پھر بھی انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ ان کا اخلاقی جوہر جب اپنی عشقیہ شخصیت کو قبول کرتے ہوئے شعر کہتا ہے تو:

> ”وہ شاعری پیدا ہوتی ہے جو اردو کے بہت سے اچھے اچھے شاعروں کو نصیب نہیں ہوتی۔“

شاعری میں حالؔی اپنی نظم نگاری کے باعث اور نظم کے سلسلے میں نظمِ آزاد اور ”انجمنِ پنجاب“ کے ناتے زیادہ بحث میں لائے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے زوالِ ہند کو جس شدت سے حالؔی نے محسوس کیا تھا اُس نے ان کو یہ آگاہی شروع ہی میں دے دی تھی کہ قوموں کے زوال کا ان کی تخلیقی کاوشوں کی گمراہی سے بنیادی تعلق ہوتا ہے۔ سو حالؔی نے اپنے ہاں سب سے پہلے اصلاحِ شعر آغاز کی۔ خود نئی شاعری کی (جو قومی ضروریات و لوازم کو موضوع کرتی تھی) پھر اس کے لیے نظم کی صنف برتنا ضروری لگا۔ حالؔی نے نئی نظم کہی۔ نئی نظم کا سہرا یوں حالؔی کے سر بندھا۔ حالؔی اب پنجاب آ چکے تھے ”انجمنِ پنجاب“ بنائی۔ اس کے زیرِ اہتمام موضوعاتی شاعری کی نشستیں منعقد ہوا کیں۔ یوں پنجاب میں نئی شاعری کی جڑ لگی۔ ’برکھا رُت‘، ’حبِ وطن‘ وغیرہ پر حالؔی کی جو یادگار

نظمیں ہیں انھی عنوانوں کی نشانیاں ہیں جو یہاں ہر نشست کے بعد اگلی نشست کے موضوعِ سخن کے طور پر پیشگی دے دیے جاتے تھے۔ حالی نے اردو، فارسی غزل کی عظیم الشان روایت کے ماحول میں جب اپنی یہ نظم اور یہ تازہ غزل چھاپنا چاہی تو خیال آیا کہ اس شاعری کے متعارف اور دفاع کے طور پر ابتدائیہ بھی ساتھ شامل کیا جائے۔ یہی ابتدائیہ مقدمۂ شعر و شاعری بنا اور اردو ادب میں تنقید کے نئے اسالیب کا خالق ہوا۔ یہ حالی کی ایک اور اولیت تھی ...... ایک اور عظمت۔

حالی نے نظم نگاری کو بہت توجہ دی مگر تغزل ان کا مزاج تھا۔ غزل ان کے دل کی آواز تھی اس کے مطالبے سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔ لازمۂ شعر کے ناتے ان کا کہنا تو یہ تھا کہ شعر کو مؤثر اور دل گداز ہونا لازم ہے۔ حالی نے کہا تھا:

اے شعر دل فریب نہ ہو تُو تو غم نہیں   پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تُو

رشید احمد صدیقی حالی کی غزل گوئی کے ناتے جب بات کرتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ حالی نظم نگار کے کمالات اپنی جگہ مگر "حالیِ زار" کی اصل پہچان تو ان کی غزل ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:

> "حالی غزل کے سارے لوازم برتتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو اس کے حدود سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ حالی غزل ہی نہیں شاعری کے بھی قابو میں نہیں آئے ...... انھوں نے ہمیشہ غزل کو اپنے قابو میں رکھا ...... بڑا شاعر وہ ہے جو فن اور موضوع کو اپنے قبضے میں رکھے۔"

حالی سے غالب نے کہا تھا کہ تم اگر شعر نہیں کہو تو ظلم کرو گے۔ اس کا ثبوت حالی کی غزل نے خود فراہم کر دیا۔ اشعار دیکھیے:

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح   لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا   بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

قلق اور دل کا سوا ہو گیا   دلاسہ تمھارا بلا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت   وہ مُڑ مُڑ کے تکنا بلا ہو گیا

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام   کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

درمیاں پائے نظر ہے جب تک ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

۱۸۹۳ء میں آنے والی حالؔی کی نثری تصنیف ''مقدمۂ شعروشاعری''علیحدہ کتاب کے طور پر سامنے آئی۔ چوں کہ تنقیدِ شعراس کا موضوع ہےلہٰذا اس کا پہلے ذکر کر دیا گیا۔ حالؔی کا باقاعدہ نثری کام سیرت نگاری کا ہے۔ ''حیاتِ سعدی''۱۸۸۴ء میں اور''یادگارِ غالب''۱۸۹۷ء میں طبع ہوئیں۔ ''مجالس النسا'' ۱۸۷۴ء میں پہلے چھپی تھی اور سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید''۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی۔ سعدی و غالب کی سوانح میں ان کے ادبی اور شاعرانہ کام کا جائزہ بھی لیا گیا ہےاور بطور انسان کے بھی ان دونوں کی شخصیات کو رکھا گیا۔ اردو میں جدید علمی حوالوں سے سیرت نگاری کا آغاز بھی حالؔی ہی کے قلم کی عطا ہے۔ ''حیاتِ جاوید''میں سرسید کی شخصیت کو انتہائی تفصیل سے دیکھنے دکھانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسے سرسید کی 'مدلل مداحی' بھی کہا گیا۔ مگر یہ طے ہے کہ حالؔی کے دشمن بھی حالؔی کی تحریر کو جھوٹ کے الزام سے کبھی ملوث نہیں کر سکے۔ سرسید احمد خاں کے طرزِ تحریر کی سادگی اور تکلف سے پرہیز والی صفات نے بعد کے لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت پر اثر ڈالا کہ اس کے بعد سادگی، روانی، ادائے مطلب اور تاثیر ہی کو تحریر کا کمال سمجھا گیا۔ حالؔی نے اس روش کو پہلی بار ایک صفت کہا تھا۔ الطاف حسین حالؔی اردو نثر کے بھی اتنے ہی بڑے محسن ہیں جتنے بڑے Genius وہ اردو غزل نگاری اور نظم نویسی میں دکھائی دیتے ہیں۔

نثر نگاری کے حوالے سے اردو کے پانچ بڑے اہلِ اسلوب اردو کے عناصرِ خمسہ کہلاتے ہیں۔ ان میں حالؔی کا مستقل مقام ہے اور''حیاتِ سعدی''(۱۸۸۴ء)اور''یادگارِ غالب''(۱۸۹۷ء)دو بڑے شاعروں کی سوانح عمریاں ہیں۔ حالؔی نے فارسی اور اردو کے ان دو عظیم شاعروں کے حالاتِ زندگی کی تفصیل بھی دی ہےاور ساتھ ساتھ ان کے ادبی قد و قامت سے بھی بحث کی ہے۔ غالب کی زندگی کے حالات کے ناتے تو ''یادگارِ غالب'' سے بڑھ کر کوئی اور بنیادی وسیلۂ معلومات ہی نہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ عبدالرحمٰن بجنوری اور حالؔی کی تحریروں ہی نے اول اول غالب کی ادبی شخصیت کی طرف اہلِ نقد کی توجہ مبذول کرائی۔ حالؔی نے یہ سوانح ہائے حیات لکھ کر اردو میں سیرت نگاری کی بنیاد ڈالی۔ ''حیاتِ جاوید''جو سرسید احمد خاں کے حالات و مقامات سے متعلق ہےاس میں ان کی یہی صلاحیت ایک اور مقامِ مرتفع پر دکھائی دیتی ہے۔

حالؔی نے سرسید پر لکھتے ہوئے کسی اہم وسیلۂ خبر سے بے تعلقی نہیں کی۔ جس دفتری رقعہ سے بھی کسی

پہلو کی خبر ملی، حالؔی نے اسے توجہ کی نظر سے دیکھا۔ سرسید کی شخصیت تہذیبی، سیاسی، ادبی، مذہبی کئی حوالے رکھتی ہے اور اس میں کئی مقامات (جہاں تک سرسید کے افکار کا تعلق ہے) ایسے بھی آ جاتے ہیں جن سے جمہورِ عوام اختلاف رکھتے تھے مگر حالؔی کی سلامت روی نے اصول یہ رکھا کہ سیرت نگار کو روشن نکات پر توجہ دینی چاہیے۔ موضوعِ تحریر کے عیب چُن کر اسے مطعون کرنا دوسروں پر چھوڑ دیا جائے۔ سوانح نگاری کے حوالے سے حالؔی کا نقطۂ نظر سمجھے بغیر ان کے رویہ کی اہمیت عام آدمی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ سرسید کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے انھوں نے بیاگرافر کی ذمہ داریاں بتائی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "بیاگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کُلی و جزئی حیثیات پر بحث نہ کر سکے تو کم از کم اس کی نمایاں اور مسلم لیاقتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔"

بلاشبہ حالؔی نے بیاگرافر کے ان فرائض کو کماحقہٗ ادا کر دیا۔ حالؔی اپنے موضوعِ تحریر (سرسید کی شخصیت) سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے انہیں ان کی وہ مذہبی تاویلات جو تفسیرِ قرآن "تبئین الکلام" کی تشکیل میں سامنے آتی ہیں وہ بھی پریشان نہیں کرتیں۔ حالؔی سرسید کے اسلوب کے کمال کے حوالے سے دعویٰ کرتے ہیں کہ تکلف سے خالی جو معرا اسلوبِ تحریر سرسید نے مقتضائے وقت کے خلاف اختیار کیا تھا اس کی سادگی اور روانی نے تیس بتیس برس کے عرصے میں اردو ادب کا رُخ ہی پھر کے رکھ دیا۔ یہ دعویٰ بلاشبہ حقیقتِ حال کا عکاس ہے۔

حالؔی کی تحریروں پر جائیں تو معلوم ہوگا کہ بڑے لوگ وہی تھے جو اُٹھ گئے۔ بڑے وہی تھے جو حالؔی کے ہمراہ تھے۔ وہ کبھی اپنی کسی خوبی کی نقاب کشائی نہ کریں گے۔ بلکہ کوئی انہیں بڑا کہے گا تو یہی کہنے پر اصرار کریں گے کہ **ع:** کبرنا موت الکبریٰ۔ یہ سیر چشمی صرف بڑے گھرانے کے افراد کا نصیب ہے۔ سبحان اللہ۔

حالؔی صُلحِ کُل کے علم بردار تھے۔ وہ اپنے لوگوں کو احترام دینا جانتے تھے۔ زیرِ تحریر موضوع کے مثبت مقامات کی توضیح کو اپنی ذمہ داری جان کر تحسین کار کرتے۔ اس حد تک کہ جیسا ایک جگہ خود کہا۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

ادب اردو کے عناصرِ خمسہ کا یہ رُکن رکین جو کسی کو سرسید کا مداح دکھائی دیا کسی کو محض بھلا مانس غزل گو اور کسی کو پیرویِ مغربی کا ذمہ دار۔ حقیقت میں اتنا بڑا دانشور تھا جس نے اتنی ہی بڑی تباہی دیکھی تھی جتنی

سات صدیاں قبل بغداد کے سر پر سے گذری تھی۔ اس نے دہلی مرحوم کا مرثیہ جو لکھا وہ اسی غم کے Cathrsis کی ایک نحیف مگر دل گداز سی سعی تھی۔ ماضی کی عظمت یاد دلا کر اس نے آنے والوں کو اعتماد بھی بخشا۔ حال کی پس ماندگی کا شعور دے کر ساتھیوں کو بیدار اور خبردار بھی کیا اور کتنی ہی اصنافِ ادب کے آغاز کا وسیلہ اس کا وہ کرب بن گیا جو شاید اس کے ہاں زیادہ بڑے دھارے کی صورت بہہ نکلا۔ سیرت، سوانح، تاریخ، شعر و دانش اور تنقیدِ ادب کے دھاروں میں۔ اور کمال یہ بھی ہے کہ یہ ساری تخلیقات، ساری تحریریں اسی بے تعصبی کی فضا میں لکھی گئیں جو مسلمان اہلِ قلم کی شناخت ہیں۔ اس نے صرف اظہار یا تاسف نہیں کیا صرف اندوگیں ہو کر بیٹھ نہیں رہا۔ ادب میں نئی طرحوں کو راہ دی۔ ایک نئے جہان کی آفرینش کے لیے، اسلامیانِ ہند کے ایک بڑے مستقبل کے لیے۔ کہنا چاہیے کہ اقبال کے لیے۔ پاکستان کے لیے اور آزادی کے لیے۔

☆☆☆☆

پروفیسر سحر انصاری

الطاف حسین حالیؔ: شاعر اور نثر نگار

انیسویں صدی برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک ایسے باب پر مشتمل ہے جس کی اہمیت کے متعدد رُخ آج بھی حوالے کی صورت رکھتے ہیں۔ برصغیر کے لیے یہ ایک بہت پُرآشوب صدی تھی۔ اس صدی میں ایک طرف تو اودھ کی سلطنت ختم ہوئی اور واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیا برج بھیج دیا گیا (1856) اور آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کی سلطنت کا چراغ گل کر کے انہیں تا دمِ آخر رنگون میں قید رکھا گیا۔ اس اثنا میں جنگ آزادی یا انگریزوں کے خلاف بغاوت میں جو خوں چکاں واقعات رونما ہوئے ان پر مورخین اب بھی برابر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

برصغیر پر مسلمانوں کی تقریباً ایک ہزار سال کی تہذیبی، سیاسی، علمی ادبی اور مذہبی زندگی کو برطانوی سامراج نے اس طرح پامال کیا کہ ایک مدت تک اچھی خاصی آبادی محرومی اور احساسِ کمتری کا شکار رہی۔ قوم کو اس غیر معمولی سانحے کی اذیتوں سے نکالنے کے لیے جہاں اور شخصیات نے اہم حصہ لیا وہیں سرسید احمد خاں کی مساعی مسلسل اور عملی اقدامات کا بڑا کردار رہا ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنی اصلاحی تحریک کے ذریعے مسلمانوں میں ایک بار پھر اعتماد اور حوصلہ پیدا کیا اُس کی بنا پر انہیں بجا طور سے برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں نے اپنی تحریک کے ذریعے معاشرے میں افادیت اور مقصدیت پر زور دیا اور علمی، ادبی اور مذہبی سطح پر روایت کی جگہ درایت اور منقولات کی جگہ معقولات سے کام لیا۔ وہ علوم جدیدہ کی ترویج میں پیش پیش رہے اور اہل علم و دانش کا ایک نیا حلقہ پیدا کر دیا جن کے کارنامے تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ان میں ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، مولوی چراغ علی بطور خاص اہم ہیں۔ ان میں سے ہر شخصیت نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے ذہنی ارتقا اور ان کے تخلیقی اور تحقیقی کارناموں کی تشکیل و تکمیل میں سرسید کا بڑا کردار رہا ہے۔

الطاف حسین حالیؔ نے تو سرسید کے اعتراف میں ایک ضخیم کتاب ہی ''حیاتِ جاوید'' کے نام سے

تصنیف کر دی۔ حالیؔ کا کہنا تھا کہ ان کی ابتدائی تعلیم "مدرسے" کی مرہون منت تھی جسے "محلے" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن حالیؔ کی زندگی میں نئی فکر اور نیا شعور سر سید احمد خاں کی تحریک سے آگاہ ہونے کے بعد ہوا۔

الطاف حسین حالیؔ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور "قال" سے زیادہ "حال" کے قائل تھے شاید اسی لیے انہوں نے اپنا تخلص حالیؔ رکھا۔

ٹپکتا ہے اشعارِ حالیؔ سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

حالیؔ نے غزل اور نظم کے میدانوں میں اپنی انفرادیت کے ان مٹ نقوش ثبت کر دیے ہیں۔

انہوں نے اپنی غزل کو قدیم اور جدید میں تقسیم کیا ہے۔ قدیم کے لیے ان کا خیال تھا کہ وہ روایتی مضامین اور اسالیب کی آئینہ دار ہیں۔ جبکہ جدید غزل میں انہوں نے حسن و عشق کے معاملات میں سادگی اور سچائی کے ساتھ ساتھ ایسے مضامین اور لفظیات بھی استعمال کیں جنہیں عموماً غزل کی زبان میں شامل کرنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ مسائل حیات کے اظہار کے لیے ان کے استعارات و تلمیحات بھی او رزخ سے نمایاں ہوئیں۔

کبک و قمری میں یہ جھگڑا ہے وطن کس کا ہے
کل خزاں آ کے بتا دے گی، چمن کس کا ہے

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالیؔ نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ

یہ غزل وہ ہے جس میں روایتی تغزل کا کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔ اُس کا سبب یہی تھا کہ حالیؔ سر سید کی افادیت اور مقصدیت کو اپنے ادبی مسلک کا جز و لازم بنا چکے تھے اور ان کا نقطۂ نظر اس شعر میں کھل کر واضح ہو جاتا ہے۔

اے شعر دل فریب نہ ہو تو، تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

جدید رنگِ غزل میں بھی حالیؔ کا کلام اپنی گہری معنویت اور جذباتی تاثیر رکھتا ہے۔ چند اشعار سے اُن کے اس اسلوب کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ملتے ہی اُن کے، بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
دونوں جہاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

نظم گوئی میں حالیؔ کا سب سے اہم کارنامہ ”مسدّس مدوجزر اسلام“ ہے جسے حرفِ عام میں ”مسدّس حالیؔ“ کہا جاتا ہے، اسی مسدّس سے اردو میں قومی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے اثرات شبلیؔ اور اقبالؔ جیسے شعرا کے یہاں بھی نمایاں ہیں۔ اس زمانے میں سرسید نے ”تہذیب الاخلاق“ کے ذریعے بامقصد اور سادہ نگارش کو ایک مہم کے طور پر شروع کیا تھا اور دوراز کار تشبیہات اور استعاراتِ خیالی سے گریز پر زور دیا تھا۔ اس کا اثر حالیؔ کی مسدّس میں صاف نظر آتا ہے۔ اس طویل نظم میں آرائشِ بیان اور لفظوں کی روایتی دل

کشی سے گریز کر کے سادہ بیانی میں لطفِ سخن پیدا کیا گیا ہے۔

عہد سرسید میں بعض بزرگوں نے طبقۂ نسواں کے مسائل پر بھی غیر معمولی توجہ دی۔ ان میں ڈپٹی نذیر احمد بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے ناولوں میں نسائی معاملات پر معاشرتی اور اصلاحی انداز میں توجہ دی گئی ہے۔ حالؔی نے ''مناجات بیوہ'' اور اے ماؤ بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے۔ جیسی نظمیں لکھیں۔ شبلی کے کلام میں بھی کئی جگہ یہ رُخ نمایاں ہے۔ اس لیے بجا طور پر ان بزرگوں کو بھی طبقۂ نسواں کے حقوق کا علمبردار FEMINIST کہا جا سکتا ہے۔

حالؔی اپنے قیام لاہور کے زمانے میں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اُس میں مصرعہ طرح کے بجائے نظم کا موضوع یا عنوان دیا جاتا تھا۔ مشاعرے کے آغاز میں محمد حسین آزاد جدید شاعری کی غرض و غایت اور اس کے اسلوب کے بارے میں ایک لیکچر دیتے تھے۔ اس طرح جدید شاعری کی تنقیدی جہت بھی سامنے آئی پھر آزاد نے ''آبِ حیات'' (1880) میں اردو شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حال لکھتے ہوئے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ اب آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے بجائے شعرا کو چاہیئے کہ گرد و پیش کی زندگی کو اپنا موضوع بنائیں۔

حالؔی نے بھی شاعری کے مختلف مسائل پر غور و خوض کیا اور آخر (1893) یعنی ''آبِ حیات'' کی اشاعت کے تیرہ سال بعد اپنے دیوان کا طویل مقدمہ لکھا جس میں شاعری کے باب میں پہلی بار نئی فکر اور نئی تنقید کے اصول سامنے آئے۔ بعد میں یہ مقدمہ کتابی صورت میں دیوان سے الگ شائع کیا گیا۔ اور اب یہ اسی شکل میں دستیاب ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری کے علاوہ حالؔی کی نثری تصانیف میں یادگارِ غالبؔ، حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، مقالات اور مکاتیب بھی شامل ہیں لیکن یہاں ہم صرف مقدمہ شعر و شاعری پر اظہارِ خیال کرنا چاہیں گے۔ مقدمے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک نظری تنقید کا اور دوسرا عملی یا اطلاقی تنقید کا حصہ ہے۔ پہلے حصے میں حالؔی نے شعر کی ماہیت، مختلف معاشروں میں شاعری کا کردار، سوسائٹی پر شاعری کا اور شاعری پر سوسائٹی کا اثر، آمد، آورد، شعر کی افادیت اور نیچرل شاعری جیسے موضوعات پر بحث کر کے جدید تنقید کی بنیاد ڈالی اور ملٹن کے ایک قول سے استفادہ کرتے ہوئے شاعری کے معیار کو پرکھنے کی میزان اس طرح مقرر کی کہ شاعری میں ''اصلیت، سادگی اور جوش'' ہونا چاہیے۔

حالؔی نے انتہائی کاوش سے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کر کے نشاندہی کی کہ کن اشعار میں سے تینوں شرطیں پائی جاتی ہیں۔ کون سے اشعار کوئی دو شرطوں یا کسی ایک شرط کے حامل ہیں۔ پھر مقدمے کے

دوسرے حصے میں اصنافِ سخن کی اصلاح کی نیت سے اپنے تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں۔ ان میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ حالؔی نے سب سے زیادہ زور غزل کی اصلاح پر دیا۔ جس نے روایتی حلقوں میں اچھا خاصا ہنگامہ بر پا کردیا اور حالؔی کو یہ تک کہنا پڑ گیا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالؔی نے ملٹن کے جس قول سے اپنے اصولِ تنقید کو آگے بڑھایا ہے وہ ان الفاظ پر مشتمل ہے:

Poetry is more simple, sensuous and Passionate.

حالؔی نے اس کا ترجمہ ''اصلیت، سادگی اور جوش'' کیا ہے، جوش کا لفظ شاید اس لیے حالؔی کو مناسب معلوم ہوا ہو کہ وہ ایک ''افسردہ اور پژمردہ'' قوم میں شاعری کے ذریعے عمل اور زندگی کی حرارت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

اب لطف یہ ہے کہ ملٹن کو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے تو انگریزی ادب کی تاریخ میں دوامی اہمیت حاصل ہے لیکن کسی رجحان ساز نقاد کی طرح اس کے اپنے ملک اور اپنی زبان کے ناقدین نے تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ ملٹن کی بعض نثری تحریریں بھی خاصی اہم ہیں لیکن تنقید کی حد تک اس کا کوئی مناسب اعتراف انگریزی ادب میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ مشہور نقاد جارج سینٹس بری کی سہ جلدی تاریخِ تنقید میں ملٹن کا تذکرہ سرسری طور پر نظر آتا ہے۔ اسی طرح اسپنگارن، مس لینگڈن اور پروفیسر ہیلر نے بالترتیب اس کے لیے ایک آدھ فقرہ، کلاسکیت پسند اور پیورٹن کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اب یہ الطاف حسین حالؔی کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنے تنقیدی شعور، فہم و فراست اور قوت آخذہ کے بل پر اس فقرے سے جدید اردو تنقید کے لیے نظریے اور اصول کی بنیاد رکھ دی۔ اس موقع پر مجھے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ایک تبصرہ یاد آ رہا ہے جو اس نے انفرادی صلاحیت (individual talent) کے بارے میں کہا ہے کہ بہت سے لوگ محنت کے نتیجے میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں جب کہ شیکسپیئر نے پلوٹارک کی صرف ایک کتاب سے وہ تخلیقی کرشمہ دکھا دیا ہے جو بہت سے لوگ پورے برٹش میوزیم سے استفادہ کر کے بھی پیش نہیں کر سکتے۔

یہاں حالؔی یا شیکسپیئر کے انتقادی یا تخلیقی شعور کا موازنہ مقصود نہیں بلکہ صرف حالؔی کی ذاتی اپج اور انفرادی صلاحیت کی داد دینی مقصود ہے۔

حالیؔ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی نام لے کر اور کبھی نام کے بغیر مغربی ادیبوں اور ناقدوں کی رائے نقل کرتے ہیں جب کہ وہ انگریزی زبان سے نابلد تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بعد ملکی اور غیر ملکی جامعات سے تحصیل علم کرنے، انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں پر دسترس رکھنے اور ملٹن جیسے شاعروں کو مکمل طور پر سمجھ لینے کے باوجود حالیؔ جیسی تنقید کے بنیادگزار کیوں نہ بن سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک اردو تنقید حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری سے باہر نہیں نکلی۔ یہی حالیؔ کا سب سے اہم تنقیدی کارنامہ ہے جبھی بعض ناقدین نے یہ رائے دی ہے کہ اردو تنقید میں حالیؔ کا وہی مرتبہ ہے جو انگریزی ادب میں ڈرائیڈن (Dryden) کا۔

☆☆☆☆

خاور اعجاز

حالی کی اردو غزل

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی (پانی پت، کرنال ۱۸۳۷ء۔ ۱۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء پانی پت) کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ اور والدہ کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔ نو برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ حالی نے دستورِ زمانہ کے مطابق قرآن حفظ کرنے کے بعد عربی، فارسی، منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم پائی تاہم حالی کو مسلسل اور باقاعدہ تعلیم کا موقع نہ ملا۔ طبیعت کے اعتبار سے خلیق، حلیم، شریف النفس، وضع دار، خوش اخلاق اور قوم پرست واقع ہُوا تھا۔ سترہ برس کی عمر میں مرضی کے خلاف شادی کر دی گئی تو یہ گھر چھوڑ کر دِلّی چلا گیا۔ پھر ۱۸۵۵ء میں اعزا کے اصرار پر واپسی ہُوئی۔ عملی زندگی کی ابتدا ۱۸۵۶ء میں حصار کے کلکٹر دفتر میں کلرکی سے ہوتی ہے لیکن ۱۸۵۷ء میں پانی پت آ گیا۔ ۱۸۶۳ء میں شیفتہ سے ملاقات نے اُسے بہت فیض پہنچایا اور اس صحبت میں حالی کا رنگِ شاعری نکھرا۔ شیفتہ کے کہنے پر ہی حالی نے اپنا کلام غالب کو دکھانا شروع کیا۔ غالب کی وفات کے بعد حالی نے لاہور کا رخ کیا اور یہاں پنجاب بک ڈپو کی ملازمت کے دوران متعدد علمی اور تحقیقی کام کیے۔ ۱۸۷۴ء کے قیامِ لاہور میں وہ شاعری میں اصلاحی رَو لانے کی طرف ملتفت ہُوا اور طرزِ قدیم کو خیرباد کہہ کر نیچرل شاعری کی طرف آیا۔ انگریزی کے مطالعے نے اُس کی نظر بدل دی اور وہ ''برکھا رُت'' اور ''نشاطِ امید'' جیسے موضوعات کی طرف آ نکلا۔ اس رجحان کو سرسید کے فرمان نے مہمیز لگائی اور ''مسدسِ حالی'' جیسی نظم کہلوائی۔ ''مقدمۂ شعر و شاعری'' بھی اسی عمل کی توسیع ہے۔ اکبر الہ آبادی کے ساتھ حالی کے کلام میں بھی انگریزی الفاظ نے اول اول رواج پایا۔ لاہور سے واپسی پر دلی میں اینگلو عربک کالج میں معلّمی اختیار کی۔

الطاف حسین حالی کی شاعری کے تفصیلی ذکر سے پہلے ہمیں ایک بار پھر عربی قصیدے سے علیحدہ ہو کر فارس میں مروج ہونے والی اور خواتین کے ساتھ گفتگو کے نام پر کہی جانے والی غزل کا ایک سرسری جائزہ لینا ہوگا تاکہ حالی کی غزل کے رجحانات کے موازنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ غزل کو اہلِ فارس کی ایجاد کہہ لیں یا دریافت لیکن عربوں کی نسبتاً حقیقی شاعری کے مقابلے میں ایرانیوں کی تصوراتی شاعری کے رجحان نے غزل کو

ادب میں ایک مستقل مقام عطا کیا تاہم اوزان و بحور ایک عربی خلیل بن احمد بصری سے مستعار ہیں۔ بیشتر تشبیہات اور استعارے عربی اور فارسی سے ہوتے ہوئے اردو میں منتقل ہوئے۔ ہجر کی شب امراؤالقیس کے ہاں بھی ویسی ہی ہے جیسی میرؔ کے ہاں۔ اردو میں ظہور سے قبل فارسی میں رودکیؔ، سنائیؔ، عطارؔ، مولانا روم، سعدیؔ اور حافظؔ غزل کے مختلف پیمانے وضع کر چکے تھے جن کی روشنی میں عرفیؔ، نظیریؔ، صائبؔ، کلیمؔ اور طالب آملی چلے۔ بعد ازاں فغانیؔ نے اپنے زمانے کی غزل میں جدتیں پیدا کیں اور انہی شاعروں کے ملے جلے تصوف، اخلاق، فلسفہ اور عشق و عاشقی کے مضامین اردو میں بھی آئے تاہم اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شعرا نے ایک کاہلی کا ثبوت دیا کہ عشقیہ مضامین کو ہی متصوفانہ شاعری کی بنیاد بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حافظؔ جیسا شاعر بھی کئی مواقع پر شراب کا جام تھامے مسجد و کعبہ میں مست پایا گیا ہے یعنی کئی اشعار میں شراب جامِ کوثر بننے کی بجائے شیراز کے میخانے میں ہی رہ گئی ہے اور ان اکہرے اشعار سے کوئی دوسری اعلیٰ سطح برآمد نہیں ہوتی اور ساقی کے پردے سے کوئی مرشدِ کامل یا عارف نکلنے کی بجائے وہی پیالہ و ساغر کا دلدار نکل آتا ہے! ہاں یہ ضرور ہوا کہ تصوف کی لہر نے بعض دوسرے ارفع مضامین کے لیے راہ ہموار کی جیسے تصورِ خدا، فانی اور لافانی زندگی کا بیان وغیرہ۔

اردو غزل فارسی کی گود میں پلی بڑھی اور آدھی فارسی اور آدھی اردو کی توتلی زبان بولتی ہوئی ولیؔ دکنی کے ہاتھوں جوان ہوئی۔ اس سے پیشتر قلی قطب شاہ اور حسن شوقیؔ اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھا چکے تھے۔ محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ نے فرسودہ غزل کے سانچے تبدیل کرنے اور نئے خیالات کو نظم کے ذریعے اجاگر کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اس تحریک میں اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، شوق قدوائی، عبدالحلیم شرر، نادر کاکوروی اور سرور جہاں آبادی نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دی۔ اس تحریک نے غزل کو اتنا دبا دیا کہ اس کے ردِعمل میں دہلی میں بیخودؔ، نوحؔ، سائلؔ اور لکھنؤ میں صفیؔ، عزیزؔ اور ثاقبؔ وغیرہ کو باقاعدہ غزل کے دفاع میں کمربستہ ہونا پڑا۔ اس منظر نامے کا آغاز حالیؔ کی شاعری سے ہوتا ہے۔

حالیؔ کی غزل اس بات کی شاہد ہے کہ منصوبہ بند شاعری اپنی صنف کی ایمائیت کو نقصان پہنچاتی ہے تاہم اُس کی وعظ و تلقین نے غزل کے رہن سہن میں ایک تبدیلی کا آغاز ضرور کیا اور اس اصلاح پسندی نے قدیم سماجی روّیوں میں ایک نیا فکری روّیہ متعارف کرایا۔ شاعری اور تخلیقی نثر کے ساتھ اگر تنقید کو بھی شامل کر لیا جائے تو حالیؔ کا مرتبہ بعض دیگر عظیم ادبی شخصیتوں سے بھی بالا ہو جاتا ہے۔ حالیؔ نے تنقیدی شعور کی بنا پر غزل کو اپنے عہد کے عشقیہ مضامین سے نجات دلانے میں بڑا کام کیا، تخیل کی بجائے عمل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی

اور تقدیر کی بجائے تدبیر پر زور دیا۔ آیئے مختصراً دیکھتے ہیں کہ حالی کا مقصد کیا تھا:

حالی کے زمانے تک غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاقی مضامین عام ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود حالی نے غزل کی مجموعی حالت کو “ابتر” بتایا ہے اور اس صنف کو “بے سوُد” کہا ہے تاہم وہ غزل کا اس حد تک ضرور قائل تھا کہ مبسوط اور طولانی کلام لکھنے کے مواقع شاعر کو ہمیشہ میسر نہیں آتے لہٰذا روزمرہ کے واقعات کے بیان کے لیے غزل کے بیت یا پھر قطعہ/رباعی بہتر آلۂ کار ہیں۔ چونکہ قطعہ اور رباعی کی نسبت غزل کے شعرا بے شمار تھے اور غزل مذکورہ دونوں اصناف سے زیادہ عوام الناس میں مقبول تھی اور محافل میں گائی بھی جاتی تھی اس لیے حالی نے اس کی اصلاح پر زور دیا۔ دراصل وہ یہ چاہتا تھا کہ غزل میں بوالہوسی اور چٹخارے کی جگہ خالص عشق و محبت اور سنجیدہ کلامی کی طرف توجہ دی جائے اور سعدی، رومی اور جامی کی روایت کو تازہ کیا جائے۔ خمریات اور خلافِ شرع لوازمات سے حتیٰ المقدور پرہیز کیا جائے، پاکیزہ خیالات کو فروغ دیا جائے اور متصوفانہ گفتگو میں اہلِ ظاہر سے محض انتقام کی خاطر لعن طعن نہ کی جائے۔ ذہن سے گھڑی ہوئی باتوں کی بجائے دل سے نکلی ہوئی باتوں کو ترجیح دی جائے۔ دوسروں پر قناعت کی بجائے اپنے مشاہدے پر بھروسہ کیا جائے۔ شعر میں جدت پیدا کی جائے، نئے اور اچھوتے مضامین باندھے جائیں۔ باتوں میں تنوع، سادگی، صفائی، بے تکلفی اور وسعت ہونی چاہیے۔ تکرار اور اعادہ سے گریز کرنا چاہیے، البتہ پرانوں کے ہاں رہ جانے والی کسی کمی کو اگر نئے شاعر پورا کر دیں تو گوارا ہے۔ نئے اسالیب اور الفاظ کو آہستہ آہستہ بڑھایا جائے۔ روزمرہ کا لحاظ اور محاورے کی چاشنی رکھی جائے۔ زمینیں ایسی اختیار کی جائیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔ یہ تھا وہ کچھ جو حالی غزل سے چاہتا تھا۔

حالی کی ذہنی پاکیزگی اس کی غزل میں بھی آئی ہے۔ علامتی انداز سے مسلمانوں کو اردگرد کے حالات سے آگاہ کرنے کا انداز ملتا ہے۔ اس کی غزل کے الفاظ سادہ لیکن کسک سے بھرے ہوئے ہیں۔ دل کی بات کی ہے لیکن متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ شعر، زبان اور قوم کی اصلاح تینوں اس کے مدِنظر رہے۔ اس ضمن میں جنگِ عظیم اوّل اور اس کے اثرات بھی قابلِ ذکر ہیں جن کے نتیجے میں برِصغیر کا مزاج تبدیل ہوتا دِکھائی دیتا ہے۔ وطنیت قومی اور سیاسی بیداری کی ایک لہر جو اس جنگ کے بعد اُٹھی اس سے پیشتر اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پھر مغرب میں ہونے والی سائنسی ترقّی کے اثرات جہاں مشرق کی عمومی زندگی پر مرتب ہوئے وہاں ادب بھی ان سے مبرا نہ رہ سکا۔ اگرچہ ان تبدیلیوں کا واضح اظہار نظم میں بہتر طور پر ہوا لیکن غزل بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور پرانے لبادے اُتار پھینکے۔ آنکھ اَب بادام سے تشبیہ پانے کی

بجائے وہ کچھ دیکھنے لگی جو وہ اُس سے پیشتر دیکھنے سے قاصر تھی۔

حالؔی کا شمار میرؔ و غالبؔ کے ساتھ نہ سہی لیکن دُوسری سطح کے اعلیٰ ترین شعرا میں کیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ نے حالؔی کو یُوں ہی تو نہیں کہہ دیا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنے آپ پر ظلم کرو گے۔ جذبۂ عشق اور حالؔی ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ خلوص اور پاکیزگی احساس اس کا مزاج ہیں اور دھیما پن اور معصومیت اس کی غزل کی پہچان۔ حیرت آمیز سوز و گداز اس کے قلبی احساسات و کیفیات کو مزید روشن کر دیتا ہے۔

حالؔی کے ساتھ نظم نے بالخصوص اور غزل نے بالعموم ایک کروٹ لی۔ اس لحاظ سے وہ اُردو شاعری میں جدیدیت کے پیشواؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر حالؔی نہ ہوتا تو شاید اُردو شاعری زمانے کے نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے کسی اور کا انتظار کرتی۔ قومی اور ملّی زندگی میں بھی حالؔی کی شاعری نے ہلچل پیدا کی۔ حالؔی کے خیالات اور شاعری میں قدیم سے جدید کی طرف پیش قدمی میں اُس کے قیامِ لاہور کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس دوران اُسے انگریزی ادب اور مغربی علوم کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔

حالؔی کی تنقید نے غزل کی روایت میں تبدیلی پیدا کی اور اکثر مروجہ عشق و عاشقی کے مضامین کا رُخ قومی شعور کی طرف موڑا۔ وہ بذاتِ خود ایک مذہبی، صوفی منش اور قناعت پسند انسان تھا۔ ایک تہذیبی گھرانے میں آنکھ کھولی اور اپنے شوق کے تحت فلسفہ، منطق، حدیث، تفسیر اور صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ اوائلِ عمری میں شادی اور خاندانی پاکیزگی و طہارت کے زیرِ اثر حالؔی کی طبیعت پر سادگی اور صداقت حاوی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی روایتی اور رسمی شاعری سے اجتناب کرتا نظر آتا ہے۔ پھر غالبؔ کے مشورہ و اصلاح اور شیفتہؔ کی صحبت نے اسے مبتذل اشعار کی جانب نہ جانے دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ غزل بی بی سے حالؔی کا معاشقہ نہ چل سکا اور

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

کے مصداق بقول عبدالماجد دریا آبادی بعض اشعار محض تلقینِ واعظ کے زمرے میں آ گئے ہیں جیسے:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تاہم صنائع بدائع اور بے جا تشبیہات و استعارات سے گریز نے حالؔی کی غزل کو نئی کیفیات سے روشناس کرایا جو قومی بیداری اور ملّی شعور سے مملو ہیں۔

حالؔی کی روشن خیالی اور وسیع النظری پر کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس کا شمار ایسی عہد ساز شخصیتوں میں ہوگا جنھوں نے نہ صرف فنی طور پر اجتہاد کیا بل کہ سماجی شعور میں تبدیلی کا باعث بھی بنیں۔ اس نے کئی اصنافِ ادب میں اپنے نقوش چھوڑے۔ اس اعتبار سے وہ ایک ایسی کثیر الجہاتی شخصیت تھا جس نے اپنے جوش و جذبے سے فن و فکر کے دھاروں کو نئی سمت میں موڑا اور اپنے دور کے مقبول رجحانات سے ہٹ کر مستقبل سے ہم آہنگ رجحانات کی داغ بیل ڈالی۔ اردو شاعری میں دردمندی کے آثار تو میر دردؔ کی شاعری میں بھی ملتے ہیں لیکن وہ کسک جو ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی پر مولانا حالؔی کے ہاں موجود ہے وہ اس سے پیشتر کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ وصفِ خاص پہلی مرتبہ حالؔی کی شاعری میں نمایاں ہُوا اور پھر بعد کے شعرا نے ان کی تقلید کی۔ اس ضمن میں مسدسِ حالؔی کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے؛ ایک تو اردو میں اپنی طرز کی اولین شاعری اور دوسرے اردو شاعری اور شعرا پر اپنے اثرات کے سبب۔ حالؔی سے پیشتر کی شاعری میں عمومی معاشرتی صورتِ حال پر تنقید و تبصرہ تو موجود ہے لیکن حالؔی نے شاعری سے اصلاحِ احوال کا جو کام لیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ حالؔی کے ساتھ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کا مزاج، موضوعات اور اسلوب بدلتا ہُوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کوشش میں سرسید احمد خاں کی خواہشات کا بھی کچھ دخل رہا ہوگا لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سرسید نے قومی تربیت کے لیے حالؔی کا انتخاب ہی کیوں کیا، حال آں کہ دسیوں اور بڑے شاعر بھی موجود تھے۔ اس کی وجہ صاف یہی نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں حالؔی ہی وہ واحد شاعر تھا جس کو قدرت نے قومی درد کی دولت عطا کر کے تنزل کا شکار مسلمان معاشرے میں اس وقت بھیجا جب مسلمانانِ ہند خوابِ غفلت میں کھوئے ہُوئے تھے۔ اس موقع پر قدرت نے حالؔی سے ایک رہنما شاعر کا کام لیا۔ اس لحاظ سے حالؔی کا شمار ان اکابرین میں ہوگا جو محسنوں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور علم و عمل دونوں سے جدوجہد کرتے ہُوئے ملی سطح پر اتحاد اور یگانگت کے عناصر کو فروغ دیتے ہُوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حالؔی کی شاعری سے حب الوطنی کے مضامین اردو شاعری میں در آنے شروع ہُوئے جو اقبالؔ تک آتے آتے باقاعدہ ایک موضوع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور بعد کے شعرا کے لیے ایک اور شعری راستہ کھلتا ہُوا نظر آنے لگتا ہے۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کے نام تو ہم سنتے آئے ہیں۔ گو کہ یہ شہروں کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں لیکن دراصل یہ شاعری کے دو رجحان ہیں جو مذکورہ دو شہروں میں پروان چڑھے۔ ایک رجحان میں تصوف کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے اور دوسرے میں خارجی عوامل کی آمیزش نمایاں ملتی ہے لیکن حالؔی کی شاعری نے ایک تیسرے دبستان کی بنیاد رکھی یعنی ''دبستانِ حب الوطنی'' جس کا تعلق کسی شہر سے نہیں بل کہ ایک تہذیب سے بنتا ہے جس کے ڈانڈے خطۂ عرب سے جا ملتے ہیں اور

یوں یہ دبستان برِصغیر میں موجود ہوتے ہُوئے بھی اپنا ذہنی رابطہ دجلہ وفرات سے لے کر سرزمینِ یثرب تک سے جوڑ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دبستان نے ایک شخص کی شاعری سے جنم لیا لیکن اب اس کی شاخیں کم از کم پاکستان کے ہر صوبے اور ہر صوبے کی ہر علاقائی زبان میں نظر آتی ہیں۔ سرحد پار اور سمندر پار ملتِ اسلامیہ کا درد رکھنے والے دل بھی اسی دبستاں کے اراکین شمار ہوں گے جن کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

حالؔی کی غزل گوئی اُس کی نظم نگاری اور خاص طور پر مسدس کے نیچے آ گئی ہے حالانکہ غالبؔ کی شاگردی اور شیفتہؔ کی صحبت میں اس کے ہاں قدیم رنگ میں بھی تغزل کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ غزل کی تاریخ میں حالؔی پہلا شاعر ہے جس نے نہ دیوان زادہ والے شاہ حاتمؔ کی طرح نسبتاً نئے رجحانات کی ترجمانی کرنے والے اشعار کو رکھ کر باقی کلام قلم زد کر دیا اور نہ ناسخؔ کی طرح فقط الفاظ کی تراش خراش کے پیچھے پڑا رہا۔ نہ دہلی والوں کی طرح جذبات کی ترجمانی میں مصروف رہا اور نہ لکھنو والوں کی طرح خارج میں ٹکریں مارتا رہا بلکہ حالؔی نے صدقِ دل سے غزل کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور ایسی اصلاح کی بھرپور کوشش کی جس نے غزل کے امکانات کو روشن تر کر دیا۔ ذرا دیکھیے کہ حالؔی کے ہم عصر شعرا اُس وقت کیا کہہ رہے تھے:

جلال لکھنوی (۱۸۳۴ء۔۱۹۰۹ء)

بہت ڈرے ہُوئے مِلتے ہیں شیخ و زاہد سے
اُٹھا چکے ہیں ہم اِلزام پارسائی کا
جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھُول مِلے ہم کو داغ بھی نہ مِلا
طاقت نے سنبھالا نہ تحمّل نے دمِ ہجر
سب دعوٰی ہی کرتے تھے کوئی کام نہ آیا
دَم بھر کو ترے وعظ میں ہم بیٹھ کے واعظ
برسوں نہ رہے بزمِ خرافات کے قابل
دے کے مٹی جو مِرا حور شمائل ٹھہرے
دو گھڑی قبر میں مردہ بھی بہ مشکل ٹھہرے
گم جب سے کیے ہوش تری جلوہ گری نے
کیا کیا نہ خبر دار کیا بے خبری نے

ساغر کِدھر کِدھر نہ جھُکا چشمِ یار کا
دِل سب کے بزمِ بادہ پرستاں میں رکھ لیے

ظہیر دہلوی (۱۸۳۵ء۔۱۹۱۱ء)

بے خود ہُوں تصور میں کسی برق ادا کے
سرمایۂ تسکیں ہے تڑپنا مِرے دل کا
بہت ظہیرؔ کو ہم یاد کر کے واں روئے
کہیں جو ذکرِ حریفانِ بادہ خوار آیا
وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کا سامان ظہیرؔ
ہم الگ سب سے گنہ گار بنے بیٹھے ہیں
تُو کہاں آئی مِرا درد بٹانے کے لیے
اے شبِ ہجر ! نِکل جا مِرے غم خانے سے
یہ منہ سے تو کہتا ہُوں چھوڑی محبت
مگر حال دل کا خُدا جانتا ہے

ذکی دہلوی (۱۸۳۹ء۔۱۹۰۳ء)

عبث بیٹھے بٹھائے چھوڑتا کُنجِ قفس مَیں کیوں
مِری تقدیر میں لِکھا تھا داغِ آشیاں ہونا
ہم جان و دل تو نذرِ غمِ عشق کر چکے
حیران ہیں لٹائیں گے راہِ وفا میں کیا
پھر آج دیکھیے کس کس کی جان جاتی ہے
وہ گھر سے نِکلے ہیں عالم کی آرزو ہو کر
وہی سبزہ ، وہی وحشت ، وہی ویرانی ہے
اور کیا دشت میں ہو گا جو مِرے گھر میں نہیں
مَیں نے جو کہا وصل کا خواب اُن سے تو ہنس کر
وہ کہتے ہیں اب خواب میں تعبیر کو دیکھو

کر دیکھیں گے نالہ بھی وہ آئیں کہ نہ آئیں
تیرا بھی کہا اے دلِ ناشاد کریں گے

اس منظر نامے میں حالی کے یہ شعر پڑھیے جو اس کی دورِ اول (۱۸۶۳_۱۸۷۴) کی غزلوں سے لیے گئے ہیں:

گر صاحبِ دِل ہوتے، سُن کر مِری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سِوا ہوتا
کل حالی دِیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سُنا ہوتا
مضموں ہے دِل میں نقش “لدینا مزید” کا
کونین سے بھرے گا نہ دامن اُمید کا
دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
“لا تقنطو” جواب ہے “ہل من مزید” کا
اِک خُو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اَب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مِری رُسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خُود آرائی کا
دِل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالیؔ پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا
ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
قلق اور دِل کا سِوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بَلا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو اِنتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
ہُوا رُکتے رُکتے دَم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دَوا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالیؔ سے حال
کہیں سادہ دِل مُبتلا ہو گیا
مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اَب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی مُنہ میں زباں ہے اَب
حالیؔ تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کِدھر ہے ، وہ تقویٰ کہاں ہے اَب
آگے بڑھے نہ قصۂ عِشقِ بُتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اَب بھاگتے ہیں سایۂ عِشقِ بُتاں سے ہم
کچھ دِل سے ہیں ڈرے ہُوئے کچھ آسماں سے ہم
خُود رفتگی شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یا رب کہاں سے ہم
لینے دو چین کوئی دَم اے منکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

دِل کش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم
ہے جستجو کہ خُوب سے ہے خُوب تر کہاں
اَب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عِشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اِس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہم جِس پہ مَر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عِشق کی
دِل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں
حالؔی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اَب
آئے ہو وقتِ صبح ، رہے رات بھر کہاں
اَب وہ اگلا سا اِلتفات نہیں
جِس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
قیس ہو ، کوہکن ہو یا حالؔی
عاشقی کچھ کِسی کی ذات نہیں
کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
دُھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی تو کِس سے آشنائی کی
مُنہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خُود نمائی کی

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
وقتِ رُخصت تھا سخت حالیؔ پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

حالیؔ اور اس کے قریبی ہم عصروں کی غزل کے موضوعات، لفظیات اور اسلوب میں واضح فرق ہے جو ایک نظر میں پہچانا جاتا ہے۔ جلالؔ اور ظہیرؔ کے یہاں واعظ، شیخ وزاہد، زُلفِ یار، صیاد، بتوں کا عشق، بادہ پرستی، برقِ ادا، نگاہِ شرمگیں، شبِ ہجر، کوہ کن وقیس کے مضامین بکثرت ہیں جو قدیم غزل کا شیوہ ہیں جب کہ حالیؔ کی غزل میں ایک صاحبِ دل کی بے تابی، نشاطِ وصل سے آگے کا بیاں، عشقِ بتاں سے گریز، منزلِ مقصود کی تڑپ، کارواں کا تصور، اور قوم وملک کے لیے درد کی باتیں موجود ہیں گویا اس کی دکاں الگ سے کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر چہ حالیؔ کی ان کوششوں کو غزل دشمنی کے مترادف قرار دیا گیا لیکن زمانۂ مابعد میں اقبالؔ کے ظہور نے حالیؔ کے کم عقل ناقدین کے اعتراضوں پر پانی پھیر دیا۔ اوپر دیئے گئے اشعار میں بے ساختگی، معصومیت اور دِل گدازی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پھر وہ داخلیت کے حصار سے ایسا باہر نکلا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا اور غزل کے بیشتر قدیم موضوعات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ مضمون آفرینی اور قافیہ پیمائی کر کے اُستادی کا رعب قائم کرنے والی شاعری سے تائب ہوا اور حقیقت نگاری کو وسعت دے کر اس میں وہ تپش بھر دی کہ شعور تمتما اُٹھا۔ حالیؔ نے غزل کے مزاج میں بنیادی تبدیلی کی اور اس کے آہستہ آہستہ بدلنے کی راہ ہموار کر کے چھوڑ دیا۔ فرسودہ مضامین، صنعتوں، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں سے پرہیز کیا حتیٰ کہ قافیوں تک سے اجتناب کو اپنایا اور غیر مردف غزل کو رواج دیا۔ غزل کے مصنوعی پن کو حقیقت کی طرف موڑا۔ وہ کام جو ایک باقاعدہ تحریک کا تقاضا کرتا تھا اُسے حالیؔ نے تنِ تنہا اپنے ذمے لیا اور خوش اسلوبی سے نبھایا البتہ اتنے بڑے کام میں اگر فصاحت متاثر ہو بھی گئی تو اُسے اِس کی پرواہ نہیں تھی۔ حالیؔ کے نئی شاعری کے شوق نے اگر چہ اس کی غزل کے دائرے کو محدود کیا لیکن خیالات کو جس پاکیزگی سے اس نے نظم کیا ہے وہ ہنر سوائے اقبالؔ کے اور کہیں نظر نہیں آتا۔ حالیؔ کے خلوص اور صداقتِ خیال پر اُنگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ اصلاحِ احوال اور تہذیبی بیداری میں اُس کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالیؔ کی غزل میں اجتماعی اداسی کی فضا ہے جب کہ اس کے معاصرین داغؔ وامیرؔ کے ہاں یہ رنگ ذاتی یا زیادہ سے زیادہ مجلسی ہے۔

اردو شاعری اور بالخصوص غزل میں حالؔی کا درجہ ایک مجتہد سے کم نہیں۔ اس نے ایک سچی لگن کے ساتھ غزل میں بیان ہونے والے جذبات و احساسات میں اپنے درد آمیز دل کی پکار کو اس طور شامل کیا کہ ہمیں آج بھی غزل کے سینے سے حالؔی کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کا انداز ایسا فطری، سادہ اور عام فہم ہے کہ عام ذہنوں کو بھی اپیل کرتا ہے اور بغیر کسی دقت کے اس کی بات دل و دماغ میں سما جاتی ہے۔ اس خصوصیت کے پسِ پردہ حالؔی کی شخصی اور فنی صداقت ایک جوہر کے طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ مبالغے اور تصنع سے کام لینے والا شخص تھا نہ شاعر۔ اس کی بات کی تاثیر اس کی ظاہری و باطنی صداقت میں پنہاں تھی۔ ناسخؔ نے غزل میں لفظی اجتہاد کی ابتدا کی جب کہ حالؔی نے غزل کے سانچے میں فکری تبدیلیوں کا آغاز کیا۔ یہ فکری تبدیلی دہلی اور لکھنو کی بنیاد پر نہیں تھی بل کہ یہ ایک تہذیبی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی نے غزل کی دُنیا کو ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا جس کے عشق و محبت کے پیمانے زمینی اور مجازی نہیں بل کہ آسمانی اور حقیقی تھے۔ حالؔی کی غزل اپنے عہد کی مروجہ غزل کے حصار سے باہر کی غزل تھی۔ اسی سے حالؔی کی خود انحصاری کا بھی احساس ہوتا ہے کہ اس نے رائج الوقت سکوں سے غزل کی جیب بھرنے کی بجائے اپنی ٹکسال لگا کر نئے سکے رائج کیے اور غزل کی قدر و قیمت میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اس کے رائج شدہ سکوں نے بازارِ سخن کی گرماگرمی کو ایک محدود دائرے سے نکال کر پوری غزلیہ فضا میں لہجے کی ایک نئی جھنکار پیدا کر دی۔

حالؔی قوم کی زبوں حالی پر سنجیدگی سے غور کرنے والا پہلا شاعر ہے جس نے رو بہ تنزل قوم کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کرنے کی بھرپور سعی کی۔ حالؔی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے نزدیک قوم کی فلاح ”پرانے طریقوں“ پر چلنے میں تھی۔ مجھے یہاں یہ پوچھنے کی اجازت دیجیے کہ وہ طریقے پرانے کب ہُوئے؟ کیا کششِ ثقل کا اصول پرانا ہو گیا ہے اور ہم اسے بدل کر کوئی نیا اصول لا سکتے ہیں؟ کیا سورج پرانا ہو گیا ہے اب اسے تبدیل کر لینا چاہیے؟ جو اصول و ضوابط اور قاعدے قانون، چاہے سائنس کے ہوں یا اخلاقیات کے، کائناتی (یونیورسل) ہیں وہ پرانے کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیا اخلاقیات کوئی عمارت ہے کہ سرد و گرمِ زمانہ سہتے ہُوئے گر جائے گی۔ مجھے ان اذہان پر ترس آتا ہے جو ضابطوں، اصولوں اور قاعدے قانون پر عمل کرنے کی ہمت تو رکھتے نہیں بس ان کے بوسیدہ ہو جانے کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ حالؔی نے تو سوچ تبدیل کرنے اور ٹھہرے ہُوئے فکری قافلے کو متحرک کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بناوٹی اور لیپا پوتی والی شاعری سے احتراز کر کے اصل اور سچے جذبوں کی ترجمانی کرنے والی شاعری کی طرف توجہ مبذول

کرائی اور قول وعمل میں توازن لانے کی کوشش کی۔ حالؔی کی ذات سے یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ وہ تعمیری جذبوں سے معمور شخص تھا۔ فطری اور غیر جانب دار عوامل کو بروئے کار لا کر اس نے پہلے سے موجود ادبی فضا کو اتنا وسیع کیا کہ وہ اخلاقی اور سماجی موضوعات جو غزل تو کیا نظمیہ شاعری کا حصہ بھی نہ بنے تھے، انھیں ایسی تخلیقی جہت سے آشنا کیا کہ شاعری کا قبلہ ہی بدلتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ شعری قافلے کو تصنع اور مبالغہ کی دلدل سے نکال کر حقیقت کی وادیوں میں لے آنے کا سہرا حالؔی ہی کے سر بندھتا ہے۔ اس کی عاشقانہ غزل بھی واقعیت سے خالی نہیں۔ یہیں سے حالؔی کی جداگانہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے جس کا رخ بعد میں قومی اور ملی شاعری کی طرف ہو گیا تاہم سادگی کی رواس کی ہر قسم کی شاعری میں موج زن رہی۔

حالؔی نے ۵۵ـ۱۸۵۴ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس کی کل غزلیں ۱۲۳ کے قریب اور اشعار کی تعداد ۱۲۲۵ کے لگ بھگ ہے۔ آخری عمر میں غزل کی طرف رجحان بہت کم ہو گیا تھا اور ۱۸۹۳ء تا ۱۹۱۴ء یعنی ۲۱ برس میں صرف سات غزلیں کہیں اور دیوان (۱۸۹۳ء) کے دیباچہ میں یہ کہہ دیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے تاہم وہ غزل کو حسن وعشق کے چنگل سے بڑی حد تک نجات دلا کر جدید رجحانات سے روشناس کرا گیا۔ اس نے غزل کے مورچہ بند شعرا سے نہ صرف جنگ لڑی مل کہ فتح بھی پائی۔ جدید اردو غزل کی ابتدا کا سہرا حالؔی کے سر بندھتا ہے۔ وہ قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے نئی اقدار کی تخلیقی سطح پر تشکیل کرتا ہے۔ قومی احساس اور سیاسی ومعاشرتی شعور کا حاصل شعر کہا اور امید کی کرن دکھائی جس نے اقبالؔ کی شاعری کو جگمگایا۔

انتخابِ کلام از غزلیاتِ جدید (۱۸۷۴ـ۱۸۹۳)

کاش اِک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اِک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا
اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پُوچھا دِل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
عشق سُنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خُود بخُود دِل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا
رونا نہ ہو گا حالؔی شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
دِل ہو کہ جان ، تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دِل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
اے عشق تُو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
جہاں میں حاؔلی کِسی پہ اپنے سِوا بھروسہ نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زِندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا
بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے
بس اَب دُنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
بشر پہلو میں دِل رکھتا ہے جب تک
اسے دُنیا کا غم کھانا پڑے گا
سخن پہ ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کِسی دِن ڈبونا پڑے گا
ہُوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حاؔلی
مگر اَب مِری جان ! ہونا پڑے گا
خود مہرِ وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا
یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اَب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا
دُنیا میں اگر ہے بھی فراغت کو کوئی دِن
وہ دِن ہے کہ جِس دِن ہے اسے چھوڑ کے جانا
حق نے احساں میں نہ کی اور مَیں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور مَیں خطا کرتا رہا

معنی کا تم نے حالؔی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
دِل کو سب باتوں کی ناصح ہے خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا
ہو چکے حالؔی غزل خوانی کے دِن
راگنی بے وقت کی اَب گائیں کیا
اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صُورت
نہ وہ دیوار کی صُورت ہے نہ در کی صُورت
کِس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صُورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اِک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صُورت
حملہ اپنے پہ بھی اِک بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اِک فتح و ظفر کی صُورت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالؔی چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت
مِلتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ
کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کر لو کرنی ہے جو کمائی آج
منزلِ دُنیا میں ہیں یا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

شادی کے بعد غم ہے ، فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سِوا ہے دھرا کیا، رجا کے بعد
ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دُور نہیں روزِ جزا اے زاہد
رہیں نا آشنا زمانے سے
حق ہے تیرا یہ آشناؤں پہ
عید اور نو روز ہے سب دِل کے ساتھ
دِل نہیں حاضر تو دُنیا ہے اُجاڑ
تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
شیخ! اللہ رے تیری عیّاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اِک پتے کی جو ہم نے کہہ دی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز
ہر داغ فصلِ گُل کی نشانی ہے اے صبا
گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس
ڈر ہے دِلوں کے ساتھ امیدیں بھی پِس نہ جائیں
اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالؔی نکل سکیں گے نہ دل کے غبار بس
جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالؔی کو کوئی کام ہے درپیش
دَرد اور دَرد کی ہے سب کے دَوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلّاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص
حاجیو! ہے ہم کو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض
رات گذری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اَب کوئی دم میں بساط
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہُوئے
دردمندوں کا ہے دُکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ
اَب سنو حالؔی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل
سعی کا اَنجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اُٹھا بیٹھے تھے ہم
دیدہ و دِل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم
راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھتے کیا ڈھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم
ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اَب برہمن کہاں
جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انہیں ، مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
اس کے کوچے میں ہیں وہ بے پر و بال
اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں میں

کہتے ہیں جِس کو جنّت وہ اِک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیاناں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں
کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالؔی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں
وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سُنا بھی اس پہ کیا گذری انجمن میں؟
فرشتے سے بہتر ہے اِنسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بِکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
حالؔی اَب آؤ پیروِی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میر ہو چکی
سُنیں گے نہ حالؔی کی کب تک صدا
یہی ایک دِن کام کر جائے گی
پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں
ہے تُو بھی اَب غنیمت اے ضعف و ناتوانی
جو کچھ ہے سو ہے اس کے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لِیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کِسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالؔی کے بعد کوئی نہ ہم دَرد پھر مِلا
کچھ راز تھے کہ دِل میں ہمارے نہاں رہے
جب یہ کہتا ہوں کہ بس دُنیا پہ اَب تف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے
ضبط کیجیے دردِ دِل تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے رازِ دِل اگر اُف کیجیے

انتخاب ازغزلیاتِ دورِ آخر (۱۸۹۳ء۔۱۹۱۴ء)

قطرہ اَب دریا میں مِل جانے کو ہے
تیری معیاد اے جدائی ہو چکی
دوستو! روگ بظاہر نہیں جانے والا
ہو چکیں ختم دوائیں تو دُعا اور سہی
کم نہ تھے روگ جوانی میں بھی کچھ اے پیری
رعشہ اَب اور سہی لغزشِ پا اور سہی
ترک دُنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر مناسب ہے تو اِک ترکِ ریا اور سہی
مدرسے میں نہ مِلا کچھ تو نہ توڑ آس اے دِل
اِک درِ دولتِ ساقی پہ صدا اور سہی
گو کہ حالؔی میں دَم نہیں باقی
ڈور اپنی ہلائے جاتا ہے
گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو
ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار ، جایئے
مشکل ہے پاک ہونا اگر دِل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل کیجیے کہ گنگا نہایئے

حالؔی کی تصانیف مذہب، اخلاقیات، سوانح، تنقید اور شاعری جیسے متنوع موضوعات پر محیط ہیں۔ شاعری میں دیوانِ حالؔی بالخصوص مسدسِ حالؔی، تنقید میں مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ مضامین حالؔی، مقالاتِ حالؔی، سوانح میں حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، سوانح حکیم ناصر خسرو اور مذہبیات میں رسالہ خیر المواعظ، شواہد الہام اور تریاقِ مسموم وغیرہ شامل ہیں۔ مجالس النسا لکھنے پر حکومتِ ہند سے انعام بھی پایا۔ اِن تصانیف کا مصنف حیدرآباد دکن سے صرف پچھتر روپے پنشن پاتا تھا۔ حالؔی کے شاگردوں میں آزاد انصاری، بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، پنڈت دتاتریہ کیفی، رشکی دہلوی، زلالی بدایونی اور خوشی محمد ناظر بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ عمر کے آخری حصّے میں نزلہ، زکام اور بواسیر کی وجہ سے طبیعت خاصی نڈھال رہی۔ احاطۂ مزارِ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے صحن میں مدفون ہیں۔

☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی

الطاف حسین حالؔی کا نام آتے ہی ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور ''مدوجزر اسلام'' کا یاد آ جانا یقینی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں کے حوالے سے طنز کے تیر چلائے جاتے ہیں مگر دونوں کا معاملہ ایسا ہے کہ انہیں سوسوا سو سال ہو چلے ہیں طاق نسیان کے حوالے کرنا ممکن نہیں ہوا۔ یوں تو حالؔی کو یاد کرنے کے اور بھی حوالے ہیں مگر ہمیں حالؔی کی ان دو جہتوں نے ہی یوں اُلجھا رکھا ہے کہ ادھر دھیان کم کم جاتا ہے۔ مثلاً ہمیں حالؔی کی غزل دشمنی یاد رہ جاتی ہے مگر غزل سے حالؔی کی محبت ہم بھول جاتے ہیں۔ جی غزل سے محبت کرنے والے حالؔی کا کہنا ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

وصل کا اس کے دلِ زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

یہ جو خوب سے خوب تر کی تلاش تھی حالؔی کو شاعری کا مقدمہ لکھنے کی طرف لے گئی ہے۔ حالؔی اس طرف گئے اور اپنے سارے مخمصوں کے ساتھ گئے۔ شیفتہ اور غالب کی صحبت میں اپنی شاعری کے ذوق کو نکھارنے والے حالؔی کا تصور شعر خام نہیں تھا، وہ جو بعد میں اعتراضات کی دھول اس باب میں اڑائی گئی یوں لگتا ہے، بہت عرصہ تک اس میں حالؔی جو بات کہنا چاہتے تھے وہ نظروں سے اوجھل رہی۔ مگر اب شاید ایسا وقت آ گیا ہے کہ ہم جان سکیں کہ حالؔی کی نظر سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی تھی تو وہ پردے کون سے تھے اور اگر وہ شعر

کے اندر ایک اور سطح پر ایسے اوصاف کے وصل کی تمنائی ہو گئے تھے، جو شعر کو نیا اور تازہ کر سکتے تھے تو کیا ان اوصاف کو یکسر جھٹلایا جا سکتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حالؔی کا دیوان ۱۸۹۳ء میں چھپا تھا اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' پہلی بار اس دیوان کا ہی حصہ تھا تاہم تب سے اب تک یہ الگ ہو کر لگ بھگ ساٹھ ستر مرتبہ چھپ چکا ہے۔ یہ جتنی بار چھپا اتنی بار ہی بہ قول محمد حسن عسکری اس کی تعریفیں ہوئیں اور گالیاں پڑیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک یہ سلسلہ رکا نہیں ہے۔

چلیں، مان لیا کہ حالؔی نے مقدمہ کی صورت جو اصول لکھے، مغرب سے مستعار تھے تاہم ایسا کہتے ہوئے ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ نئی تنقید تک آتے آتے اس باب میں ہم بہت کچھ مغرب سے ہتھیا چکے ہیں۔ کیا یہ حالؔی کی عطا نہیں ہے کہ عین ایسے زمانے میں کہ جب تنقید تذکرہ نگاری کو سمجھا جا رہا تھا۔ مقدمہ کی وجہ سے اردو ادب پر حقیقی تنقید کا در باز ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اس باب کی پہلی کتاب نہ تھی جس نے تنقید کو ایک فن کی طرح برتا کچھ اصول وضع کیے اور ان اصولوں کو بروئے کار لا کر کچھ نتائج اخذ کیے۔ اور یہ بھی ماننا ہوگا ہے حالؔی محض اور نرے ناقد نہ تھے، ایک تخلیق کار ناقد تھے۔ ظاہر ہے وہ تخلیقی عمل کی نزاکتوں کے مقابل ہوتے رہتے تھے اور انہیں سمجھتے تھے۔ ایسے میں اگر انہوں نے ایسے عوامل کو نشان زد کیا جو تخلیقی عمل کا ناس مار دیتے تھے یا ایسے عوامل کو نمایاں کیا جو تقلید پرستی کے سبب لکھنے والوں کے لیے اہم نہ رہتے تھے، ایسا نہیں تھا کہ جن امور پر وہ زور دے رہے تھے صرف اور محض انھیں ہی شاعری میں اہم جان رہے تھے۔

حالؔی کے تنقیدی نظریات کو محض کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے حالؔی کی طرف سے منعقد کرائے جانے والے موضوعاتی مشاعروں کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا اتنا ہی غلط ہوگا جتنا کہ سرسید کے مطالبے پر لکھی گئی مدوجزر اسلام، جو بعد میں مسدس حالؔی کہلائی، سے کسی قومیت کے اس متضاد تصور کو برآمد کرنا۔ بات حالؔی کے تصور قومیت کی چل نکلی ہے تو کہتا چلوں کہ جس میں اگر پہلے یہ اصرار تھا کہ:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

حالؔی کے اس ''کسی'' میں مسلمان، ہندو، بدھ، برہمن سب شامل تھے مگر اسی حالؔی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ محض جغرافیائی سطح کے زمینی تعلق سے نہ قوم کو برآمد ہوتا دیکھ سکتے تھے نہ اس سے وطن کا تصور مکمل ہوتا تھا:

کہیے حب وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ بدتر

زمین سے کچھ اور سا تعلق اور کسی اور سے کسی اور سطح کا تعلق کی تلاش کی جستجو حالؔی کو صحیح یا غلط اس مقام پر لے آتی ہے جہاں وہ یوں شکوہ کناں ہوتے دیکھے جا سکتے ہیں:

حال اپنا سخت عبرت ناک تو نے کر دیا
آگ تھے اے ہند ہم کو خاک تو نے کر دیا
ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کر دیا
تو نے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا

یہ لگ بھگ وہی طرز احساس ہے جس سے دو قومی نظریہ پھوٹا تھا اور اسی سے قومیت کا وہ تصور بھی پھوٹتے دیکھا جا سکتا ہے جس میں فقط زمینی شراکت کام نہیں کر رہی ہوتی، فکریات اور ایمانیات کو بھی دخل ہو جاتا ہے۔ خیر یہ الگ بحث ہے کہ اس طرح کے طرز فکر سے ابھرنے والا قومی تصور درست تھا یا ناقص، تاہم یہ واقعہ ہے کہ آگے چل کر یہی کام کر رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی تنقید کے معاملے میں بھی حالؔی نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ ہماری تنقید کے لیے بنیاد بن گیا۔ یہ بنیاد ٹیڑھی تھی یا درست، یہ الگ قضیہ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری روایت کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔

عین ایسے زمانے میں کہ جب شعر امراء کے تقرب کا وسیلہ تھا؛ حالؔی اگر تخلیقی عمل کی آزادی پر زور دے رہے تھے تو اس کا سبب یہ تھا کہ مدحیہ مضامین میں ممدوحین کے لیے جن جھوٹے جذبوں کو شعر کا حصہ بنایا جا رہا تھا وہ تخلیقی عمل کو آزادی سے کام نہیں کرنے دے رہے تھے۔ لگ بھگ ایسا ہی عشقیہ مضامین کے حوالے سے سلسلہ چل نکلا تھا کہ یہاں ممدوحین کی جگہ تقلید نے لے لی تھی۔ حالؔی کو اگر دونوں مضامین چچھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح شعر میں بے مزہ ہو دِکھتے تھے یا وہ اندھی تقلید اور ریاکار جذبوں کو تخلیقی عمل کے دوران جھٹک دینے اور خالص جذبوں اور باطن کی بھرپور شرکت کے ساتھ تخلیقی عمل کے مقابل ہونے پر اگر زور دیتے نظر آتے ہیں تو تخلیقی عمل کے باب میں ایسا مطالبہ نا روا بھی نہیں ہے۔

نئی شاعری کا جو مزاج اس وقت ہمارے سامنے ہے، اسے سامنے رکھیں اور حالؔی کے مقدمے کو بھی تو حیرت ہوتی ہے کہ حالؔی جو بات لگ بھگ ۱۲۱ سال پہلے کہہ رہے تھے وہی آج بھی ہم ایک اصول کے طور پر

مان رہے ہیں۔ مثلاً حالؔی جب طبع کے موزوں ہونے، زبان کو مختلف سطحوں پر جانچنے، تخیل کے سرسبز ہونے کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم آج کی نئی شاعری کی بنیاد میں ان عناصر کو نہیں دیکھ رہے۔ محض زبان اور کسی مضمون کو بہ رنگِ دگر باندھنے سے الگ ہو کر شاعری کرنے کا جو تخلیقی تصور حالؔی کے ہاں ہے یہ اس دور میں نیا اور انوکھا ضرور تھا مگر ہم دیکھتے ہیں یہی اس باب میں تنقیدی اصول بنتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ ہماری آج کی نئی نظم والوں کے ہاں امیج کا بہت چرچا ہے۔ ہم بھول رہے ہیں کہ حالؔی نے شاعری میں محض موضوع کو برتنا کافی نہیں جانا تھا وہ تو خیال کو مصور کرنے کی بات کرتے تھے اور خیال کی تصویر میں تقلیب ہی کو شاعری سمجھتے تھے۔ تاہم ان کا تنقیدی اصول شوخ رنگوں کی بہ جائے اس باب میں صاف اور سادہ رنگوں کو ترجیح دیتا تھا۔ حالؔی کا کہنا تھا، غزل میں نئے اسلوب کی گنجائش ممکن نہیں ہے۔ اس میں غیر مانوس الفاظ سے اجتناب اور صاف سادہ زبان پر قناعت سے زیادہ لطف پیدا کیا جا سکتا ہے۔ حالؔی اگر یہ کہتے تھے کہ اس باب میں کاریگری نہیں چلتی تو کچھا درست بھی نہیں کہتے تھے۔ ظفر اقبال تک آتے آتے ہم نے غزل کو بدلنے کی جتنی کوششیں کی ہیں، اور جو جو کاریگریاں دکھائی ہیں انہیں اگر حالؔی کی اس تنقیدی بصیرت کی روشنی میں رکھ کر پرکھا جائے تو سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

حالؔی نے شعر کی ایک اور خصوصیت بھی بتا رکھی ہے کہ اس کا اثر عقل کے ذریعے نہیں بلکہ ادراک کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ عقل جس طرح علت اور معلول سے وابستہ ہو کر چلتی ہے شعر عین بعین ویسے نہیں چلتا نہ چل سکتا ہے۔ یہ جو بیچ میں رخنے رہ جاتے ہیں شاعر اپنے تخلیقی قرینے سے شعر میں ایسی گنجائشیں رکھ چھوڑتا ہے کہ پڑھنے والے کا ادراک انہیں پاٹتا چلا جائے۔ ظاہر ہے ایسے میں موضوعات کو غیر شاعرانہ سطح پر استعمال کرنے کی بات حالؔی کیسے کر سکتے تھے مگر ایسا ہے کہ جنہیں حالؔی کی بھد اڑانا تھی وہ میمون بن قیس اعشیٰ والا واقعہ لے اڑے اور کہا کہ حالؔی تو شاعری سے شادی دفتر کا کام لینا چاہتے تھے۔ نابینا عرب شاعر اعشیٰ کا قصہ، جو حالؔی نے بیان کیا یوں تھا کہ اس کے بارے میں مشہور تھا جس کی تعریف اس نے اپنی شاعری میں کر دی وہ نیک نام ہوا اور جسے رگید ڈالا وہ بدنام اور رسوا ہوا۔ اس کے پاس ایک بڑھیا پہنچی جس کی بچیوں کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ اعشیٰ نے بڑھیا کی درخواست پر بچیوں کی خوب صورتی کا ذکر اپنی شاعری میں کر دیا پھر کیا تھا رشتے آنے لگے، سب کی شادیاں ہو گئیں۔ ہمارے ترقی پسندوں تک آتے آتے شاعری سے انقلاب لانے کا اگر کام لیا جانے لگا ہے تو حالؔی کو اس باب میں برا بھلا کیوں کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تو

شاعری میں اثر انگیزی کی ایک قوت کو نشان زد کر رہے تھے۔ اعشیٰ بڑھیا کے دکھ کو اپنے دل پر لے کر جس طرح شعر کہہ رہا تھا، پارٹی لائن کی بجائے، جہاں بھی شاعر نے اسے اپنے دل کا معاملہ بنایا اس کا شعر تاثیر کی ایسی ہی دولت سے مالا مال ہوا۔

اب رہی حالؔی کی نیچرل شاعری کی بات، تو اس کو بھی اوپر نشان زد کیے گئے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ مثلاً جب حالؔی یہ کہتے ہیں کہ مضامین عشقیہ شخصی نہ ہوں اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ خیالات نیچرل ہوں تو وہ دراصل شاعر کے انفرادی تجربے کو عصری حسیت کے ساتھ جڑ جانے اور شاعر کے ذاتی تجربے کو اجتماعی تجربے سے پیوست ہو کر معنیاتی امکانات کو توسیع دینے کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ لگ بھگ ویسی ہی بات ہے جو ہماری ترقی پسند تنقید کا وتیرہ ہو گئی تھی۔ جی میرا اشارہ اس وتیرے کی جانب ہے، جس کے تحت منٹو جیسے ترقی پسند افسانہ نگار کو بھی جنسی اشتعال پھیلانے والا قرار دے کر الگ کر دیا گیا تھا۔ یہاں حالؔی شعر میں ایسی اثر انگیزی دیکھ رہے ہیں جو سماج کو بدل سکتی ہے۔ ہماری ترقی پسند تنقید بھی لگ بھگ ایسی ہی تاثیر کا مطالبہ کرتی آئی ہے۔

حالؔی آج سے ایک سو اکیس سال پہلے یہ دیکھ رہے تھے کہ سائنس کے میکانکی زمانے میں بھی شعر کی اہمیت باقی رہے گی۔ وہ آدمی کے دل میں موجزن عشق کو ایک قوت متحرکہ کے طور پر دیکھتے تھے، جو میکانکی زمانے میں بھی مات نہیں کھانے والا تھا۔ تاہم وہ بجا طور پر شاعری کو جذبات کی تہذیب اور ایک سطح پر اخلاقیات سے جوڑ کر دیکھتے تھے اور میکانکی زمانے میں بھی اسے روحانی خوشی سے جوڑتے تھے۔ ہماری نئی نظم کے بہت اہم نام مجید امجد نے بھی شاعری کو عمل خیر سے جوڑ کر دیکھا ہے۔

حالؔی کی ۱۰۰ویں برسی کے اس خصوصی موقع پر، یہ بات کرتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہماری تنقید جو گزشتہ پچیس تیس سالوں سے لسانی اور فلسفیانہ مباحث میں الجھی ہوئی تھی پھر سے تخلیق کے بھید بھنوروں سے بات کرنے لگی ہے۔ جی یہ وہی تنقید ہے جس نے مصنف کو مار کر اس پر چاروں قل پڑھ ڈالے تھے، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اب اسے مصنف نظر آنے لگا ہے، اور مصنف سے جڑی ہوئی اس کی تخلیق بھی۔ اس تنقید کا حالؔی سے بھی رشتہ قائم ہو جانا یقینی ہے، جی اسی حالؔی سے جس نے کہا تھا:

ٹپکتا ہے اشعار حالؔی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

حالؔی کا سادہ دل جہاں مبتلا ہوا تھا اور اس ابتلا میں انہوں نے جو اصول مقدمہ شعر و شاعری میں بیان کر دیے تھے اس کا ایک حصہ رد ہو بھی جائے تو یہ ہمارے حال سے جڑ جاتا ہے۔ میں نے اس تحریر کے عنوان کے طور پر لکھا تھا: ’تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی‘۔ اب جی چاہتا ہے حالؔی کا پورا شعر لکھ دوں:

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

جی مان لیتے ہیں کہ حالؔی نے پنجاب بک ڈپو لاہور میں ملازمت کے عرصہ میں یعنی ۱۸۷۱ء کے لگ بھگ انگریزی سے اردو میں ہونے والے تراجم کی عبارتیں درست کرتے کرتے جو مرعوبیت پائی وہ اپنی تنقید میں ظاہر کر رہے تھے مگر کیا یہ اہم نہیں ہے کہ تنقید کے اصول ان کے ہاں ایک مرتب صورت میں نظر آتے ہیں اور وہ ان کو اتنے صاف صاف سمجھ رہے تھے کہ عربی اور فارسی کی برمحل امثال سے آنے والوں کے لیے بھی تنقیدی فراست کا چراغ روشن کرتے جاتے تھے۔ تو یوں ہے کہ ”تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی“ یہ پھانس محض مغربیت کا بھوت نہ تھا جو حالؔی پر سوار تھا، خود تخلیقی کے بھید بھنور بھی تھے جنہیں کھوجتے ہوئے وہ ہماری راہ روشن کر گئے تھے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر جمال نقوی

فکرِ حالیؔ: غزل سے نظم تک

خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے سترہ (۱۷) سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پانی پت سے دہلی آنے کے بعد وہ مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جیسے صاحبِ علم و فضل اور باکمال شاعر کی مصاحبت میں آٹھ سال گزارے۔ ان دونوں بزرگوں کا انہوں نے بہت اثر قبول کیا۔ انہوں نے غالب سے نازک خیالی اور حسن و ادا سیکھا، شیفتہ سے جذبات کی ترجمانی، سلاست روانی اور مطالعۂ میر سے زبان کی سادگی، صفائی، سنجیدگی اور تاثیر حاصل کی۔ اسی لیے انہوں نے خود کہا:

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں
شاگرد میرزا کا، مقلد ہوں میر کا

اسی سلسلے کے ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

تم نے کیا وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو ہم سمجھائیں کیا

حالیؔ کی غزلیں نہایت پُرکیف اور اثرانگیز ہیں۔ تغزل کا اصلی رنگ اور دہلی اسکول کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں، مگر جب انہوں نے قوم کی پستی اور زبوں حالیؔ کو دیکھا تو ان کا دل تڑپ اٹھا۔ ساتھ ہی سرسید کی اصلاحی تحریک سے وہ پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے اور انگریزی ادب کے تراجم کے

مطالعے سے وہ مغربی شاعری میں مضامین کی وسعت اور بیان کی سادگی اور واقعیت سے پہلے ہی آگاہ ہو چکے تھے۔ وہ سرسید کے معاون بن کر میدان میں آ گئے۔ حالؔی نے یہ بات سمجھ لی کہ اب قوم کو گل و بلبل اور عشق و محبت کی داستانوں کی ضرورت نہیں بلکہ اسے ایک ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جو اسے خواب سے بیدار کر دے اور اس میں جوش و ولولہ پیدا کر دے۔ اسی لیے انہوں نے بازارِ ادب میں سب سے الگ ایک دکان کھولی اور غزل گوئی ترک کر کے قومی، ملی، اصلاحی اور اخلاقی شاعری کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود کہا:

اب گئے حالؔی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی گاتے ہو کیا

مال ہے نایاب، پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ

لاہور میں محمد حسین آزاد، انجمن پنجاب کے تحت یہی کام پہلے سے کر رہے تھے۔ جہاں مصرع طرح کے بجائے مختلف عنوانات دے کر مشاعرے کروائے جاتے۔ حالؔی بھی ان مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ حبِ وطن، مناظرۂ رحم و انصاف، نشاطِ امید اور برکھا رُت انہی مشاعروں میں پڑھی گئیں اور مقبول ہوئیں۔

جس کام کی ابتدا آزاد نے کی تھی حالؔی نے اس کو عملی صورت میں فروغ دیا۔ انہوں نے اردو شاعری کے اسالیب کو عملی طور سے بالکل بدل دیا اور اس کو جدید اصولوں سے آشنا کیا۔ ان کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' (۱۸۷۹ء) ان کی اسی فکر اور دردمندی کی ترجمان ہے۔ جس میں شعر کی تعریف اور اس کی عظمت کے ساتھ ہی اس کی تاثیر اور ماہیت کے بارے میں بہت تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور اساتذہ کے کلام سے مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کی اصلاح اور زمانے کی رفتار کے موافق اردو شاعری میں ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے اس پر بھی بہت دیدہ ریزی کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ حالؔی نے آخر میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے:

> ''اگرچہ اردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحتاً نکتہ چینی کی جائے کیوں کہ عمارت کا بودا پن جیسا بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت

> نہیں ہوتا۔ مگر اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں، جہاں تک ہو سکا اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر گرفت یا اعتراض اس طرح نہیں کیا گیا جو خاص اس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو۔ بل کہ شاعری کے عام طریقے پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا نقل کر دیا ہے۔ اس طرح ایسے اعتراض کیے ہیں جو نہ صرف اردو شاعری پر بلکہ تمام ایشیائی شاعری پر وارد ہوتے ہیں۔“

حالؔی نے عام قارئین کے ساتھ ہی خصوصی طور پر نوجوانوں یعنی نئے شاعروں سے جو شاعری کا چسکا رکھتے ہیں اور زمانے کے تیور پہچانتے ہیں، یہ امید کی ہے کہ وہ شاید اس مضمون کو پڑھیں اور کم از کم اس قدر تسلیم کریں کہ اردو شاعری کی موجودہ حالت بلا شبہ اصلاح یا ترمیم کی محتاج ہے۔

یہی نہیں بل کہ اُسی سال انہوں نے اپنا ایک طویل مسدس 'مدوجزرِ اسلام' جو چار سو ساٹھ بندوں پر مشتمل ہے، بھی شائع کیا جس میں اُن تمام باتوں کی موجودگی نظر آتی ہے جن کی نشان دہی 'مقدمۂ شعروشاعری' میں کی گئی ہے۔ مسدس کے آخری بند میں مسلمانوں کے لیے دعا کی گئی ہے:

بچا ان کو اس تنگنائے بلا سے
کہ رستہ ہو گم رہ رو و رہنما سے
نہ امیدِ یاری ہو یار آشنا سے
نہ چشمِ اعانت ہو دست و عصا سے
چپ و راس چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں
دلوں میں امیدوں کی جا حسرتیں ہوں

سر سید احمد خاں کے ایک خط بنام مولانا حالؔی مورخہ ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء سے پتہ چلتا ہے کہ حالؔی کو اس مسدس کی تخلیق کی تحریک انہوں نے ہی دی تھی:

> ”بے شک میں اس کا محرک ہوا اور میں اس کو اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تُو اپنی بخشش کے لیے کیا لایا ہے تو میں کہوں گا حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔“

اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس عہد کے تمام نئے ملی سرمایہ کی طرح جو بالواسطہ یا

بلا واسطہ سرسید کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا، یہ مسدس بھی سرسید کی ذاتی تحریک کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ”مسدس حالیؔ سے بلاشبہ اردو شاعری کی تاریخ میں قومی شاعری کی تحریک کو تقویت پہنچی۔ اس اعتبار سے حالیؔ کو اردو میں قومی شاعری کا نقیب قرار دینا غلط نہ ہوگا۔“

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے اس مسدس کی اہمیت کا اندازہ رام بابو سکسینہ کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کی معروف اور اہم کتاب ”تاریخِ ادب اردو“ میں موجود ہے:

> ”مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے، جس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخِ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگِ میل سمجھا جانا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے جو اردو کے افقِ شاعری پر طلوع ہوا، اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے ثابت کر دیا کہ ایسی پُر اثر اور پُر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔“

حالیؔ کا دل قومی درد اور قومی الفت کے جذبات سے لبریز تھا اور یہی رنگ ان کی جدید شاعری کا غالب عنصر بن گیا ہے۔ اور اسی نے ان کی شاعری میں رجائیت پیدا کی ہے۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے متعدد مثنویاں بھی تخلیق کی ہیں اور مقالات و مکاتیب بھی تحریر کیے ہیں۔ حالیؔ کا کہنا تھا کہ ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات سے قوم کو بالواسطہ یا بلا واسطہ فائدہ پہنچتا ہے۔ ایسے لوگوں کے نوادرافکار قوم کی رہنمائی کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب بھی تصنیف کیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ضیاء الحسن

حالؔی کی غزل: جدید اردو غزل کا نقشِ اوّل

مولانا الطاف حسین حالؔی کی شاعری کے بارے میں اردو تنقید نے بہت زیادہ سنجیدہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ عموماً ان کی شاعری کو قدیم دور اور جدید دور میں تقسیم کر کے وہی روایتی آرا دے دی جاتی ہیں جو اب کلیشے بن چکی ہیں۔ بعض نقادوں کی رائے میں ان کی قدیم شاعری خصوصاً غزل میں اعلیٰ درجے کی شاعری کے امکانات تھے جنھیں انھوں نے جدیدیت کے شوق میں گم کر دیا۔ بعض نقاد ان کی غزل کو ان کے عمومی دھیمے مزاج اور سادگی کے پیشِ نظر دیکھتے ہیں اور ان امکانات کو دریافت کرنے سے محروم رہتے ہیں جو انھوں نے جدید غزل کی روایت کے ضمن میں تلاش کیے۔ یہ درست ہے کہ حالؔی شخصی طور پر دھیمے مزاج کے سادہ اور پرخلوص انسان تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت عالم انسان تھے اور بہت نکھرا ہوا ذوقِ شعر رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کی شعری روایتوں پر ان کی بہت گہری نگاہ تھی اور وہ بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں سے بھی اپنے دیگر ہم عصروں کی نسبت زیادہ آگاہ تھے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ ادبی روایتیں خلا میں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ہر نئی روایت کی بنیاد پہلے سے موجود ادبی روایت کے زندہ عناصر پر استوار ہوتی ہے جسے یکسر رد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ہم ان کے اس نظریۂ ادب پر ان کی غزل کو پرکھیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جو نئی روایت غالب نے اپنے تخلیقی تجربے کی قوت سے آغاز کی، اسے انھوں نے شعوری کوشش کے ذریعے آگے بڑھایا اور غزل کی ایک نئی اور تر و تازہ روایت کی بنیاد رکھی جسے اقبال نے اپنے عظیم تخلیقی تجربے سے مستحکم کیا۔ غالب اور اقبال کے درمیان اگر حالؔی نہ ہوتے تو اقبال کو غزل کی اس نئی روایت کو قائم کرنے میں کئی مسائل درپیش ہو سکتے تھے، خصوصاً اقبال نے غزل کی جس نئی زبان کو دریافت کیا، اس کی طاقت انھیں حالؔی و اکبر سے حاصل ہوئی۔ ان دونوں شاعروں نے جس طرح شعوری طور پر غزل کی لفظیات کو تبدیل کیا اور ایک نیا نظامِ علامات بنانے کی سعی کی، اس نے اقبال کو اس قابل بنایا کہ وہ اس نئی روایت کو مستحکم کر سکیں۔ غزل کے نقاد کے لیے لازم ہے کہ وہ حالؔی کی غزل کو محض ایک شاعر کی غزل سمجھ کر مطالعہ نہ کرے بلکہ اسے ایک روایت ساز شاعر کے طور پر پڑھے۔ کسی پہلے سے موجود روایت میں شعر کہنے والا شاعر خود سے کوئی کاوش نہیں کرتا بلکہ روایت کے اندر

رہتے ہوئے اعلیٰ تخلیقی تجربے کی بازیافت کرتا ہے لیکن روایت ساز شاعر تخلیقی تجربے کی بازیافت کے ساتھ روایت بنانے کے عمل میں بھی منہمک ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی پوری توجہ تخلیقی تجربے پر مرکوز نہیں ہوتی بلکہ روایت سازی بھی اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ روایت سازی ایک تجربہ ہوتی ہے جس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات یکساں ہوتے ہیں، اس لیے ایسے شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا کام دوہری نوعیت کا ہے اور اس صورت میں اگر وہ اعلیٰ تخلیقی تجربے کی بازیافت کا کام بھی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کی شعری صلاحیتوں کا کمال ہے۔ دیوانِ حالیؔ میں بھی دونوں طرح کے اشعار ملتے ہیں، ایک وہ جو بطور شعر اعلیٰ درجے کے ہیں اور جن میں سے متعدد آج بھی مشہور ہیں اور زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ دوسرے وہ اشعار ہیں جو انھوں نے شعوری کاوش سے کہے، ان کی زبان روایتی زبان سے مختلف کی، ان میں نئی علامتیں پیش کیں اور نئی لسانی وفنی ساخت دریافت کی۔

حالیؔ ابتدا ہی سے نئے خیالات کو پسند کرنے والے انسان تھے۔ ان کی قدیم غزلوں کو روایتی صرف ایک وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں انھوں نے اسی روایتی نظامِ علامات کو برتا ہے جنھیں قلی قطب شاہ سے غالب تک، تمام اردو شاعروں نے استعمال کیا ہے لیکن حالیؔ ان علامات کو اختیار کرتے ہوئے بھی جدت پیدا کرنے کے خیال سے غافل نہیں رہتے۔ یہ نظامِ علامات عشق سے پیدا ہوا، چنانچہ عاشق، محبوب، زلف اور دیگر اجزائے حسن، وفا، جفا، صحرا، زنجیر، زنداں غرضیکہ تمام کلاسیکی شعری علامات کو اختیار کیا گیا ہے لیکن مضامین میں ان کا عہد پوری طرح اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ ایک تو وہ شعر ہے جو اس وقت کے سیاسی، سماجی، اخلاقی، اقداری، معاشی اور تہذیبی زوال کا بہترین نوحہ ہے:

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

دورِ اوّل کی دیگر غزلوں میں بھی متعدد ایسے اشعار میں جو روایتی نظامِ علامات کو اختیار کیے بغیر کہے گئے ہیں اور جن میں موضوعاتی ولسانی حوالے سے وہی جدت ہے جو حالیؔ کی دورِ جدید کی غزلوں میں ملتی ہے۔ ان اشعار کی زبان غیر شعوری طور پر غزل کی مخصوص زبان سے مختلف ہو گئی ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ حالیؔ لاشعوری طور پر غزل کی قدیم روایت سے کچھ زیادہ باطنی تعلق نہیں رکھتے تھے اور اسے تبدیل کرنا چاہتے تھے:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالؔی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
شہر و دریا سے ، باغ و صحرا سے
بو نہیں آتی آشنائی کی (۱)

حالؔی کی دورِ اوّل کی شاعری میں بیشتر کلاسیکی غزل کے نظامِ علامات سے کام لیا گیا اور کہیں کہیں حالؔی روایتی بھی محسوس ہوتے ہیں لیکن مجموعی طور پر اس دور کی غزل میں بھی نئی حسیت کا اظہار ہوا ہے۔ ان کی وہ غزلیں جن کے پہلے مصرعے درج ذیل ہیں، بہت معروف ہیں:

☆ پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
☆ آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
☆ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
☆ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
☆ کر دیا خوگر جفا تو نے
☆ دھوم تھی اپنی پارسائی کی
☆ رنج اور رنج بھی تنہائی کا (۲)

کلیاتِ نظمِ حالؔی میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے حالؔی کی قدیم دور کی تمیں، جدید دور کی چھیاسی اور دورِ آخر کی سات غزلیں درج کی ہیں۔ یوں مجموعی طور پر حالؔی کی غزلوں کی تعداد ایک سو تئیس بنتی ہے۔ اگرچہ حالؔی کی غزلیں تعداد کے اعتبار سے کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن جدید اردو غزل کی روایت کے آغاز اور ترویج و اشاعت میں انھیں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حالؔی جدید غزل کے پہلے باقاعدہ شاعر ہیں جنھوں نے ایک طرف مقدمۂ شعر و شاعری میں جدید غزل کے خدوخال واضح کیے اور دوسری طرف اس کے مطابق غزل کہہ کر نمونہ بھی مہیا کیا۔

غزل کی ریزہ خیالی کے خلاف مربوط خیالات کے اظہار کا طریقہ ڈھونڈنے کا کام تو انجمن پنجاب سے ہی آغاز ہو گیا تھا۔ غزل کے حوالے سے قطعہ بند اشعار اور غزلِ مسلسل کی طرف کچھ اشارہ حالؔی نے یادگار

غالب میں کیا اور مقدمۂ شعر و شاعری میں اس پر بات کی، حالؔی کی دورِ جدید کی شاعری میں اس کا التزام شعوری کاوش سے کیا گیا ہے۔ ان کی وہ غزل جس کا پہلا مصرع ''اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا'' ہے، غزل سے زیادہ نظم محسوس ہوتی ہے۔ اگر حالؔی اس پر کوئی عنوان مثلاً ''درمذمتِ عشق'' لکھ کر اسے نظم شمار کرتے تو اس پر کسی نقاد نے سوالیہ نشان قائم نہیں کرنا تھا۔ اس غزل کے علاوہ بھی درج ذیل مصرعوں والی غزلیں موضوعاتی تسلسل کی حامل ہیں اور نظمیہ آہنگ کو پیش کرتی ہیں:

☆ قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اسے سوا تیرا
☆ کامل ہے جو ازل سے، وہ ہے کمال تیرا
☆ وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
☆ کہیں الہام منوانا پڑے گا
☆ دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب
☆ یہ ہیں واعظ، سب پہ منہ آتے ہیں آپ
☆ باپ کا ہے جبھی پسر وارث
☆ بھیدواعظ اپنا کھلوایا عبث
☆ کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
☆ مئے مغاں کا ہے چسکا اگر برا، اے شیخ
☆ کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
☆ کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
☆ جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
☆ رنجش و التفات و ناز و نیاز
☆ اک ہم کو مہم برسرِ ایام ہے درپیش
☆ چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
☆ اے بہارِ زندگانی الوداع
☆ عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
☆ خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم

☆ بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
☆ بھلی اور بری سب گزر جائے گی (۳)

یہ اکیس (۲۱) غزلیں تو وہ ہیں جن پر مختلف مناسب عنوانات لکھ دیے جائیں تو مکمل نظم ہیں۔ اقبال کی شاعری میں کئی نظمیں ایسی ہیں جو غزل کی ہیئت میں ہیں۔ بالِ جبریل کی کئی غزلوں پر نظم کا گمان گزرتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ وصف حاؔلی کی ادبی روایت سے پیدا ہوا۔ حاؔلی کی دیگر غزلوں میں بھی یہ خوبی اکثر مقامات پر نظر آتی ہے۔ ان کی بعض غزلیں ایسی ہیں جن میں اشعار تو مختلف موضوعات پر ہیں لیکن تمام موضوعات کسی ایک احساس یا کیفیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ حاؔلی کی دورِ جدید کی تمام غزلوں میں غزل کی ریزہ خیالی کا احساس کم سے کم پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کہہ کر ثابت کر دیا ہے کہ شاعر چاہے تو پوری غزل ایسے کہہ سکتا ہے جو فنی طور پر مکمل غزل ہوتے ہوئے بھی قاری میں کوئی ایک موضوع، کیفیت یا احساس پیدا کر دے۔

موضوعاتی حوالے سے دیکھا جائے تو حاؔلی کی غزل مجموعی طور پر غیر عشقیہ اصلاحی غزل ہے۔ بات اگر یہاں تک بھی رہتی تو قابل قبول تھی لیکن حاؔلی ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور عشق کی مذمت کا فریضہ بھی تن دہی سے انجام دیتے ہیں۔ ''اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا'' والی غزل کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر غزلوں میں عشق کی مذمت میں بہت سے شعر کہہ ڈالے۔ ان شعروں کو پیش نظر رکھیں تو حاؔلی کا نظریۂ عشق بہت سطحی نظر آتا ہے۔ ان کے خیال میں جب عشق کی بری عادت قوموں میں پیدا ہوتی ہیں تو قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کا اخلاق خراب ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو تاکتے پھرتے ہیں۔ جس شاعری میں عشق کو موضوع بنایا جاتا ہے، اس میں مخدرات کو رسوا کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے قومی زوال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عشق و عاشقی کو شعار بنا لیا ہے وغیرہ۔ کہیں کہیں عشق کا وہ تصور بھی حاؔلی کے ہاں نظر آتا ہے جسے ہمارے نمایندہ غزل گو کلاسیکی شعرا نے دریافت کیا تھا:

عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے
نرخِ متاعِ عشق الٰہی گراں رہے (۴)

دیوانِ حاؔلی میں ایک دو شعر ایسے بھی مل جاتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ حاؔلی عشق کے خلاف کس لیے ہوئے یا وہ غزل کی شاعری کے لیے کیوں عشق کو برا سمجھتے تھے اور مقدمے میں انھوں نے شاعروں کو مشورہ

دیا کہ وہ عشقیہ موضوعات سے بچیں۔ حالؔی سمجھتے تھے کہ ان کے دور میں عشق نے ہوس کا لباس زیب تن کر لیا ہے اور اپنے اصل جوہر سے محروم ہو گیا ہے۔ شاید ان کا خیال یہ بھی ہو کہ ان حالات میں عشق کا صحیح تصور پیدا کرنا ممکن نہیں رہا، اس لیے بہتر یہ ہے کہ زندگی اور شاعری سے عشق کو خارج کر دیا جائے۔ وجہ کچھ بھی کیوں نہ رہی ہو، یہ حقیقت ہے کہ حالؔی کی شاعری اس تصور سے خالی ہے اور وہ اپنے ہم عصر اور آنے والے شاعروں کو عشق کے بجائے تمام انسانی رشتوں اور تعلقات کے حوالے سے شعر کہنے اور عشقیہ شاعری سے اجتناب یا کم رغبتی کا مشورہ دیتے ہیں:

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مئے ناب کے دلال قدح خوار نہیں (۵)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ حالؔی عشقیہ مثنویوں کے تصورِ عشق اور اپنے ہم عصر لکھنوی شاعروں کے ہوس آلود تصورِ عشق کے خلاف تھے اور سمجھتے تھے کہ فی زمانہ اس تصور کو بدلنا ممکن نہیں، اس لیے اسے ترک کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ حالؔی جیسے شاعری کے اعلیٰ ذوق رکھنے والے نقاد اور تخلیق کار سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کلاسیکی فارسی و اردو شاعری کے عظیم تصورِ عشق سے واقف نہ ہوں جس نے ہزاروں عظیم شعروں کے لیے مواد کا کام دیا۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں عشق وہ نیوکلیئس ہے جس نے پورا تصورِ حیات تشکیل دیا اور اعلیٰ زندگی کے لیے اقدارِ حیات پیدا کیں لیکن اس آگاہی کے باوصف انھوں نے جب نظریہ سازی کی تو عشق معتوب کیا اور جب شاعری کی تو اس کی مذمت کی یا شعری موضوعات سے اسے خارج کر دیا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ یادگارِ غالب لکھنے والا اور غالب کی صحبتوں اور شاعری سے فیض یاب ہونے والا شاعر اور نقاد یہ نہ جانتا ہو کہ اس آخری عظیم غزل گو کی شاعری اسی نظامِ عشق کی زائیدہ ہے جس نے میر، سودا، درد، مصحفی اور آتش جیسے شاعر پیدا کیے اور ان سے قبل فارسی میں عظیم عشقیہ شعری روایت قائم کی۔ ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے اقبال کا جنھوں نے حالؔی کے مشوروں کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھا اور اس عظیم عشقیہ شعری روایت کی بازیافت ایک نئی شعری زبان میں کی۔ اگر حالؔی بالِ جبریل کی غزلوں کا تصور کر سکتے تو یقیناً عشق کی مخالفت و مذمت کرنے کے بجائے یہ کہتے کہ اب عشقیہ شاعری کو نئے نظامِ علامات کی ضرورت ہے کیوں کہ قدیم نظامِ علامات اب کلیشے بن چکا ہے جس کی وجہ سے بے معنویت کا شکار ہو چکا ہے۔ چنانچہ انھیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی:

اے عشق تو نے رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا
جتنے رمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بنانا ہرگز (۶)

عشق کے حوالے سے حالؔی نے جن خیالات کا اظہار مقدمۂ شعر و شاعری میں کیا ہے، ان سے ایک غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ غزل میں چاشنی یا لطف عشقیہ موضوعات پیدا کرتے ہیں۔ حالؔی کے تصور کے اثرات آج تک پائے جاتے ہیں کیوں کہ آج بھی غزل کی بہت گہری فہم رکھنے والے لوگ بھی غزل کے لطف یا تغزل کو عشقیہ تجربے سے مشروط سمجھتے ہیں حالاں کہ نہ کسی کلاسیکی دور میں اور نہ ہی جدید اردو غزل میں تغزل یا لطف کا واحد ذریعہ عشقیہ تجربہ یا عشقیہ لفظیات و علامات تھے۔ خود حالؔی کی شاعری میں یہ خصوصیت عشق سے احتراز کے باوجود فراواں ہے جس کی وجہ سے حالؔی کی شاعری کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ وہ غزل کے ایک عبوری دور کے شاعر تھے بلکہ اس لیے ہے کہ دیوانِ حالؔی میں اعلیٰ درجے کے اشعار ایک قابلِ توجہ تعداد موجود ہیں:

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی ، عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے
عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
سپاہ و میر سپہ باغ باغ ہیں لیکن
بُہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُن کی اور ان کا آسماں سب الگ

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن! کس کا ہے

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی (۷)

حالؔی نے مقدمے میں غزل گو شاعروں کو جن باتوں سے بچنے کا مشورہ دیا، ان میں خمریات اور

واعظ/زاہد/شیخ کے خلاف تمسخرانہ اور استہزائیہ اسلوب شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شراب کے حوالے سے انھیں شعر کہنے چاہییں جنھیں اس کا تجربہ حاصل ہوا یا جو شراب کو استعارہ بنا سکتے ہوں اور علمائے کرام کے خلاف صرف اس طرح اظہارِ خیال کرنا چاہیے جس سے دین کی ظاہر رسوم کی پابندی اور تزکیۂ نفس سے بے تعلقی جیسے منفی رویوں کی مذمت ہو اور شخصی اظہار سے بچنا چاہیے۔ دیوانِ حاؔلی میں اصلاحی موضوعات اور زوال کی نوحہ خوانی کے ساتھ جو موضوع سب سے زیادہ برتا گیا ہے، وہ اس کردار کی مذمت ہے۔ ان کی زاہد، واعظ، شیخ کی ردیفوں والی نظم نما غزلوں کے علاوہ بھی درجنوں شعر اس موضوع پر مل جاتے ہیں۔ بعض غزلوں میں کئی کئی شعر مسلسل ہیں۔ ”بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث“ والی تقریباً مکمل غزل اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ حاؔلی نے یہ شعر روایتاً نہیں کہے بلکہ ان کی شاعری سے قومی زوال کا جو تجزیہ سامنے آتا ہے، اس میں ان کے نزدیک ملا کا کردار بنیادی ہے۔ ملّا نے دین کی رسومات پر اصرار کیا اور دین کی اصل روح سے خود بھی بے بہرہ رہا اور عوام کو بھی بے بہرہ رکھا جس کی وجہ سے اصل دین سے دوری پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں قومی سطح پر وہ اخلاقی زوال پیدا ہوا جس کی وجہ سے قوم سیاسی اور سماجی سطح پر انحطاط کا شکار ہو گئی۔ حاؔلی کے اس موضوع پر کہے گئے اشعار زیادہ تر منظوم اظہار ہی بن سکے ہیں اور شاعری کے درجے پر کم کم ہی پہنچے ہیں لیکن چند اشعار ایسے بھی ہیں جن کا شمار اس موضوع پر لکھے گئے بہترین اشعار میں کیا جا سکتا ہے:

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستّار ہے تو نہ غفّار واعظ

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

واعظو دین کا خدا حافظ
انبیاؑ کے ہو تم اگر وارث (۸)

جدید اردو غزل کی روایت سازی میں حالؔی کا سب سے بڑا کارنامہ غزل کے کلاسیکی نظام علامات کا ترک اور نئی علامتوں کے لیے ان کی کاوشیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو غزل اور کلاسیکی اردو غزل میں بنیادی فرق اسی نظامِ علامات کا ہی ہے۔ یہ علامتیں ویسے بھی از کار رفتہ ہو گئی تھیں کیوں کہ یہ جس اقداری نظام کو پیش کرتی تھیں اور جس نظریۂ حیات سے پیدا ہوئی تھیں، اس کی جگہ نئی صنعتی و سرمایہ دارانہ معاشرت لیتی جا رہی تھی۔ جب زندگی اور تہذیب ہی وہ نہ رہی تو اس کو پیش کرنے والی علامتیں سطحیت اور بے معنویت کا شکار ہو گئیں۔ تصوف اور عشق سے پیدا شدہ علامتوں کی جگہ جدید غزل میں شخصی علامتوں نے حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ حالؔی، اکبر، اقبال اور ان کے بعد یگانہ، فراق اور مابعد کے شاعروں نے کلاسیکی علامتوں کے بجائے اپنے باطن سے اپنی علامتیں وضع کیں، جدید غزل کے اس رویے کا آغاز حالؔی نے اپنی غزل میں کیا۔ ان کی اپنی قدیم اور جدید دور کی شاعری میں بنیادی فرق یہی ہے، جدید دور کی شاعری میں عشق یا اس کے متعلقات آئے بھی ہیں تو استرداد کی غرض جس کی طرف گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کلاسیکی علامتوں میں سے انھوں نے ناصح/واعظ/زاہد/شیخ کی علامت کو کثرت سے استعمال کیا ہے لیکن یہاں بھی ان کا انداز کلاسیکی شاعروں سے مختلف اور اقبال کے زیادہ قریب ہے۔ اقبال نے تو ناصح/واعظ/زاہد/شیخ کے کہنے کے بجائے اسے براہ راست ملا ہی کہہ دیا۔ کلاسیکی شاعری کے دور میں زندگی اجتماعیت کی حامل تھی اور اس دور کے تمام شعرا ایک اجتماعی نظامِ علامات میں شاعری کر رہے تھے۔ جدید دور میں زندگی انفرادیت کی حامل تھی جس کی وجہ شاعروں کا تخلیقی تجربہ بھی انفرادیت کا حامل نظر آتا ہے۔ حالؔی نے مقدمے میں نئی لفظیات کے لیے شعوری کاوش کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ نئے لفظ اس طرح شاعری میں شامل کرنے چاہییں کہ غرابت کا احساس پیدا نہ کریں کیوں کہ غرابت کی وجہ سے عام قاری/سامع کا ذہن انھیں قبول نہیں کرتا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بہت غیر محسوس طریقے سے یہ کام کیا ہے۔ اگر چہ کہیں کہیں کچھ لفظوں کے استعمال میں غرابت کا احساس ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر حالؔی نے اپنے گرد و پیش میں موجود زندگی سے اپنی لفظیات کشید کیں جس کی وجہ سے ان کے اظہار میں فطری روانی نظر آتی ہے۔ حالؔی نے زبان کے سلسلے میں ایک اور کام بھی کیا جس سے بعد میں اقبال نے بہت فایدہ اٹھایا۔ انھوں نے عموماً تلمیح کے ضمن میں استعمال ہونے والے اسمائے معرفہ یعنی شہروں، تہذیبوں اور نامور شخصیتوں کے نام کو تلمیح سے زیادہ علامتی انداز میں استعمال کیا۔ آغاز کنندہ کے حیثیت سے حالؔی کے استعمال میں ہر دفعہ شعریت پیدا نہیں ہوئی لیکن اقبال نے اپنے عظیم تخلیقی تجربے میں جب اس خصوصیت کو ڈھالا تو زیادہ شعریت پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ درج بالا تمام معروضات حالؔی کی زبان

بدلنے کے ضمن میں کی گئی شعوری کاوشوں کے بارے میں ہیں۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالؔی کی شاعری موضوعاتی سطح پر بھی تبدیل ہوئی لیکن اصل کام یہ ہوا کہ انھوں نے جدید اردو غزل کی لسانی سمت نمائی کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دیا جس پر بعد کے جدید شاعروں نے زیادہ شاندار عمارت تعمیر کی۔ حالؔی کے زبان وبیان میں آنے والی ان تمام تبدیلیوں کے حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے ، بدخشان و ختن کس کا ہے
رہی دانائی آخر غالب آ کر پہلوانی پر
گئے چیں مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی
گرایا تورانیوں کو تو ، پچھاڑا مازندرانیوں کو
کہاں تلک اے شراب غفلت یہ تیری مردانگی رہے گی
غرور و حرص ہیں زیور عروسِ دنیا کے
بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لائق (۹)

ان بنیادی لسانی جدتوں کے ساتھ حالؔی نے مقدمے میں فنی حوالے سے جو مشورے دیے تھے، دیوانِ حالؔی میں اس کے نمونے بھی وافر ملتے ہیں۔ حالؔی نے غزل کی تہذیب بدلنے کے لیے جو باتیں بھی کیں وہ بے حد اہم تھیں مثلاً انھوں نے سنگلاخ زمینوں سے بچنے کی تلقین کی تھی، دیوانِ حالؔی میں زمینوں کے حوالے سے بہت سی جدتیں کی گئی ہیں اور نئی نئی زمینیں تراشی گئی ہیں۔ وہ غزلیں جن کی ردیفیں سب سے الگ، ایک ہی شخص، ایک ایک، وارث، عبث اور بس ہیں، ان میں اچھے شعر نکالنے کے لیے شاعر کا ہنرمند ہونا لازم ہے۔ ان غزلوں میں حالؔی نے بہت سے خوبصورت شعر کہے ہیں اور ردیفوں کے نئے پن اور تنوع سے خوب کام کیا ہے۔ حالؔی نے مقدمے میں مشورہ دیا تھا کہ شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ قافیہ اور ردیف دو کلموں سے زیادہ نہ ہوں اور آہستہ آہستہ اردو میں غیر مردّف غزل کہنے کی روایت ڈالنی چاہیے۔ دیوانِ حالؔی میں غزلوں کی سب سے بڑی تعداد انھی غزلوں کی ہے جن میں قافیہ و ردیف دو کلمات پر مشتمل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد غیر مردف غزلوں کی بھی ہے۔ اس زمانے میں جب غیر مردف غزلیں کہنے کا رواج بہت کم تھا، دیوانِ حالؔی میں بیس غیر مردف غزلوں کا ہونا ایک انقلابی قدم تھا۔ حالؔی کے اس نقطۂ نظر کی زیادہ بہتر عملی صورت بعد میں اقبال کی بالِ جبریل میں ملتی ہے جس میں ستتر میں سے چھپن غیر مردف غزلیں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حالؔی کے جدید غزل کے خواب کی تعبیر اقبال کی شاعری میں ملتی ہے۔ حالؔی نے جن تبدیلیوں کا آغاز کیا، ان کو پایۂ تکمیل تک اقبال نے پہنچایا اور غزل تخلیقی توانائی کے ساتھ ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔

حالؔی صرف غزل کی نئی روایت آغاز کرنے والے ہی نہیں تھے بلکہ ان کے دیوان میں اعلیٰ درجے کے شعر وافر تعداد میں ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کی شاعری میں ضرب المثل بننے کی قوت بھی موجود تھی۔ ان کے متعدد شعر زبان زدِ خاص و عام ہیں اور انھیں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے۔ کسی شعر میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اجتماعی آرزوؤں، تمناؤں اور مسائل و معاملات کا آئینہ دار ہو۔ اس کے ساتھ اس کی زبان و بیان میں وہ قوت ہو جو ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو اپنا اسیر بنا لے۔ ان کے بعض معروف شعر اور مصرعے ایسے ہیں جن کے بارے میں نقل کرنے والوں کو علم بھی نہیں ہوتا کہ اس کے خالق حالؔی ہیں، کئی شعر ایسے ہیں جنھیں مختلف حالات پر منطبق کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان کے مفاہیم میں عمومیت اور وسعت پائی جاتی ہے:

☆ وہ وعدہ نہیں جو وفا ہوگیا
☆ گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
☆ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
☆ کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
☆ تکلف علامت ہے بیگانگی کی
☆ بری اور بھلی سب گزر جائے گی

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے (۱۰)

ان ضرب المثل اشعار اور مصرعوں کے علاوہ حالؔی کے درجنوں اشعار ایسے ہیں جو بہت مشہور ہیں اور جن میں سے کئی اشعار کا حوالہ اس مضمون میں دیا جا چکا ہے۔ حالؔی کے سر صرف غزل کی نئی روایت آغاز

کرنے کا سہرا ہی نہیں ہے بلکہ وہ غزل کی چار سو سالہ روایت کے ان ڈیڑھ درجن شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کے اشعار آج بھی زندہ ہیں۔ حالیؔ بلاشبہ غالب اور اقبال کے درمیانی دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔

حواشی

۱۔ الطاف حسین حالیؔ، کلیاتِ نظمِ حالیؔ۔ مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص: ۷۳،۸۳،۸۴

۲۔ ایضاً، ص: ۵۹،۶۶،۶۷،۷۳،۷۹،۶۰

۳۔ ایضاً، ص: ۸۶،۸۷،۸۴،۹۸،۱۰۳،۱۰۴،۱۰۸،۱۰۹،۱۱۲،۱۱۳،۱۱۴،۱۱۶،۱۱۹،۱۲۱،۱۲۵،۱۲۹،۱۳۰، ۱۳۳،۱۳۷،۱۴۸،۱۵۳

۴۔ ایضاً، ص: ۱۲۱،۱۶۰،۱۴۳

۵۔ ایضاً، ص: ۱۳۷،۱۴۳

۶۔ ایضاً، ص: ۹۷،۱۱۹

۷۔ ایضاً، ص: ۳–۱۵۲،۱۴۳،۱۵۲،۱۵۴

۸۔ ایضاً، ص: ۱۰۶،۱۲۹،۱۰۲،۱۰۸

۹۔ ایضاً، ص: ۱۵۲،۱۵۴،۱۶۶،۱۳۱،۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص: ۶۳،۵۹،۶۷،۱۳۹،۱۴۸،۱۵۳،۷۳،۶۱_۱۶۰

☆☆☆☆

ڈاکٹر منور ہاشمی

حالی کی کتاب ''یادگارِ غالب'' پر ایک نظر

اصنافِ ادب میں سوانح نگاری کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے ذریعے بڑی بڑی شخصیات کے حوالے سے ذاتی معلومات تک رسائی ممکن ہوتی ہے اور ان شخصیات کی خوبیوں اور خامیوں کا ادراک ہوتا ہے۔ ۱۸۸۶ء سے پہلے سوانح نگاری کا باقاعدہ رواج اور مسلمہ روایت موجود نہیں تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے آپ کو جب باقاعدہ طور پر قومی خدمت کے لیے وقف کرنے کا عزم کیا تو ان کے ذہن میں بعض ایسی شخصیات کے حالاتِ زندگی رقم کرنے کا خیال آیا جو قومی سطح پر قابلِ عزت و تکریم سمجھی جاتی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان شخصیات کے احوال اور کارنامے پڑھ کر قوم اور معاشرے میں مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تین شخصیات کا انتخاب کیا جن میں سے ایک اپنے وقت کے عظیم شاعر اور دو مصلح قوم کی حیثیت رکھتی تھیں۔ حالی نے سب سے پہلے عجم کے عظیم دانشور شیخ سعدی پر قلم اٹھایا اور ''حیات سعدی'' کے نام سے ان کی سوانح عمری تحریر کی۔ سوانح عمری پر مشتمل یہ مولانا حالؔی کی پہلی کاوش تھی اور یہ پہلی کاوش جو ۱۸۸۶ء میں منظرِ عام پر آئی قصرِ اردو سوانح نگاری کی پہلی اینٹ بھی ثابت ہوئی کیونکہ اس سے پہلے یہ ایک صنف کی حیثیت سے متعارف نہیں ہو سکی تھی۔ گویا حیاتِ سعدی اردو کی پہلی سوانح عمری ہے بلکہ اب تک کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ ''حیات سعدی'' سے پہلے فارسی ادب میں بھی یہ صنف موجود نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوانح عمری بیک وقت تاریخ کی ایک شاخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی صنف بھی ہے کیونکہ یہ محض کسی کی تاریخ پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغل اور وفات تک محدود نہیں ہے بلکہ کسی فرد کے ظاہر و باطن، عادات و اطوار، اخلاق و معاشرت، وراثت، نفسیاتی کیفیت اور زندگی کے نشیب و فراز کی مکمل داستان ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

> ''ایک سوانح نگار کے لیے وہ تمام باتیں دلچسپی کا باعث ہیں جن سے شخصیت کی تعمیر اور ایک مکمل تصویر بنانے میں مدد ملے۔ اس میں سطحی واقعات اور ظاہری حالت بیان کر دینے سے زیادہ باطنی کیفیت، نفسیاتی حالت، ذہنی ارتقا، رجحانات اور خوبیاں و

> کمزوریاں دکھانا مقصود ہوتا ہے تا کہ ایک واضح تصور ابھر کر سامنے آ سکے''۔ (۱)

اور یہ واضح تصور ہی ایک ایسی تصویر میں ڈھلتا ہے جو مطالعہ کرنے والے کی شخصی رہنمائی کا فریضہ ادا کر سکتی ہے۔ مولانا حالی نے اسی خیال کے پیشِ نظر قومی شخصیات کی سوانح عمری لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے ان کے دل کا درد اور قومی ہمدردی کا جذبہ جھلکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''حالی نے سوانح عمریاں لکھیں تو قومی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان شخصیات کا انتخاب کیا جن کے حالات وکوائف قوم کے لیے باعثِ افادہ ہو سکتے تھے''۔ (۲)

حیاتِ سعدی کے بعد انہوں نے دو اور سوانح عمریاں لکھیں۔ ایک اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کے حالات وکوائف پر مبنی تھی جسے ''یادگارِ غالب'' کا نام دیا گیا۔ دوسری حیات جاوید کے نام سے مصلحِ قوم سرسید احمد خاں کے حوالے سے تھی۔ ''یادگار غالب'' اپنی طرز کی منفرد سوانح عمری ہے۔ غالب کے ساتھ حالی کو دلی عقیدت تھی۔ اس سوانح عمری میں ان کی یہ عقیدت جگہ جگہ جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ حالی ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء (غالب کی وفات) تک مرزا غالب کے ساتھ وابستہ رہے۔ پانی پت سے دلی آنے کے بعد وہ اکثر و بیشتر ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ حالی نواب آف جہانگیر آباد مصطفٰے خان شیفتہ کے پاس ملازم تھے جو انہیں ملازم سے زیادہ ایک علمی دوست کی حیثیت دیتے تھے۔ شیفتہ خود بھی غالب کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور غالب کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے تھے۔ ایسے مواقع پر وہ حالی کو ساتھ رکھتے۔ غالب حالی کی علمیت اور ان کے انکسار کی وجہ سے بہت عزت دیتے تھے۔ اس حوالے سے اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> ''غالب کے دل پر حالی کی شخصیت کا گہرا اثر تھا اور وہ ان کو نیک نفس، صالح، دیندار اور باعمل انسان سمجھتے تھے۔ غالب کے تمام شاگردوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ درجہ حاصل نہیں تھا کہ اس کی غالب کے دل میں اتنی وقعت اور عزت ہو، جتنی حالی کی تھی۔'' (۳)

حالی کے دل میں بھی اپنے استاد کا بہت زیادہ احترام تھا۔ ''یادگار غالب'' لکھ کر انہوں نے حق شاگردی ادا کیا مگر اس حقِ شاگردی نے ایک ایسی صنفِ سخن کو بھی فروغ دیا جس کے موجد وہ خود تھے اور آگے چل کر ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے آج تک قائم ودائم ہے۔ ''مرزا غالب'' کے بارے میں حالات و واقعات لکھتے ہوئے حالی نے بہر حال اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے کہ وہ اپنے استاد کے بارے میں رقم طراز ہیں لہٰذا احترام اور عقیدت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اسماعیل پانی پتی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> ”حالی کی عقیدت و ارادت اور محبت و الفت غالب سے ان کے انتقال اور ان کے مرثیے تک ختم نہیں ہو گئی بلکہ انہوں نے لگا تار محنت اور مسلسل سعی و تلاش کے بعد اپنے استاد کی جو سوانح حیات ”یادگارِ غالب“ کے نام سے ۱۸۹۷ء میں لکھی وہ درحقیقت ان کی ابدی یادگار ہے اور جب تک اردو زبان قائم ہے اور جب تک غالب کو جاننے والے لوگ موجود رہیں گے اس وقت تک یادگارِ غالب بھی زندہ رہے گی“۔ (۴)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالی نے ”یادگارِ غالب“ لکھ کر جہاں سوانح عمری کے فن کو آگے بڑھایا وہاں علم و ادب کے ایک نئے شعبے کا آغاز بھی کیا جس کی وجہ سے تحقیق و تنقید کے ہزاروں باب وا ہو گئے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ”یادگارِ غالب غالبیات کے طویل سلسلے کی پہلی کڑی ہی نہیں تھی بلکہ غالب کی عادات و خصائل کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان کے بعض اشعار کی تشریح اور خطوط نگاری کے سلسلے میں کارآمد معلومات بھی بہم پہنچاتی ہے“۔ (۵)

مولانا حالی نے ”یادگارِ غالب“ لکھ کر ”غالبیات“ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد اس حوالے سے جتنی بھی تحقیق ہوئی اس کے لیے یہ کتاب بنیادی حوالہ ثابت ہوئی۔ گویا یہ کتاب قصرِ غالبیات کی کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کے لفظ لفظ سے حالی کی نیک نیتی ٹپکتی ہے اور اس کے پس منظر میں حالی کا دردمند دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس دل میں موجود جو درد تھا اس کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ”یادگارِ غالب سب کچھ ہونے کے باوجود مرزا کی ظرافت اور خوش دلی کی تفصیل بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ مرزا کی زندگی کے بعض معمے حل ناشدہ رہ گئے ہیں۔ حالی نے یادگار اس لیے لکھی کہ اس کے ذریعے قوم میں زندہ دلی پیدا کی جائے گویا اس سوانح عمری کا مقصد فنی سے زیادہ قومی ہے“۔ (۶)

”یادگارِ غالب“ کے حوالے سے مختلف محققین اور ناقدین نے اپنے اپنے انداز میں تنقید اور تبصرے لکھے ہیں۔ کتاب کا سببِ تصنیف سب کے خیال میں مختلف ہے۔ عموماً یہ سمجھا گیا کہ حالی نے محض اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالی کی عقیدت اپنی جگہ موجود ہے اور اس کتاب کے ہر صفحے میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ تاہم کتاب کا سببِ تصنیف حالی نے خود بھی بیان کیا ہے:

> ’’اگر چہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دار الخلافے کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اردو نظم ونثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں۔ اس سے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا ہے کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور ان کی شاعری اور انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آ سکیں اور آ بنائے زمان کی فہم سے بالاتر نہ ہوں ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلم بند کر دوں‘‘۔(۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کی شاعری اور انشا پردازی کے حوالے سے یادگار غالب میں تعریف وتوصیف کا حق ادا کر دیا گیا ہے مگر جہاں تک غالب کے ذاتی حالات وواقعات کا تعلق ہے وہ حالی کے اپنے خاص سلیقے کے باعث کچھ عجیب رنگ میں پیش ہوئے ہیں۔ کتاب کا وہ حصہ جو غالب کے حالاتِ زندگی، ان کے اخلاق وعادات اور خیالات پر مبنی ہے اس حصے کا مطالعہ کسی حد تک غالب کی شخصیت سے مایوس کرنے کا سبب بنتا ہے اور ویسے بھی نامکمل اور تشنہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انہیں اس حوالے سے خاطر خواہ معلومات کا حصول نہ ہو سکا کیونکہ ان کا زیادہ تعلق غالب سے ان کی عمر کے آخری حصے میں رہا۔ غالب کی جوانی، لڑکپن وغیرہ کے واقعات پر وہ زیادہ روشنی نہیں ڈال سکے۔ ایک سوانح نگار اس وقت تک سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک وہ کسی شخصیت سے مسلسل وابستہ نہ رہا ہو۔ ایک حقیقی سوانح نگار کا منصب یہ ہے کہ وہ عقیدت اور ارادت کے جذبات ایک طرف رکھ دے اور بالکل غیر جانبدار ہو کر حالات وواقعات کو تحریر کرے۔ اس کا یہ کام ہرگز نہیں کہ وہ کسی شخصیت کے گناہوں اور عیوب کی پردہ پوشی بھی کرے اور ان کا جواز بھی گھڑ کر پیش کرے۔ ’’یادگار غالب‘‘ میں حالی نے جس سلیقے کا ذکر کیا تھا اس کی وجہ سے صورتِ حال کچھ ایسی ہی دکھائی دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

> ’’حالاتِ زندگی اور اخلاق وعادات کا ایک بڑا حصہ حالی کے ذوق عیب پوشی کی نذر ہو گیا۔ انہوں نے غالب کے حالاتِ زندگی پیش کرتے وقت ایک سوانح نگار سے زیادہ ایک سعادت مند شاگرد کے فرائض انجام دیئے اور ان کی سیرت کے ناپسندیدہ پہلوؤں کو یا تو یکسر نظر انداز کر گئے یا انہیں بادل ناخواستہ پیش کیا ہے تو ان کی توجیہات

بھی پیش کردی ہیں''۔ (۸)

جہاں جہاں غالب کی کسی کمزوری کا ذکر ہے وہاں وکالت بھی ساتھ ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح ایک جانبداری مسلسل ساتھ ساتھ چل رہی ہے جو سوانح نگاری کے بنیادی اصول کے خلاف ہے، مثال کے طور پر وہ غالب کے عادات و اخلاق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی موجانجھ میں داروغہ کو بُرا بھلا کہتے تھے مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے''۔ (۹)

اس طرح کی بے شمار مثالیں ''یادگار غالب'' میں ملتی ہیں۔ غالب کے شراب نوشی کرنے کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جیسے وہ اس حرام شے کو حلال بنا کر پیتے تھے۔ روزہ نہ رکھنے، نماز نہ پڑھنے، جوا کھیلنے اور اس طرح کے گناہوں اور عیوب کا ذکر بھی اس انداز سے ہوا ہے کہ گویا وہ غالب کے لیے جائز تھے۔ بہر حال کتاب کا یہ حصہ خاصا کمزور ہے اور سوانح نگاری کے بنیادی اصولوں اور تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ البتہ دوسرا حصہ جس میں غالب کے کلام کے بعض حصوں کی شرح بیان کی گئی ہے بہت جاندار ہے۔ اس سے مشتاقانِ شاعری اور غالب شناسی کی طرف گامزن اہل علم کی رہنمائی کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس حصے کو پہلے حصے سے الگ رکھا جانا چاہیے تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کتاب کے صفحات بڑھانے کے لیے دو حصے اکٹھے کیے گئے ہیں، اصل میں سوانح عمری الگ اور شرحِ اشعار الگ کتاب کی صورت میں ہونی چاہیے تھی۔ آخر میں ڈاکٹر یونس حسنی کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے ان کے مضمون سے ایک اقتباس:

> ''اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ''یادگار غالب'' اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تذکرہ نگاری کی درمیانی کڑی نہیں بلکہ اردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کے اولین نمونوں میں سے ہے۔ مشرقی روایات کے پروردہ ایک سنجیدہ، متین منکسر المزاج انسان اور ایک سعادت مند شاگرد سے اس سے زیادہ

کی توقع رکھنا مناسب نہیں۔ ''یادگار غالب'' کی عظمت اس کے مصنف کی معذوریوں کو پیش نظر رکھ کر ہی معلوم کی جا سکتی ہے اور اولیت کا سہرا تو بہر حال ان کے سر بندھتا ہی ہے''۔ (۱۰)

حوالہ جات

۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۵۔
۲۔ سلیم اختر ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۹۔
۳۔ اسماعیل پانی پتی، شیخ محمد، غالب اور حالی کے تعلقات، مضمون مشمولہ مجلّہ صحیفہ، لاہور جنور ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۔
۴۔ ایضاً، ص ۱۸۔
۵۔ سلیم اختر ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۹۔
۶۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء، ص ۲۶۱۔
۷۔ حالی، الطاف حسین، یادگار غالب، کشمیر کتاب گھر، لاہور س۔ن، ص ۷۔
۸۔ یونس حسنی، ڈاکٹر، کاوشیں، فرہنگ میرپور خاص طبع دوم ۲۰۰۳ء، ص ۴۹۔
۹۔ حالی، الطاف حسین، یادگار غالب، کشمیر کتاب گھر، لاہور س۔ن، ص ۷۶۔
۱۰۔ یونس حسنی، ڈاکٹر، کاوشیں، فرہنگ میرپور خاص، طبع دوم، ص ۵۱۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

حالی کا ابتدائی نثری اسلوب

اردو نثر کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ فضلی کی مجلس یا خواجہ گیسو دراز کی ”معراج العاشقین“ سے رجب علی بیگ کے فسانۂ عجائب تک نثر اس انداز سے لکھی گئی کہ وہ نظم سے بھی مشکل محسوس ہوتی تھی۔ نثر لکھتے ہوئے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ جملے مقفّیٰ و مسجع ہوں اور اس میں تمام تر شاعرانہ نزاکتیں برتی جائیں۔ اس طرح یہ نثر بھی شاعری کا عمدہ نمونہ بن جاتی تھی۔ پہلی مرتبہ دلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے نثر کے روایتی انداز سے انحراف کی کوشش کی اور اپنے رسالے ”محبِّ ہند“(۱) میں شائع ہونے والے مضامین کی زبان کو آسان اور سادہ بنانے کی جسارت کی۔ اسی دور میں مرزا اسداللہ خان غالب نے خطوط کے ذریعے جدید نثر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ غالب نے خطوط کو مکالماتی انداز دے کر نہ صرف خطوط نویسی کو ایک باقاعدہ صنفِ سخن بنا دیا بلکہ اردو نثر میں روانی، شستہ پن اور سادگی جیسے اوصاف پیدا کیے۔ سرسید احمد خان جو اس دور میں اصلاحی مضامین کے ذریعے قومی خدمت کو شعار بنائے ہوئے تھے غالب کے نئے طرز تحریر سے متاثر ہوئے اور اپنا اسلوب بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی تصنیف ”آثار الصنادید“ کا دوسرا ایڈیشن پہلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔ پہلے ایڈیشن کی زبان انتہائی پرتکلف اور مصنوعی محسوس ہوتی ہے جبکہ دوسرے ایڈیشن میں یہ تصنع اور تکلف نظر نہیں آتا۔ دراصل سرسید سمیت تمام نثر نگار اپنے کسی بھی مضمون، کہانی، خط یا داستان کو اپنی علمیت کے اظہار کا ذریعہ بناتے اور تکلفات کو تحریر کا حسن سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان لوازمات سے تحریر الجھ کر رہ گئی اور نثر مشکل اور پیچیدہ ہوتی گئی۔ سرسید نے پیرویٔ غالب میں اپنے رسالے ”تہذیب الاخلاق“ کے مضامین کی زبان اور بیان پر توجہ دی۔ اس رسالے کے اہم لکھاریوں میں محسن الملک، سید محمود، مولانا حالی، چراغ علی اور مولوی ذکااللہ وغیرہ شامل تھے۔ جنہوں نے سادہ اور بے تکلف نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں تو علی گڑھ تحریک کے عناصرِ خمسہ (سرسید، شبلی، نذیر احمد، آزاد اور حالی) سب کے سب ایک مقصدِ ادب لے کر مصروفِ عمل ہوئے تھے یعنی اصلاحِ قوم بذریعہ ادب اور ان سب نے نثر اور نظم دونوں کا سہارا لیا۔ محمد حسین آزاد کے مضامین اپنی جگہ پر ادب کی چاشنی اور شوکت الفاظ رکھتے ہیں مگر سادگی اور آسان

زبان نہ ہونے کے باعث ان کی تفہیم عوام کے لیے قدرے مشکل ہے اور وہ مخاطب بھی عوام سے نہیں ہیں، جبکہ سرسید، حالی، نذیر اور شبلی کی تحریریں خواص کے لیے عموماً اور عوام کے لیے خصوصاً قابلِ توجہ تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ زبان میں اگر وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی صورت پیدا نہ ہو تو وہ زبان یکسانیت کا شکار ہو کر جامد ہو جاتی ہے۔ صرف وہی زبان زندہ رہتی ہے جو زمانے کے تقاضوں اور زندگی کی ضروریات کے ساتھ مائل بہ تبدل ہوتی ہے۔ مولانا حالی اس لحاظ سے بہت زیرک واقع ہوئے تھے کہ انہیں اس امر کا شدت سے احساس تھا۔ اگرچہ ان کے شعور میں اس امر کا موجود ہونا بھی غالب ہی کی طرف سے ایک تحفہ تھا۔ تاہم یہی احساس سرسید کی کامیابی کا بھی راز بنا۔

مولانا حالی کی تمام تر نثری کاوشوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حالی کی ابتدائی نثر قدیم اور روایتی رنگ رکھتی ہے۔ ان کا ابتدائی نثری سرمایہ زیادہ تر مذہبی رسائل ہیں جن میں جذباتیت کے ساتھ ساتھ واعظانہ اسلوب ہے اور مناظرے کی صورت بھی پائی جاتی ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق مولانا حالی کی پہلی نثری تصنیف ”مولود شریف“ ہے۔ یہ ایک کتابچہ ہے جو ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ورطۂ تحریر میں آیا۔ البتہ اس کتاب کو زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کے لیے تقریباً ۶۲/۶۳ سال تک انتظار کرنا پڑا۔ (۲) یہ مختصر کتاب روایتی زبان اور روایتی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر ولادتِ محمدؐ کے وقت ظہور پذیر ہونے والے معجزات کا ذکر ہے۔ اس کی زبان کا اندازہ لگانے کے لیے یہ چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

> ”ہاں اے امتِ محمدؐ! یہ فخر کرنے کا مقام ہے۔ جو شرف آج تم کو حاصل ہے تم سے پہلے کسی کو ملا ہے تو بتا دو۔ اللہ جل شانہٗ نے تم کو خیر امم فرمایا، تمہارے دین کو کامل کیا، تم پر اپنی نعمت تمام کی اور امتوں پر وہ فضیلت دی جو اس کی ذات کو تمام مخلوقات پر ہے۔ موسیٰؑ کو تمہارے دیدار کا مشتاق کیا اور جب تمہارے دیکھنے کی آس نہ رہی تو تمہاری خواہشِ ناشی کی آرزو دل میں ڈالی“۔ (۳)

یہ کتاب ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نثر میں قدیم فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ بیان کو مؤثر بنانے کے لیے تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جذباتی کیفیت اور عقیدت مندی کا غلبہ ہے۔

نثر کی دوسری کتاب ”تریاقِ مسموم“ کے نام سے ہے جو ایک عیسائی پادری عماد الدین کی لکھی ہوئی کتاب ”ہدایت المسلمین“ (۴) کے جواب میں ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور قرآن کی حقانیت دلائل سے

ثابت کی گئی ہے۔ تاہم کتاب کا اسلوب نگارش اردو کی قدیم نثر سے قریب ہے۔ اس میں واقعات میں غیر ضروری طوالت نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ جذباتیت بھی غالب ہے۔

پہلے باب میں سوالات قائم کیے گئے ہیں اور باقی ابواب میں ان کے جوابات دلائل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں مناظرے کی کیفیت ہے۔ واقعات اور جملوں کی تکرار بھی پائی جاتی ہے تاہم ڈاکٹر عبدالقیوم نے اس کتاب کے حوالے سے اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:

> ''مولانا حالی نے زمانے کے رواج کے مطابق مناظرے کا رنگ اختیار کیا ہے مگر ان کی تحریر میں جوش وخروش اور غم وغصہ کا اظہار نہیں بلکہ استدلالی رنگ غالب رہا اور معقولیت اور تہذیب کا رنگ کہیں پھیکا نہیں پڑنے پایا''۔ (۵)

حالی کی تیسری نثری کتاب توقع سے بالکل مختلف سائنسی موضوع پر ہے۔ اس کا نام ''مبادی علم جیالوجی'' (۶) ہے۔ ترجمے پر مبنی یہ کتاب انہوں نے قیام لاہور کے دوران میں مکمل کی۔ اس طرح اس کا سنِ اشاعت ۱۸۷۲ء (۷) بنتا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں علم جیالوجی کی تعریف وتشریح کی گئی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ حالی نے اگرچہ نثر پرانی طرز کی لکھی ہے مگر جدید معلومات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ایک طالب علم اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ زمین کی تاریخ، زمین کا آغاز (پیدائش) بھی دلائل سے بتایا گیا ہے، دنیا کی حقیقت اور انسانی وجود پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کا وجود زمین پر بہت زیادہ مدت سے نہیں ہے اور زمین پر کسی بھی چیز کا وجود ازلی نہیں ہے۔ کتاب کا ماحول مکمل طور پر فرانسیسی ہے۔ فرانس کے پہاڑ، شہر، دریا وغیرہ جا بجا نظر آتے ہیں۔

حالی کی چوتھی کتاب اصولِ فارسی کے نام سے ہے جو فارسی زبان کے طلبہ وطالبات کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھی مگر یہ کتاب مکمل ہوئی نہ شائع ہو سکی۔ (۸) اس میں زبان کے اصول وقواعد درج ہیں۔ اس کتاب کی زبان بہت پرانے انداز کی ہے۔ مثال کے طور پر پوری کتاب میں ''نون غنہ'' کا استعمال نہیں ہوا یعنی ہیں کو ہن، کتابوں کو کتابون، نہیں کو نہین وغیرہ لکھا گیا ہے۔ گ کو ہر جگہ ''ک'' لکھا ہے۔ ان، اس وغیرہ کو اون، اوس وغیرہ لکھا ہے۔ پوری کتاب میں ہائے دوچشمی بھی نہیں ہے۔ ہائے مجہول بھی کہیں نہیں مثلاً ''نے'' کو ''نی'' اور ''سے'' کو ''سی'' لکھا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب زبان کے اعتبار سے غیر مانوس انداز پر مشتمل ہے۔ پانچویں کتاب ''پادری عمادالدین کی تاریخِ محمدیؐ پر منصفانہ رائے'' ہے۔ یہ کتاب بھی مرتد عمادالدین کی ایک ناپاک جسارت کے جواب میں تحریر کی گئی۔ اس کا سنِ اشاعت بھی ۱۸۷۲ء (۹) ہے۔ مرتد پادری

عمادالدین نے سرورِ کائناتؐ کے حوالے سے ”تحقیق الایمان“ کے نام سے دو سال قبل بھی ناپاک جسارت کی تھی جس کا جواب مولانا حالی نے ”تریاقِ مسموم“ نامی کتاب کے ذریعے دیا تھا۔ مگر اس ناپاک پادری کی ناپاک جسارتوں میں کمی نہیں آئی۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں مزید دلائل دیئے ہیں۔ پادری کا مقصد چونکہ محض شرانگیزی تھا اس لیے اس نے من گھڑت حوالے اور غیر مصدقہ باتیں درج کیں۔ مولانا نے ایک ایک بات کو دلیل سے رد کیا۔ تاہم زبان ابھی تک جدت آشنا نہیں ہوئی اور الفاظ و تراکیب سے قدامت جھلکتی ہے۔ مجموعی طور پر کتاب استدلال کا رنگ رکھتی ہے۔ نمونے کی چند سطور دیکھیے:

> ”کیا یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ جس شخص نے اس نہایت ناپسند اور حقیر بت پرستی کے بدلے جس میں اس کے ہم وطن مدت سے ڈوبے ہوئے تھے خدائے واحد برحق کی پرستش قائم کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں کیں“۔ (۹)

اسی طرح کے جملے کتاب میں ملتے ہیں تاہم یہ ایک قابل قدر تصنیف ہے۔

مولانا حالی کی چھٹی نثری کتاب ایک بہت ہی مختصر رسالہ ہے۔ اس رسالے کی ضخامت اتنی کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا صرف ایک حصہ ہی دستیاب ہو سکا ہے۔ کتاب کا نام ”شواہد الالہام“ ہے تاہم جو حصہ دستیاب ہوا۔ یہ ایک مضمون بعنوان ”الہام کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت“ جو کتاب کا آخری حصہ تھا۔ یہ صرف ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس رسالے میں ادب اور ادبی چاشنی وغیرہ نہیں ہے البتہ مذہبی دلائل بہت مضبوط ہیں۔ اس کے بعد مولانا حالی نے اپنے طور پر ایک ناول لکھنے کی سعی کی۔ تاہم یہ کتاب ناول تو نہ بن سکی مگر خواتین کے لیے ایک اصلاحی اور اخلاقی درس پارہ بن گئی۔ اس دور میں خواتین کے لیے اصلاحی کتابیں لکھنے کا رواج موجود تھا۔ نذیر احمد کی ”مراۃ العروس“ اور ”بنات النعش“ چھپ کر مقبول ہو چکی تھیں۔ خواتین کے خیالات، جذبات، توہمات اور ان کی معاشرت کے حوالے سے دیگر بہت سے ادیب لکھ رہے تھے۔ اس عالم میں حالی نے ”مجالس النسا“ کے نام سے تصنیف کی جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ البتہ یہ کتاب حالی کی ابتدائی نثری تصانیف میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ خواتین کے لیے خاص اہمیت کے سبب انگریزی حکام تعلیم نے اس کتاب کو زنانہ مدارس کے نصاب میں بھی شامل کر دیا تھا۔ اس کے لیے اس کتاب پر حالی کو ۴۰۰ روپے انعام سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے مطابق اس انعام کے لیے ڈائریکٹر تعلیم کارڈی کی سفارش تھی جو لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے حالی نے وصول کیا۔ (۱۰) اس کتاب میں بچوں کی تربیت سے متعلق متاثر کن پیرائے

میں بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بچیوں اور خواتین کے طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے مذہبی اور اخلاقی طور طریقے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسلمان خاندانوں میں بچیوں کی پیدائش پر جو اظہارِ غم کیا جاتا ہے اسے بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اوہام اور ضعیف الاعتقادی سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ علی عباس حسینی نے مولانا کے طرزِ تحریر اور اس کی خوبیوں کا مختلف انداز میں ذکر کیا ہے:

> ''حالی اپنے ضبط و اعتدال، اخلاقی اقدار، فطری انداز، نفسیاتی رسائی، سلاستِ زبان، اسلوب کی سادگی، بے تکلف بول چال، فطری اور منطقی انجام، نرمی، شیرینی، تناسبِ امثال اور نیک جذبے کے باوجود قصہ گویوں اور ناول نویسوں کے دربار میں کرسیِ زرنگار کے مستحق نہیں۔ غالباً اس ایوان میں باقاعدہ داخلہ وہ اپنے لیے باعثِ افتخار بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا محبوب مقصد اصلاحِ قوم، اصلاح شاعری، اصلاحِ تعلیم و تربیت تھا نہ کہ قصہ گوئی و داستان سرائی''۔ (۱۱)

مولانا حالی نے ''تذکرہ رحمانیہ'' کے نام سے اپنے استاد قاری عبدالرحمٰن کے حالاتِ زندگی پر مبنی ایک مختصر کتاب تحریر کی۔ قاری عبدالرحمٰن ایک نیک سیرت اور عالم شخصیت تھے۔ وہ دینی دنیوی اور روحانی حوالوں سے معتبر اور معزز تھے۔ اس کتاب میں سوانح نگاری کا رائج انداز اگرچہ اختیار نہیں کیا گیا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سوانح نگاری کا ابتدائی سنگِ میل یہی کتاب تھی جس نے آگے چل کر مولانا حالی کو اردو کے اولین سوانح نگاروں میں سب سے آگے کھڑا کیا اور ان سے ''یادگارِ غالب''، ''حیات جاوید'' اور ''حیاتِ سعدی'' جیسی سوانح عمریاں تصنیف کروائیں۔ (۱۲)

الغرض اس مضمون میں حالی کی جن ابتدائی نثری تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے وہ حالی کے رجحان، مزاج اور افتادِ طبع کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان کے آئینے میں ایک مصلح قوم اور اردو ادب میں انقلاب پیدا کرنے والے نثر نگار کی جھلک بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔

حواشی/حوالے

۱۔ اردو کا پہلا علمی ادبی جریدہ جو ۱۸۴۲ء میں ماسٹر رام چندر کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوا۔

۲۔ ۱۹۳۲ء میں یہ کتاب مولانا حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسن نے اپنے مقدمے کے ساتھ میلاد شریف کے نام سے حالی پریس پانی پت سے شائع کی۔

۳۔ حالی، الطاف حسین، میلاد شریف حالی پریس پانی پت ۱۹۳۲ء، ص ۵۔

۴۔ عیسائی پادری عماد الدین (مرتد) نے ہدایت المسلمین نامی کتاب میں اسلام اور قرآن پاک پر اعتراضات کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی جس کے جواب میں مولانا حالی نے تریاق مسموم کے نام سے مدلل کتاب لکھی۔

۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۶۸۔

۶۔ یہ کتاب فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی اور بعد میں مولانا حالی نے اسے اردو میں منتقل کیا۔

۷۔ غلام مصطفٰے خان، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء مشمولہ رسالہ اردو، کراچی ۱۹۶۲ء، ص ۱۸۔

۸۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے اس کے ابتدائی صفحات اور فہرست وغیرہ رسالہ نقوش لاہور شمارہ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء میں شائع کی۔ اس کے علاوہ کہیں بھی دستیاب نہیں۔

۹۔ غلام مصطفٰے خان، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء مشمولہ رسالہ اردو، کراچی ۱۹۶۲ء، ص ۱۹۔

۱۰۔ حالی، الطاف حسین ''پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے''، ص ۲۳۔

۱۱۔ غلام مصطفٰے خان، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء مشمولہ رسالہ اردو، کراچی ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۔

۱۲۔ حسینی علی عباس، مجالس النساء، فروغ اردو (حالی نمبر) لکھنؤ، ص ۳۴۴۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر صلاح الدین درویش

حالیؔ کا نظریۂ سماجی تبدیلی

سرسید احمد خان کے دوستوں اور علی گڑھ تحریک کے ساتھیوں میں جو مقام و مرتبہ مولانا الطاف حسین حالیؔ کو حاصل ہے وہ کسی اور کے نصیب میں نہیں ہے۔ حالاں کہ سرسید کے ساتھیوں میں حالیؔ سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے، دانش مند اور علمائے کرام موجود تھے۔ حالیؔ شاید ان میں سے واحد ایسے شخص تھے کہ جنھوں نے سرسید کے پیغام کی نوعیت اور ہمہ گیریت کو نہ صرف سمجھا بلکہ اُسے عملی سطح پر اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ سرسید کے ذہنِ رسا میں یہ بات آچکی تھی کہ غدر کے بعد ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کی بچت کا اگر کوئی راستہ ہےتو وہ یہی ہے کہ انگریزوں کے ساتھ مخاصمت کی بجائے دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ علومِ جدیدہ کی بدولت جس تمدنِ جدید میں اُن کی تربیت و تہذیب ہوئی ہے، وہ اس بات پر قادر ہیں کہ اگر چاہیں تو کندن کو راکھ کی ڈھیری میں بدل دیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں اتنی اہلیت، لیاقت اور صلاحیت کہاں تھی کہ وہ انگریزوں کی مخالفت کا خطرہ مول لے سکیں۔ سرسید کی تحریک کی کچھ ہی عرصہ میں پذیرائی کا آغاز اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان ذہنی طور پر نئے اور آنے والے ہر حوالے سے برتر حکمرانوں سے نباہ کے لیے آمادہ ہیں۔ اطراف میں سرسید اور اُن کے رفقا کے خلاف جو شور اُٹھا اُن میں کوئی بھی سنجیدہ آواز نہیں تھی اور مذہب کی جس آڑ میں سرسید کی مخالفت کی گئی خود سرسید نے اُسی مذہب کو اپنے زیادہ تر افکار و خیالات کے اظہار کا بامعنی وسیلہ بنانے کی کوشش کی۔ دہریے، نیچری، بدھ مذہب اور کرسٹان کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن جس لائن آف ایکشن پر سرسید چلے، وہ ایسی تھی کہ جس پر عمل درآمد مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن ہرگز نہیں تھا۔ مخالفین کے پاس تمام نظریاتی ہتھیار ایسے تھے کہ جن کے استعمال کا دور گزر چکا تھا اور سرسید نے جس ہمہ جہت پروگرام کو وضع کیا تھا اُس کے پیشِ نظر معروضی حالات میں ضروری ہوگیا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ علومِ جدید کی تحصیل وقت کی پکار تھی، لوگ خود بخود اس جانب بڑھتے چلے گئے۔ اپنی تہذیب و معاشرت، طرزِ تمدن اور علوم و فنون کے مقابلے میں انگریز اپنے ساتھ جن نئے قوانین، علوم و فنون اور تصورات کو لے کر آئے تھے اُن کے سامنے سرسید خود ایک عظیم سوال بن کر کھڑے ہو گئے اور پھر اس کا جواب بھی اپنی تحریک کے مقاصد کی روشنی میں بھرپور انداز میں دیا۔ اپنے ہم راہ ایسی زبردست جماعت تیار کی کہ جس نے

مغرب سے مرعوب ہونے کی بجائے اُس کے ساتھ چلنے میں افتخار جانا۔ اسی حوالے سے حالؔی کی حیرت اور خوشی دیدنی ہے:

> یہ کچھ تعجب انگیز بات نہیں کہ جو قوم بیس پچیس سال پہلے انگریزی تعلیم کو برہم زنِ دین و مذہب خیال کرتی تھی، اُس کی اشاعت کے لیے چندہ دینے کو گناہ ومعصیت جانتی تھی اور اُس کے حامیوں کو کافر وملحد قرار دیتی تھی، اُسی قوم میں ایک باوقار جماعت ایسی پیدا ہو جائے جو انگریزی تعلیم کے لیے یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ (۱)

حالؔی نے اپنی تمام تقاریر، مضامین اور تحریروں میں سرسید کے پیغام کو گویا عملی سطح پر اُستوار کرنے کی سعی کی۔ حالؔی کا یہ واضح اور دوٹوک نقطۂ نظر تھا کہ تبدیلی کے لیے گورنمنٹ یا اشرافیہ کے لطف وعنایت کی طرف نگاہ جمائے رکھنا بے کار اور بے سود ہے۔ اگر ایسا مناسب اور درست ہوتا تو آج ہندوستان اس حالت کو نہ پہنچتا جس حالت پر وہ آج ہے۔ مدرسے، شفا خانے قائم کرنا یا کنوئیں کھدوا دینا امراء کی مرضی اور مصلحت کے تابع رہے تو پھر قوم کو خود اپنے تردد سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے ہیں۔ غربت، پس ماندگی اور جہالت سے نکلنا چند شخصیات کی نیک طبع کی موجودگی سے مشروط نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عوام الناس کو اجتماعی سطح پر اپنے معاملات کا فہم حاصل کرنا پڑتا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اجتماعی کوششوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ اُن کے خیال میں بادشاہی اور نوابی بندوبست میں عوام کی ذہنی، فکری اور عملی صلاحیتوں کو گھن لگا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد بھی وہ سب حکومت کی جانب سے مناسب اقدامات اور اصلاحِ احوال کے منتظر رہتے ہیں۔ ذہنی صلاحیتوں کو دوچند کرنے اور اُس کے عملی اظہار کے لیے جو آزادی انگریزی انتظام میں میسر ہے، لوگ اُس سے فائدہ اٹھانے کا شعور نہیں رکھتے۔ حالؔی چاہتے تھے کہ لوگ اپنے تعلیمی اور سماجی مسائل سے متعلق اُن کے حل کے لیے اشتراک وتعاون کی فضا خود پیدا کریں اور حکومت کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی جملہ ذمہ داریوں کو خود اُٹھانے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کریں:

> ہم اپنی تعلیم وتربیت کا تمام سامان بغیر مداخلت گورنمنٹ کے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر طرح کی سوشل اصلاحیں بغیر گورنمنٹ کی دست اندازی کے کر سکتے ہیں، مگر ایشیا کی خودمختاری جو ہزار سال مل کر یوں کہنا چاہیے کہ ابتدائے آفرینش سے ایک حالت پر چلی آتی تھی اور جس نے ایشیا کی تمام قوموں کو بے حس وحرکت کر دیا تھا اُس کے اثرات ابھی تک ہماری رگوں اور پٹھوں میں موجود ہیں۔ اس لیے ہم آزادی کی نعمت سے جو گورنمنٹ نے ہم کو بخشی ہے موجودہ حالت میں فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ (۲)

حالؔی مغربی تہذیب وتمدن پر مرمٹے تھے تو یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اپنی موجودہ حالت کا موازنہ جب وہ یورپ سے کرتے تو اُن کے پاس کوئی چارہ کار نہ رہ جاتا تھا کہ سماج میں تبدیلی کے لیے یورپ کو بطور ماڈل اپنانے میں تامل کرتے۔ ہندوستان بھر میں کون ایسا عالی دماغ تھا کہ جس کے پاس انسانی وسماجی ترقی کا ماڈل یورپی ماڈل کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ہوتا!! یورپ دراصل انسانی ارادوں کے آزادانہ اظہار کا بہترین نمونہ تھا۔ اسی کے تحت وہاں کا انسان اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے خود اپنی ذمہ داری کے تحت مصروفِ عمل ہوا۔ تعلیم صحت، ملکی انتظام، انصاف اور دیگر رفاعی اداروں کا قیام مغربی تمدن کا نشانِ امتیاز بن گیا۔ حالؔی جانتے تھے کہ انگریزی تعلیم تو سرسید کی کوششوں اور معروضی ضرورتوں کے تحت ضرور پھیلتی جائے گی لیکن اصلاحِ معاشرت کہ جس کی بنیاد جدید طرزِ تمدن پر ہو ایک دشوارترین راستہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر پانی پت میں اُن کے نام سے ایک یادگار قائم کرنے کا معاملہ درپیش ہوا تو حالؔی کی تجویز پر یادگاری بجائے "وکٹوریہ میموریل لائبریری" کا قیام عمل میں آیا۔ کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ مفادِ عامہ کا تعلق یادگاری عمارتوں کے ساتھ نہیں ہوتا بل کہ اُن عمارتوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ جن میں قوم کی فکری راہنمائی کو اولیت دی جائے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

> یورپ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں ایسا نہیں پایا جاتا کہ جس میں کم سے کم ایک دو کتب خانے موجود نہ ہوں۔ یہ کتب خانے لوگوں کے عام چندے سے قائم کیے جاتے ہیں اور بستی کا ہر باشندہ اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ ایسے کتب خانے کو پبلک لائبریری کہتے ہیں۔ یورپ میں جو ہمیشہ بڑے بڑے عالم اور مصنف، موجد اور صناع پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہاں کے تمام ملکوں میں علم کا جو دریا بہتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی پبلک لائبریریوں کے قیام کا صدقہ ہے۔ (۳)

حالؔی کو اس کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا کہ لوگ انگریزی سرکار کی مداخلتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے اندر احساسِ ذمہ داری خود پیدا کریں۔ اس حوالے سے یقیناً اُن کو انگریزوں کا احسان طبع پر ناگوار گزرنا چاہیے تھا چناں چہ وہ سرکاری ملازمتوں کے حصول کے بھی سخت مخالف تھے۔ مسلمان اشرافیہ کا شاہی درباروں میں نوکری پیشہ ہونا اُنھیں معیوب اس لیے لگا تھا کہ کوئی بھی ملازمت، ملازم کو ملازمت دینے والوں کے اصولوں اور احداف کا پابند بنادیتی ہے کہ جس کے باعث انسان کے آزادنہ ارادوں کو تقویت ملنے کی بجائے اُن کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ اس کی بجائے وہ تجارت، صنعت وحرفت اور کاشتکاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ آزادی نے ہمارے طوق اور زنجیریں کاٹ ڈالی ہیں اور ہماری مشکیں کھول ڈالی ہیں۔ مراد یہ تھی کہ

انگریزوں کی طرف سے اپنی بہترین صلاحیتیں شخصی اور اجتماعی سطح پر بروئے کار لانے کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ چناں چہ وہ ملازمت کی بجائے تجارت، صنعت وحرفت اور کاشتکاری کو ترجیح دینا زیادہ مناسب خیال کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ تمام پیشے عقلِ انسانی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نفع ونقصان کا اندیشہ ایسی تدبیر اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ جن کے باعث عقلی صلاحیتیں پھلتی پھولتی ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ تجارت اور کاشتکاری کو اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھنا مسلمانوں کے عقلی زوال کا بھی باعث بنا۔ اُن کے خیال میں یہ وہ پیشے ہیں جو کاری گروں کے ہنر کو تنوع دیتے ہیں۔ تجارت متحارب دشمنوں کو دوستی پر مائل کر دیتی ہے۔ علوم وفنون، مفید تحقیقاتوں اور ایجادوں کو فروغ ملتا ہے۔ سائنس دانوں اور ہنرمندوں کی طبیعت میں ایجاد واختراع کی تحریک بیدار ہوتی ہے۔ اُن کا یہ خیال بجا تھا کہ تجارت کے فروغ ہی کے باعث انگلستان ایک عظیم قوت کے طور پر دنیا میں حکمران بنا۔ حالؔی چاہتے تھے کہ تجارت، صنعت وحرفت اور کاشتکاری میں ترقی کے باعث جس طرح انگریزوں نے اپنی "عقلِ معاش" کو بڑھایا اور نتیجے میں انگلستان دنیا میں سرخرو ہوا، ہندوستان کے لوگ بھی اسی روش پر چلتے ہوئے اجتماعی سطح پر انگلستان کی طرح جدید معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جدید علوم وفنون کے فروغ اور صنعتوں کے قیام سے ایک نئی دنیا کا خواب حالؔی نے دیکھا تھا، کیا خوب کہتے ہیں:

> جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل گیا وہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ قومی زندگی کی بنا پڑ گئی۔ (۴)

تمدنِ جدید کی تعمیر وتشکیل حالؔی کے لیے گویا قومی زندگی اور قومی موت کا معاملہ تھا۔ اُن کے ذہن میں ہمہ وقت یہ کھٹکا سا لگا رہتا تھا کہ اگر اس میں دیر ہوئی تو مغربی اقوام کی برتری کا سکہ ایسا جم جائے گا کہ پھر صدیاں سر اُٹھانے کی جستجو میں لگ جائیں گے۔ وہ تمدنِ جدید کے قیام کو عینِ حیات سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے کتب "نظم الممالک" پر ریویو لکھتے ہوئے انھوں نے شیخ محمد بن عابد حنفی کا جو اقتباس نقل کیا ہے، وہ اس حوالے سے اُن کی اس خواہش کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے:

> بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ فرنگیوں کی باتوں کے اتباع سے انکار کرتے ہیں اور جو باتیں اُن کے حق میں مُضر ہیں، اُن میں اُن کی مشابہت سے کچھ اُن کو انکار نہیں مثلاً وہ لوگ صریح فرنگیوں کا بنا ہوا کپڑا پہن کر خوش ہوتے ہیں۔ اُنھی کا بنا ہوا اسباب گھروں میں رکھتے ہیں اور اُنھی کے بنے ہوئے ہتھیار اور ضرورت کی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں مگر ان چیزوں کو خود تیار کر کے کام میں لانے سے بڑا پرہیز کرتے ہیں۔

> حالاں کہ اُن سے پرہیز کرنے میں اُن کے ملکی انتظام اور ملکی ترقی دونوں میں بڑا نقصان اور خرابی پڑتی ہے۔ (۵)

غرض، حالؔی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ صنعتوں کے قیام کے بغیر نہ تو ملکی انتظام چل سکتا ہے اور نہ ہی مُلکی ترقی کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس حوالے سے وہ یہودی قوم کو داد دیتے ہیں کہ صدہا سال ذلت، رسوائی اور پسپائی کی زندگی مقدر ہونے کے بعد جب اُن کو آزادی اور مساوی حقوق ملے تو ترقی میں تمام اقوام سے آگے نکل گئے۔ یہاں تک کہ یورپ کی اکثر حکومتیں اُن کی قرض دار ہیں۔ حالؔی دراصل یہ چاہتے تھے کہ آزادی اور مساوی حقوق کا وہ تصور جو انگریزی قانون اور انتظام کی برکت سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے، یہاں کے لوگ بھی اس سے پورا فائدہ اُٹھائیں اور اپنے جسمانی و ذہنی قویٰ کو بھرپور انداز میں فروغ دیں۔ یہودیوں کی ترقی کی مثال حالؔی نے اُن لوگوں کو جواب دینے کے لیے دی ہے کہ جن کا کہنا تھا کہ مغربی اقوام ترقی کی جس سطح پر موجودہ حالت میں ہیں جب تک ایشیائی اقوام اس حالت تک پہنچ جائیں گی مغربی اقوام خدا جانے کہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ حالؔی اُن کے اس مؤقف کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مایوسی اور نا اُمیدی نے اِن کے دلوں کے گھروں کو مسمار کردیا ہے۔ محنت اور جفاکشی کی خصلت اِن کی روح سے نکل چکی ہے۔ یہ حالؔی ہی تھے کہ جن کا کہنا تھا کہ مذہب انفرادی اور قومی ترقی میں حارج نہیں ہے کیوں کہ ترقی کرنے کے لیے ''ضرورتیں'' خود معاملات کو درست سمت میں کھینچ کرلے جاتی ہیں۔ اس کے لیے حالی نے مثال بہت عمدہ دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابھی صرف تیس سال پہلے ہندوستان کا ہر مسلمان انگریزی سیکھنے کو گناہ سمجھتا تھا لیکن ضرورت نے خود ہی خود راستہ نکال دیا، اب انگریزی سیکھنا گویا ظلمات سے نکلنے کے برابر ہے۔

یہ بات جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے تمام افکار و خیالات اُن کے نزدیک مثل زہر کے ہیں جو سننے اور پڑھنے میں تو دل کش اور دل فریب لگتے ہوں لیکن جن کا عملی سطح پر اظہار تمدنی سطح پر ناممکن ہو۔ یوں حالؔی ایک خالص مادیت پسند مفکر کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ صوفیا اور صوفی شعرا کے فلسفہ ہائے ترکِ دنیا پر شدید تنقید کرتے ہیں کہ ان کی دل فریبی کا بھانڈہ، ان کا نا قابلِ عمل ہونا، سماجی و تمدنی زندگی میں پھوڑ دیتا ہے:

> اگر بغرضِ محال تمام انسان اس نصیحت پر کاربند ہو جائیں تو دنیا بالکل اُجڑ جائے اور دنیا کے سارے کام درہم برہم ہو جائیں۔ شجاعت اور ہمت، عقل اور تدبیر، محنت اور جفاکشی، عدالت اور ریاست غرض کہ وہ سب صنعتیں جو کہ انسان کو ''انتظامِ معاش'' کے لیے عطا ہوئی ہیں یک قلم معطل و بے کار ہو جائیں۔ (۶)

سرسید کی تحریک پر ایک الزام یہ تھا کہ اُن کی تعلیمی پالیسی اور ترغیب کے باعث جو نوجوان یورپ سے پڑھ کر آتے ہیں وہ ہندوستان میں آ کر شرم محسوس کرتے ہیں اور اپنی بود و باش کا مذاق اُڑانے لگتے ہیں۔ اپنے ہم وطنوں سے نفرت کرنے لگتے یں اور اُن کے ساتھ میل جول رکھنے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ حالؔی نے اس الزام کا جواب یوں دیا کہ اگر چند ایسے تعلیم یافتہ نوجوان موجود ہیں تو اِن کو ہاف سویلائزڈ (وحشی) ہی سمجھنا چاہیے۔ ایسے لوگ ذاتی زندگی میں ذاتی سطح پر کامیابی و ترقی کے خواہاں ہوتے ہیں، ذوقِ عمل سے محروم ہوتے ہیں جب کہ سویلائزڈ (مہذب) وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو اپنی شخصی کامیابیوں اور ترقیوں میں اُن لوگوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں کہ جو اِن سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شخصی بہبود کو جماعت کی ترقی میں ضم کر کے جماعت کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ یوں ایک فرد جماعت کی ترقی اور کامیابی کا زینہ بن جاتا ہے۔ حالؔی فرد کی کامیابی اور ترقی کے ذریعے دراصل قوم کی ترقی اور کامیابی کے خواہش مند تھے۔ حالؔی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ لوگ سائنٹفک سوسائٹی کی منعقدہ کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں، دلائل دیتے ہیں اور قوم کی اصلاح کی تدابیر پر اتفاقِ رائے قائم کرتے لیکن بعد میں خود کو میدانِ عمل میں نہ اُتارنے کے باعث تھوڑے ہی دنوں کے بعد خود ہی ان کوششوں کو بے سود قرار دینے لگتے ہیں۔ حالؔی کے خیال میں ایسے تمام افراد ہاف سویلائزڈ ہوتے ہیں۔ وہ خود نمونہ بننے سے کتراتے ہیں اور پرانے خیالات سے چمٹے رہنے ہی میں اپنی خیریت و عافیت سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہو پاتے کہ خود اُن کے اپنے نمونہ بننے سے خود اپنی حالت میں ایسا سُدھار آ جاتا ہے کہ اُنھیں اپنی گزشتہ زندگی اور افکار کی فرسودگی پر ہنسی آنے لگتی ہے۔

ہندوستان میں مغربی طرزِ حکومت و انتظام کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں صرف اور صرف اہلیت اور لیاقت ہی کڑا معیار تھا، یہ نہ دیکھا جاتا تھا کہ صاحبِ فہم و فراست حسب و نسب کے اعتبار سے کیا ہے۔ یہ ایک ایسی اعلیٰ خوبی تھی کہ جسے حالؔی نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ حالؔی طبقاتی کشمکش کے خاتمے کے لیے اس معیار کو ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک عزت، ناموری اور دولت صرف کام، محنت اور تدبیر کی صلاحیت سے ملتی ہے۔ حسب و نسب پر غرور ان کے خیال میں بقول ابنِ خلدون پانچویں پشت تک آتے آتے پرکھوں کی ساری کمائی لٹ جاتی ہے۔ دورِ صاحبانِ حسب و نسب کے پاس جُز بے شرمی اور نام نہاد غرور کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ اُن کے خیال میں ہندوستان کے مخصوص تمدن اور طرزِ معاشرت میں ایسے نابغہ افراد کا پیدا ہونا بعید از قیاس ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغرب میں ایسے حالات موجود ہیں کہ جن کے باعث عزم و ہمت کے پیکر اپنے کردار اور بصیرت سے ناموری کما سکتے ہیں۔ ایسے حالات پیدا کرنا اور سماج میں ایسی تبدیلیاں لانا کہ جن کے ذریعے صاحبِ کمال لوگوں کی تربیت اور تعلیم کا اہتمام بھی از حد ضروری ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وہ معاشرے کے ہر

فرد کو ذمہ دار اور پابند سمجھتے ہیں لیکن ہندوستان میں ہر شخص دوسرے پر بوجھ بننے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا مثلاً جو شخص بطور باپ اپنی خانگی مہمات کا بوجھ تنہا اپنے سر پر دھرے رکھتا ہے اور اولاد کو زحمت اور تکلیف سے بچاتا ہے، مرنے کے بعد اولاد کی تربیت نہ ہونے کے باعث، وہ اولاد گھر کو برباد کر ڈالے گی۔ دوسروں پر انحصار خواہ وہ حکومت پر ہی کیوں نہ ہو رعایا کو ست، کاہل اور ریاسیت پسند بنا دیتا ہے۔ حآلی ہر فرد کو اپنا ذمہ دار، ہُنر مند اور صاحبِ کردار دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ اس کے بغیر انسان کے جوہر نہیں کھلتے۔ حآلی کے نزدیک حسب و نسب پر غرور محنت و مشقت کی زندگی سے فرار پاتا ہے اگر کسی کی زندگی عملی جہتوں سے عاری ہے تو محض نسب پر غرور اُسے ذلت کی زندگی سے نکالنے میں کوئی مدد نہ دے سکے گا۔ اس حوالے سے انگلستان کو بطور ماڈل اپنی فکر کی بنیاد بناتے ہوئے حآلی لکھتے ہیں:

> جس گورنمنٹ کے ہم تحت ہیں، وہ کسی اعلیٰ خاندان کو ادنیٰ خاندان پر بغیر ذاتی استحقاق کے ترجیح نہیں دیتی۔ خود انگلستان میں ایک لارڈ کا بیٹا مقابلے کے امتحان میں موچی کے لڑکے کے برابر بیٹھتا ہے۔ (۷)

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حآلی عوام کو جائیداد بنانے کی بجائے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر راغب کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ اہلیت کا معیار قائم کرنے کے لیے حسب و نسب یا جائیداد کی بجائے علم و ہُنر پر عبور کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ یکساں اور مساوی حقوق کی فراہمی ایک ایسی قوت ہے کہ جس کے باعث ہر ادنیٰ میں اعلیٰ بننے کی لیاقت اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے بل کہ ادنیٰ طبقات کے جوہر زیادہ قوت سے کھلتے ہیں اور عمومی معاشرتی ترقی میں ان کا کردار مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔ جن معاشروں میں اپنے مخصوص حالات کے باعث ترقی اور تنوع کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے وہاں اس بات کی گنجائش بھی نہیں رہ جاتی کہ کوئی دوسری قوم اگر ترقی پا لے تو وہ اُس کا مقابلہ کرنے میں بے دست و پا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں حسب و نسب کے سماجی معیار نے یہاں کے معاشرے میں ایسا جمود طاری رکھا کہ جس کے باعث بحیثیت قوم وہ ناکام و نامراد رہ گئے اور دوسری طرف انگریزوں نے اپنے تدبر، ذہانت اور حکمتِ عملی سے دنیا کو قابو میں لے لیا۔ حآلی نے اس حوالے سے آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے معدوم ہو جانے پر ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے کہ وہ انگریزوں کے ظلم و ستم کے باعث برباد نہیں ہوئے بل کہ اپنی بربادی کے وہ خود ذمہ دار تھے:

> وہ بے چارے اس وجہ ناہموار، بے ڈول اور ناشائستہ تھے کہ انگریز فاتحوں کی صورتیں، ٹیپ ٹاپ اور چمک دمک دیکھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے اور کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اُن کے پڑوس میں رہ سکیں۔ (۸)

حالؔی کے خیال میں خود ہندوستان میں انگریزوں کو سوائے بدمعاشوں کی سرکوبی کے کچھ زیادہ قتل و غارت گری نہ کرنی پڑی اور پورا ہندوستان اُن کی جھولی میں آ گرا۔ اس کا سبب خود ہندوستان کی معاشرت کا جمود تھا کہ جسے ایک متحرک اور تازہ قوت یعنی انگریزوں نے باسہولت اپنی تجارت کے انتظام کے لیے قبضے میں لے لیا۔ حالؔی چاہتے تھے کہ انگریزوں کی پیروی کرتے ہوئے اُن کی قوم اپنے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کرلے کہ جن کے باعث انگریزوں کی دنیا بھر میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ صنعت وتجارت کا فائدہ صرف اُن کو ہوگا جو اس پر قدرت رکھتے ہوں گے۔ وہ ہندوستان کو زرعی معیشت سے نکال کر صنعتی معیشت میں لانے کے آرزومند تھے۔ اُن کے شعور کو داد دی جانی چاہیے کہ اُس دور میں وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے کہ قدرتی وسائل کی صورت دراصل خام مال کی ہوتی ہے۔ اس کے حصول پر لاگت اور محنت بھی حاصل شدہ فائدے یا منافع سے کہیں زیادہ پڑتی ہے۔ اس کے مقابلے میں صنعتی پیداوار کہ جس کی بنیاد کوڑیوں پر خریدے خام مال پر ہوتی ہے، مشینوں کے باعث لاگت بھی کم آتی ہے، محنت بھی کم کرنا پڑتی ہے اور منافع ایسا کہ جس کی کوئی حد وشمار نہیں۔ ایسے میں حالؔی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ انگریزی صنعت کے مقابلے میں وہ ہندوستان کی زرعی پیدوار کو ملکی ترقی کے لیے منافع بخش سمجھتے۔ اس حوالے سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اکیسویں اجلاس منعقدہ ۱۹۰۷ء کراچی میں اُن کا خطاب بڑی اہمیت کا حامل ہے، جس میں انھوں نے سندھ کی موجودہ حالت پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور ایسے علوم وفنون کی تدریس میں دلچسپی کا اظہار کیا کہ جن سے صنعتوں کو فروغ مل سکے تاکہ زرعی معیشت بھی صنعت کی بنیاد پر فروغ پا سکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے زرعی علوم و فنون سے متعلق سکولوں کے قیام کی ضرورت کو بھی احباب کی خدمت میں پیش کیا اور باقاعدہ زراعت کو زرعی فارموں کی طرز پر استوار کرنے کی بات کی۔ حالؔی کے ذہن میں یہ بات خوب روشن تھی کہ محض زرعی پیداوار کی بدولت ملکی معیشت میں استحکام ہرگز ممکن نہیں ہے۔ حالؔی کا ایک مضمون ''مدعیانِ تہذیب کی بداعمالیاں'' دراصل مسٹر اسٹوک نامی کسی انگریز شاعر کی طویل نظم کے اردو ترجمے کے نتیجے میں دیا گیا حاشیہ ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلا گیا تھا کہ جس کا جواب بھی بڑی پامردی کے ساتھ انھوں نے حاشیہ میں دے دیا اور بتایا کہ مسلمانوں کے بادشاہوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کے حاملین نے نظامِ صنعت وسرمایہ کے ذریعے بربریت کا بازار گرم کرنے میں کچھ کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے ناجائز ذرائع سے مفتوحین کی دولت و ثروت کو لوٹا۔ پہلے قتل وغارت گری سے لوٹا اور پھر تجارت اور صنعت کے نام پر لوٹا۔ یوں زرعی سرمایہ تجارتی سرمائے میں اور تجارتی سرمایہ مزید صنعتوں کے قیام میں مددگار رہتا چلا گیا۔ یوں مہذب مغربی حکومتیں تجارتی عہدناموں کے ذریعے بغیر بلدی لگے نہ پھٹکری مقامی حکومتوں کے تمام ملک ودولت ومنافع ومحاصل کی مالک

اور خود مختار بن گئیں۔ سرمایہ داری نظام کے خلاف یہ وہ سائنسی زاویہ نگاہ تھا کہ جس سے حالیؔ بخوبی آگاہ تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حالیؔ جب صنعت وحرفت اور تجارت میں ہندوستان کی ترقی کی بات کرتے ہیں تو وہ اس کی بنیاد نہ تو نوآبادیاتی نظامِ فکر پر رکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی محنت کشوں کے استحصال پر۔

حالیؔ جانتے تھے کہ قدرتی پیداواروں کے مقابلے میں ''مصنوعی چیزوں کی جس قدر طلب زیادہ پیدا ہوتی ہے اُسی قدر اُن پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ ان سویلائزڈ (وحشی) دنیا کی دولت سویلائزڈ (مہذب) دنیا کی طرف خود بخود کھنچی چلی جاتی ہے۔''(۹) خود حالیؔ کو اس لوٹ کھسوٹ پر شدید رنج تھا کہ جس کے باعث مقامی محنت کش طبقات مسلسل بُری حالت سے دوچار ہوئے:

> کروڑوں اہلِ صنعت وحرفت، جن کی دستکاری، مکینکس (کلوں، مشینوں) کا کسی طرح مقابلہ نہیں کرسکتی تھی، نانِ شبینہ کو محتاج ہوجاتے ہیں۔ فلاحت پیشہ لوگوں پر یہ پتا پڑی ہے کہ زمین کی پیداوار جس کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے، اُسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔(۱۰)

اس مضمون میں حالیؔ نے صاف لکھا ہے کہ نام نہاد شائستہ اقوام کی آزادیِ تجارت دراصل لوٹ مار ہی کی ایک صورت ہے۔ انگلستان فری ٹریڈ (یہ اصطلاح حالیؔ نے ایسے ہی استعمال کی ہے) کو اپنے لیے مناسب سمجھتا ہے کیوں کہ اُس کا فائدہ اسی میں ہے۔ حالیؔ نے سرکاری مصلحت کے تحت ہندوستان کی مثال تو نہیں دی تاہم وہ یہی باور کرانا چاہتے تھے کہ آپ کی فری ٹریڈ آپ کی دولت وثروت کو چار چاند لگادے لیکن ہندوستان کو اس کا نقصان یہ ہوا کہ اُن کے پاس فری ٹریڈ کے لیے خام مال تھا، مشقت سے جھکے کندھے تھے اور حالت وہ کہ جس سے نکلنا زرعی معیشت کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ آپ وہ ہیں کہ جن کے پاس ٹریڈ کے لیے تیار شدہ مصنوعی پیداوار ہے اور اس کی منڈیوں تک ترسیل کا نظام ایسا کہ آپ کے سارے کھوٹے بھی کھرے۔

پیش کردہ مفروضے سے پتہ چلتا ہے کہ حالیؔ جب مغربی علوم وفنون کی تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد اُس جدید تمدن کے قیام میں فکری وعملی مدد ہے کہ جس کے ثمرات یورپ نے سمیٹے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان بھی جدید علوم وفنون کی تحصیل کے ذریعے غربت اور پس ماندگی کے گڑھے سے باہر نکلے۔ سرسید کی جی جان سے حمایت اس لیے کی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں معاملات طے کرنے میں اُن جیسی زیرکی کسی کو میسر نہیں اور بغیر انگریزوں کے تعاون کے کسی بھی عملی تدبیر کا کارگر ہونا ممکن نہیں ہے۔ انگریزی تمدن کی خوبیوں کو اُبھارنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان جو پدرم سلطان بود کی

کہاوت کے آئینہ دار تھے، اپنے اندر موازنے اور مقابلے کی لیاقت کو دریافت کر سکیں۔ صنعت و تجارت کا مقامی سطح پر فروغ اس لیے چاہتے تھے تا کہ اُنھیں مصنوعی پیداواری اشیاء کے حصول کے لیے مغربی صنعت و حرفت اور تجارت کا محتاجِ محض نہ بننا پڑے۔ اُن کی تمام تحریروں اور تقریروں میں ایک بھی ایسا جملہ نہیں ملے گا کہ جس کا مقصد یہ ہو کہ اپنے مقامی سماج میں تبدیلی کے لیے انگریزوں کا کوئی احسان اُٹھایا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریز سرکار کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بجائے ہندوستان کے لوگ خود کفیل ہوں۔ خواہ تعلیم کے فروغ کے لیے اپنوں کے سامنے بھکاری ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ سرسید اُن کو اس لیے بھی پسند تھے کہ وہ مختلف تقریبات میں اپنے گلے میں جھول ڈال کر احباب سے چندہ مانگنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ مدرسوں اور اداروں کے قیام کے لیے سرسید کو لہک لہک کر غزلیں گانا پڑیں تا کہ سامعین خوش ہو کر چندے کے لیے اپنی جیبیں ڈھیلی کرنے پر آمادہ ہو جائیں، لاکھ ملیں، دس ملیں یا ایک اشرفی، ہر رقم موصولہ پر یکساں خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ حالیؔ چاہتے تھے کہ سماجی سدھار کے لیے لوگ خود اشتراک و تعاون پر باہمی رضامندی سے آمادہ ہوں اور انگریز سرکار کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا پڑے۔ انگریز کے ساتھ ایسی ننگی مخاصمت کی مثال اور کہیں سے نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مرتبہ، کلیاتِ نثرِ حالی، مجلس ترقی ادب، جلد دوم، لاہور، ۱۹۶۸، ص ۵۱
۲۔ ایضاً ص ۷۹
۳۔ ایضاً ص ۱۱۴
۴۔ ایضاً ص ۲۲۳
۵۔ ایضاً ص ۱۶۹
۶۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مرتبہ، کلیاتِ نثرِ حالی، مجلس ترقی ادب، جلد دوم، لاہور، ۱۹۶۸، ص ۱۹۳
۷۔ ایضاً ص ۲۰۹
۸۔ ایضاً ص ۲۷۷
۹۔ ایضاً ص ۲۸۰
۱۰۔ ایضاً ص ۲۷۹

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد

’’مسدّسِ حالؔی‘‘ اور عہدِ حاضر میں اس کی معنویت

(۱)

برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کا سیاسی اور تہذیبی زوال اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے نااہل اور عیش پرست جانشین ہوا وہوس کا شکار ہو کر باہم صف آرا ہو گئے تو اس خانہ جنگی اور باہمی آویزش کے باعث کاروبارِ حکومت اُن کے ہاتھوں سے نکلنے لگا۔ صوبے اور ریاستیں مرکز سے کٹ کر الگ اور خود مختار ہونے لگیں۔ بیرونی طاقتیں حملہ آور ہوئیں اور زوال آمادہ مغل حکمرانوں کو مزید مشکلات سے دوچار کر گئیں۔ شورشوں، بغاوتوں اور محلاتی سازشوں نے بہت جلد مرکزیت کے شیرازے کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان حالات میں ہندوستان پر قبضے کا خواب دیکھا اور نہایت برق رفتاری سے اس کی تعبیر کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئی۔ اوّل اوّل اس نے ریاستوں کو باہم ٹکرا کر کمزور کرنے کی حکمتِ عملی ترتیب دی اور جب وہ آپس میں ٹکرا کر کمزور ہو گئیں تو یکے بعد دیگرے ان کی گردنوں پر اپنے آہنی پنجے گاڑ کر انھیں ہمیشہ کے لیے اپنا مطیع وباج گزار بنا لیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ریاستوں اور صوبوں کے حکمران ایسٹ انڈیا کمپنی کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ عظیم مغلیہ اقتدار سمٹتے سمٹتے دہلی کے لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اہلِ ہند نے جب اپنی گردنوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت مضبوط ہوتے دیکھی تو پل بھر کے لیے پھڑ پھڑانے کا جتن کیا مگر اب وقت گزر چکا تھا اور اس آہنی شکنجے سے نکلنا اب ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی، قیادت کے فقدان، ایک دوسرے پر عدمِ اعتماد اور مناسب حکمتِ عملی کے نہ ہونے کے باعث ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، اہلِ ہند کے لیے مستقل غلامی کا عنوان بن گئی۔ آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفؔر کو گرفتار کر کے رنگون کے قلعے میں اسیر کر دیا گیا جہاں وہ بے بسی و بے کسی کی تصویر بنا، قید خانے کے در و دیوار سے سر ٹکراتے ٹکراتے راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ پورے ہند پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا اور یوں برطانیہ کا نوآبادیاتی دائرہ وسعت آشنا ہوا۔

انگریزی اقتدار نے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کی بساط لپیٹ دی۔ سیاسی، تمدنی، مذہبی، اخلاقی اور

تعلیمی نظام قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے۔ انگریزوں نے نہایت ہوشیاری اور حکمتِ عملی سے ہندوستانیوں کو باہم لڑا کر ان کی رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر دیا۔ انھوں نے چوں کہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور وہ مسلمانوں کے شان دار ماضی سے بھی باخبر تھے، اس لیے ہندوستان میں اگر انھیں کسی قوم سے خطرہ تھا تو وہ مسلمان تھے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر انھوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور ان پر عرصۂ زیست تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اعتراف کرتا ہے:

> ”حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمتِ عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائعِ زندگی میں بھی کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔“(۱)

ایک طرف عیسائی مشنری قریہ قریہ، بستی بستی گھوم کر اسلام کے چشمۂ صافی کو گدلانے اور سادہ لوح اور ناخواندہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات کا زہر گھولنے میں مصروفِ عمل تھے تو دوسری طرف ہندو، انگریزوں کے ایما پر اور مسلمانوں کے خلاف اپنے فطری بغض کے باعث انھیں مسلسل تنگ کرنے اور تکلیف پہنچانے میں جُتے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مسلمان سماجی ابتری، اقتصادی زبوں حالی اور شکست خوردگی کے احساس کا شکار ہو کر حسرت ویاس کی تصویر بن گئے۔ ان سے زندگی کے منظرنامے پر فعال کردار ادا کرنے کی لگن چھن گئی، حالات کی سنگینی نے ان پر موت کی حالت طاری کر دی۔ قوم کے امرا اور اکابر اگرچہ دردمندی اور اخلاص سے اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے مگر ان کی تدابیر کا دائرہ محدود اور اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ بعض رہنما مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی استعمار کے خلاف نفرت کا بیج بو رہے تھے اور بعض انھیں انگریزوں کی ہم نوائی کا درس دے رہے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) حالات وواقعات کی اس سنگینی کے چشم دید گواہ تھے اور ان کا دل دردمند مسلمانوں کی اس ابتری اور درماندہ حالی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اس گرداب سے نکالنے کے متمنی اور زندگی کے منظرنامے پر انھیں آبرومندانہ مقام پر دیکھنے کے آرزومند تھے۔ مسدسِ حالؔی ان کے اسی جوشِ احساس کا نقشِ لازوال ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی کو نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ بیان کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیرت دلانے اور ان میں دینی حمیت کو بیدار کر کے انھیں زندگی کے منظرنامے پر ابھرنے کا درس دیا۔

(۲)

مولانا الطاف حسین حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں والدین کے سائے سے محرومی اور گھر کے ناموافق حالات کے باعث ان کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ اپنے ذوق وشوق اور طلبِ علم کی بدولت انھوں نے پانی پت اور دہلی میں عربی فارسی کی کچھ تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ مرزا غالبؔ سے شاعری پر اصلاح لی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی مصاحبت نے ان کو بہت متاثر کیا۔ شیفتہؔ سے استفادے کا اعتراف کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

> ”مرزا (غالب) کے مشورہ واصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا، منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔۔۔۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔“(۲)

نواب شیفتہؔ کی وفات [۱۸۶۹ء] کے بعد وہ لاہور آ گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں انگریزی کتابوں کے اُردو تراجم کی درستی ان کے فرائض میں شامل تھی۔ انجمنِ پنجاب کی تحریک میں وہ عملاً شریک ہوئے۔ لاہور میں ہی کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی اور مولانا محمد حسین آزادؔ کی رفاقت نے ان کے خیالات میں یکسر تبدیلی پیدا کر دی اور وہ مشرقی ادبیات سے متنفر ہونے لگے، وہ اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ”اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔“(۳)

لاہور کے چار سالہ قیام نے ان کے خیالات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا؛ مشرقی ادبیات کے ذخیرے کو وہ سوختنی سمجھنے لگے اور شعر و ادب کی فوری اصلاح کا خیال ان کے دامن گیر ہو گیا۔ اس عرصے میں سر سید احمد خان اور علی گڑھ سے بھی اُن کا تعلق استوار رہا؛ جس نے ان کے اس خیال کو مزید تحرک بخشا۔ اینگلو عربک اسکول، دہلی میں مدرسی کے زمانے میں سر سید احمد خان کی فرمائش پر انھوں نے مسدّس لکھنا شروع کیا۔ مسدّس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پُرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے:

رو چو انساں لب بجنباں ور دہن
ور جمادی لافِ انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔ ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی، اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا ----- ہر چند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی، دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انھی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدّس کی بنیاد ڈالی۔ دُنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی

> نصیب نہ ہوا، مگر ہر حال میں یہ دُھن لگی رہی۔ بارے الحمدللہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔"(۴)

حالی سے مسدّس کی فرمائش اگرچہ سرسیّد نے کی تھی مگر انھیں اندازہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی اتنے مؤثر پیرائے میں اتنی قدرت اور مہارت کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھالی بھی جا سکتی ہے۔ حالی اگرچہ اسے ایک "ٹوٹی پھوٹی نظم" قرار دیتے ہیں اور "نازک خیالی" اور "رنگین بیانی" سے عاری اور "مبالغے کی چاٹ" اور تکلف کی چاشنی" سے تہی ایک "اُبالی کھچڑی" کہتے ہیں مگر ۱۸۷۹ء میں جب یہ چھپ کر سامنے آئی تو سرسید احمد خان اس سے بے حد متاثر اور مرعوب ہوئے اور انھوں نے اپنے خط [مرقومہ: ۱۰؍جون ۱۸۷۹ء] میں مولانا حالی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

> "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہولی، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدّس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہاتِ دوزاز کار سے جو مایۂ نازِ شعرا و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے، کیوں کر ایسی خوبی و خوش بیانی اور مؤثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔"(۵)

سرسیّد احمد خان اس بات پر بھی بہت مفتخر تھے کہ مسدّس کی تخلیق ان کی فرمائش کا نتیجہ ہے۔ وہ مسدّس کی اشاعت پر بہت خوش اور مسرور ہوئے اور مولانا حالی کو لکھا: "بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا لایا ہوں۔"(۶) اگرچہ مسدس حالی سرسید ہی کی تحریک پر معرضِ وجود میں آئی تاہم یہ خیال کرنا درست نہیں کہ مسدّس سراسر ایک فرمائشی تخلیق ہے اور حالی نے محض سرسیّد کے کہنے پر مسلمانوں کی تاریخ کو نظم کر دیا ہے۔ مسدّس کے ایک ایک مصرعے میں حالی کا دلِ دردمند دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ ان کے باطن کی آواز اور ان کے احساسِ دروں کا اظہاریہ ہے۔ سرسیّد احمد خان نے مسدّسِ حالی کا جیسا والہانہ استقبال کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسی ہی انقلاب آفریں نظم کا خواب دیکھا تھا۔ مولانا حالی نے مسدّس کے حقوقِ تصنیف مدرسۃ العلوم کو دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو سرسیّد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں لکھا:

> ”آپ کے اس خیال کا کہ حقِ تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدّس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور رہو اور لڑ کے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طلبہ سارنگی پر گاویں بقوال درگاہوں میں گاویں؛ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔“(۷)

مسدّسِ حالؔی کا اصل نام مدوجزرِ اسلام ہے اور واقعتاً یہ اپنے نام کی طرح مسلمانوں کے عروج وزوال، فراز ونشیب اور بلندی و پستی کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا آغاز عرب اور اہلِ عرب کی حالتِ زار سے ہوتا ہے۔ مبالغے اور دوراز کار تشبیہات و استعارات سے عاری ہونے کے باوجود واقعات اور حالات کی چلتی پھرتی تصویر پیش کر دینا معجزۂ فن اور قدرتِ کلام کی دلیل ہے؛ سچی تڑپ اور حقیقی سوز کے بغیر تاریخی حالات و واقعات کے بیان میں تاثیر اور دل پذیری پیدا نہیں ہوسکتی۔ حالؔی کے معجز بیان قلم نے حقیقی واقعات کے قالب میں وہ روح بیدار کر دی ہے جو پڑھنے سُننے والوں کے دلوں میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہے۔ اہلِ عرب کی جہالت اور وحشت کا بیان ملاحظہ ہو:

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اِک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے
نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اَڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اِک آگ ہر سُو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اِک اُن کی جہالت کا تھا وہ

طلوعِ اسلام، رسولِ کائناتؐ کے مثالی کردار، مسلمانوں کی جدوجہد اور دُنیا بھر میں ان کے علم وعمل اور اوصاف وکمالات کی تصویر کشی میں مولانا حالیؔ نے خونِ جگر صرف کر دیا ہے۔ سادگی اور صفائی، پاکیزگی اور برجستگی مصرع بہ مصرع بلکہ لفظ بہ لفظ سفر کرتی نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کی اندوہ ناک تصویروں اور ان کی بے عملی، تعصب، جہالت، خودغرضی، بے تمیزی اور بے بصری کے ٹھیک ٹھیک نقشوں میں حالیؔ کے قلب کا گداز اور ان کی آنکھوں کا نم چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر دار عالموں ریاکار اور شعبدہ باز پیروں، کج فہم حکیموں، بے حس شاعروں اور متکبر امیروں کی قلعی جس انداز میں کھولی گئی ہے اس سے حالیؔ کی دردمندی اور تڑپ کی عکاسی ہوتی ہے:

یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ حقیقت
مقام ان کا ہے ماورائے شریعت
انھیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت
انھیں کے ہے قبضے میں بندوں کی قسمت
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہی بایزید اب
بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کوئی مسئلہ پوچھنے ان سے جائے
تو گردن پہ بارِ گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے
تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اس کا نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے

مسدس حالؔی نے شائع ہوتے ہی ہر طرف گویا آگ لگا دی۔ قعرِ مذلت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں نے اپنے عروج وزوال کی کہانی کو پڑھا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ نام نہاد مولویوں، بے عمل عالموں، جعلی پیروں اور چرب زبان ادیبوں اور خوشامدی شاعروں نے مسدس کے آئینے میں اپنی مکروہ تصویریں دیکھیں تو اپنی اصلاح کے بجائے آئینے پر سنگ باری شروع کر دی۔ حالؔی کے کردار، ان کے مذہبی خیالات، ان کی فرنگ دوستی اور مسدس میں زبان وبیان کی غلطیوں اور ردیف وقوافی کی ناہمواریوں کو چھچھورے اور عامیانہ انداز میں بیان کرنے لگے، خیالی، ڈفالی اور خالی جیسے مضحکہ خیز ناموں سے مسدس کے جواب لکھے گئے مگر بہت جلد یہ سب ہنگامے فرو ہو گئے اور مولانا حالؔی کے مخالفین حسد وبغض کی اس آگ میں خود ہی جل کر بھسم ہو گئے۔ حالؔی کی دردمندی سکۂ رائج الوقت ٹھہری اور اس کا کلام مسجدوں، درگاہوں، گھروں، اسکولوں، مدرسوں، گلیوں، بازاروں اور مجلسوں میں پڑھا جانے لگا۔ نصابوں میں شامل ہوا اور دُنیا کی مختلف زبانوں میں اس بے نظیر نظم کے تراجم ہوئے۔ حالؔی نے مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کو جس دقتِ نظر سے دیکھا اور مسلمانوں کے زوال کے داخلی اسباب کی جس طرح نشان دہی کی وہ ان کے تبحرِ علمی اور تاریخِ اسلام سے ان کی باخبری کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ان کے شعورِ تاریخِ اسلام کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ”مسدس میں شیرازۂ ملت کے اجزائے پریشاں کے انفرادی انحطاط وانتشار کی تفصیل یا خارجی طاقتوں کی سازشوں اور آویزشوں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن حالؔی نے زوال کے داخلی اسباب کا تجزیہ اس خوبی سے کیا ہے اور موجودہ حالات کی ایسی مفصل ومکمل تصویر پیش کی ہے کہ ہمیں ملت کے عروج وزوال کی اس داستان میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ملتِ اسلامیہ کی سیزدہ صد سالہ زندگی کی طویل داستان نسبتاً ایک نظم میں بیان کرنے کے لیے فنی ہنرمندی کے علاوہ تاریخی عوامل کے واضح شعور اور صحیح اسلامی نقطۂ

> نظر کی ضرورت تھی۔ حالؔی جانتے تھے کہ مدوجزرِ اسلام کی کہانی عرب وعجم کے شاہنامے سے کس حد تک مختلف ہوگی لہٰذا انھوں نے رزم وبزم اور حرب وضرب کے ہزاروں کارناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ان بنیادی اقدار پر اپنی توجہ مرکوز رکھی جس کے فروغ یا فقدان پر اسلامی تحریک کے عروج یا زوال کا انحصار تھا۔‘‘(۸)

مسدّسِ حالی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ مسدّس کا اختتام ایسے اشعار پر ہوتا تھا جن میں مایوسی اور قنوطیت کا رنگ غالب تھا۔ قوم وملت کا درد رکھنے والے اکابر نے حالؔی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور تقاضا کیا کہ اس میں ایسے اشعار شامل کیے جائیں جو مایوسی کی دلدل میں دھنسے لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑا کر انھیں پھر سے آمادۂ عمل کرسکیں۔ حالؔی نے ۱۸۸۶ء میں ۱۶۲ بند کا ضمیمہ شامل کردیا جس میں امید اور رجائیت کا مضمون سورنگوں سے بیان کیا۔ بے عملی، تغافل کیشی، کاہلی اور سستی کی مذمت اور حرکت وعمل کی توصیف اس انداز سے کی کہ قلب ونظر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

مسدّسِ حالی اپنی طرز کی پہلی نظم ہے۔ دُنیا کی مختلف زبانوں اور ادبیات میں نظم کی ایسی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ یہ نظم صحیح معنوں میں اُردو میں قومی وملی شاعری کا نقطۂ آغاز ہے۔ تاثیر میں ڈوبی اس نظم نے بلاشبہ لاکھوں مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں غیرتِ ایمانی اور حمیتِ قومی کا احساس ابھارنے کا فریضہ ادا کیا۔ اپنی سادگی اور دل کشی کے باعث یہ صرف طبقۂ خواص ہی میں مقبول نہیں ہوئی بلکہ عوامی حلقوں میں بھی قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ شیخ محمد اکرام مسدّس کے دائرۂ اثر کو علی گڑھ کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے زیادہ وسیع قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مسدّس نے قوم کی بیداری کا پیغام اس حلقے تک پہنچایا، جہاں علی گڑھ کالج یا کانفرنس کی رسائی نہ تھی۔ ان دونوں کا حلقہ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود تھا لیکن مسدّس کی سادہ زبان اور سیدھے سادے خیالات جتنے خواص کو مرغوب تھے اتنے ہی عوام کو عزیز تھے۔‘‘(۹)

مولانا الطاف حسین حالؔی، سرسیّد احمد خان کے اوصاف وکمالات کے معترف اور ان کی تعلیمی وقومی خدمات کے سچے قدردان تھے اور انھیں اپنا محسن، ہمدرد اور مربّی خیال کرتے تھے مگر وہ ان کے مقلدِ محض نہ تھے۔ حکومت کی تعریف وتوصیف میں اگر وہ سرسیّد کے خیالات سے متاثر دکھائی دیتے ہیں تو عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں سرسیّد کے نقطۂ نظر کے خلاف بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔ سرسیّد کے مذہبی خیالات اور

معتقدات سے بھی حالؔی کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور توحید و رسالت، دُنیا و آخرت، جزا و سزا، عبادات و عقاید میں ان کا نقطۂ نظر سوادِ اعظم سے کہیں متصادم نہ تھا۔ مولانا حالؔی علی گڑھ تحریک میں صحیح مذہبی روشنی کا فروغ چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے کوشش بھی کی۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا یہ کہنا صداقت سے خالی نہیں:

> ”علی گڑھ تحریک نے حالؔی کی شاعری کا رُخ موڑا تھا، مسدّسِ حالی نے خود اس تحریک کا رخ قبلۂ مغرب سے مغرب قبلہ کی طرف موڑ دیا۔ اس سے پہلے تحریک کا مطمحِ نظر انگریزی اور انگریزیت کے سوا اور کیا تھا؟ لیکن مسدّس کا شاعر جب اپنی خودی میں ڈوب کر ابھرا تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی کہ قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے مغرب کی اندھی تقلید درکار نہیں، اسلام کی ابدی تعلیمات اور تہذیبی اقدار ماضی کی طرح آج بھی بقا و ارتقا کی ضامن ہیں۔“(۱۰)

(۳)

مسدّسِ حالی کو تخلیق ہوئے ۱۳۵ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ یہ اب بھی ہر طبقے میں مقبول اور پسندیدہ کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مختلف تعلیمی درجوں کے نصابات میں شامل رہی ہے اور اس کے بے شمار ایڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ مسدّس کی تخلیق سے لے کر اب تک برعظیم پاک و ہند طرح طرح کی تبدیلیوں سے دوچار رہا۔ سیاسی، سماجی، جغرافیائی، تعلیمی، ادبی، اخلاقی اور اقتصادی شعبوں میں نت نئی تبدیلیوں کے باعث ان کے قواعد، معیارات، اسالیب اور انداز بھی بدل گئے۔ اس عرصے کے دوران میں طرح طرح کی مقامی اور بین الاقوامی تحریکیں سرگرمِ عمل رہیں اور زندگی کے منظرنامے میں اپنا فعال کردار ادا کر کے رخصت ہوئیں۔ ان تحریکوں نے اہلِ ہند و پاک کے قلب و ذہن پر عارضی، ہنگامی یا دوررس اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان تبدیلیوں اور ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مسدّسِ حالؔی کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں کمی نہیں آئی۔ مسدّس کا یہ قبولِ عام اور شہرت ہی عہدِ حاضر میں اس کی معنویت کا اظہاریہ اور اس کی افادیت کا اشاریہ ہے۔ اثر و سوز میں ڈوبی ہوئی یہ عظیم الشان نظم آج بھی اقوام و افراد کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص فکری رہنمائی کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔ مسدّس حالی کے صدی ایڈیشن [۱۹۳۵ء] کی ایک تقریب میں سیّد سلیمان ندوی نے لکھا تھا:

> ''اس مسدّس کی تالیف پر نصف صدی سے زیادہ گزر چکی مگر اس کے اثر کی تازگی کا اب بھی وہی عالم ہے۔ امید ہے صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی جائیں گی لیکن ان اوراق پر سچائی اور اخلاصِ ملت کی تاثیر سے کہنگی نہ آئے گی۔ یہ خود حیاتِ جاوید پائے گی اور اپنے مصنف کو حیاتِ جاوید بخشے گی اور جیسے اِس دُنیائے فانی میں وہ اِس کی شہرت کا سبب بنی، اُس دُنیائے باقی میں اس کی مغفرت کا سامان بنے گی۔''(۱۱)

مسدّسِ حالی نے اُردو شاعری کا مزاج، منہاج اور قبلہ تبدیل کر دیا تھا، انھوں نے زلف و رخ کے خیالی افسانوں، ہجر و فراق کے مصنوعی قصوں اور عشق و محبت کی جھوٹی داستانوں کے بجائے شاعری کو ملک و ملت اور مذہب و قوم کی خدمت کا راستہ دکھایا تھا اور ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کئی شاعروں اور ادیبوں نے شعر و ادب کو ان نئے موضوعات سے مالا مال کر کے اسے نئے آفاق کی بشارت دی۔ مسدّس قومی اور ملی شاعری کا نقطۂ آغاز ہے اس لیے اُردو ادبیات میں قومی و ملی شاعری کی تاریخ کو سمجھنا اور اس کے منشور کو جاننے کے لیے مسدسِ حالی کا مطالعہ ہر عہد کی ضرورت ہے۔

مسدّسِ حاؔلی مسلمانوں کے عروج و زوال کی سچی دستاویز اور ان کی تاریخ کا حقیقی مرقع ہے۔ مولانا حاؔلی نے پوری مسلم تاریخ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن اسباب و عوامل کو کھوج نکالا ہے جن کے باعث اسلاف سر بلندی اور سرفرازی اور بیسویں صدی کے مسلمان ذلت و نکبت اور پریشاں حالی کا شکار ہوئے ہیں۔ مولانا حاؔلی کا یہ تاریخی تجزیہ ہمیشہ مسلمانوں کی فکری رہنمائی کرتا رہے گا۔ دُنیا کی دوسری اقوام و ملل بھی اس سرچشمۂ صافی سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق روشنی حاصل کر سکتی ہیں۔ مولانا حاؔلی نے اپنے عہد کے مسلمانوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مختلف طبقوں کے جن خیالاتِ رزیلہ اور عاداتِ قبیحہ پر نشتر زنی کی تھی۔ افسوس! ان طبقوں نے مولانا حاؔلی جیسے دردمند معالج کے حرفِ نصیحت پر کان نہیں دھرے اور اپنے اعمال و افعال کی اصلاح و درستی کی مطلق کوشش نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اُن کے افعال و اعمالِ قبیحہ کا زہر پوری سوسائٹی میں پھیل چکا ہے۔ اس لیے مسدّسِ حالی کی جتنی ضرورت آج ہے شاید پہلے نہ تھی۔ تعصب، تنگ نظری، جھوٹ، خوشامد، خود غرضی، غرور و تکبر، بے حمیتی اور بے بصری کا دیمک معاشرے کو بُری طرح چاٹ رہا ہے۔ وارثانِ منبر و محراب، اصحابِ کتاب و قلم، شعرا و ادبا، امرا و اکابر، حکما و دانش ور اور دوسرے افراد اپنے فرائضِ منصبی سے غافل ہو کر جادۂ حق سے بہت دُور ہو چکے ہیں۔ اس لیے پورا معاشرہ ذلت و نکبت کی لپیٹ میں ہے۔ تفرقہ بازی اور گروہ بندی نے جمعیت کو نقصان پہنچا کر افرادِ معاشرہ کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت، بغض، حسد، کینہ اور

حقارت کے امراض پیدا کر دیے ہیں۔ قتل وغارت گری، ڈاکہ زنی، ناانصافی، حق ناشناسی، استحصال اور جہالت کے عفریت چار سو دندناتے پھرتے ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے ذلت ونکبت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو مولانا الطاف حسین حالؔی نے نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ اس عذاب اور کرب سے نکلنے کا جو راستہ بتایا تھا، آج کے پریشان حال مسلمانوں کے لیے بھی وہی نسخۂ اکسیر ہے۔ مولوی عبدالحق کا یہ قول صداقت سے خالی نہیں:

> ”مسدسِ حالی زندۂ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گُر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔“(۱۲)

حوالہ جات

۱۔ ہمارے ہندستانی مسلمان (اُردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق حسین)؛ لاہور؛ س ن؛ ص ۳۴۹۔
۲۔ ”ترجمۂ حالی“ مشمولہ: کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل مرتب: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)؛ لاہور؛ مجلسِ ترقیِ ادب؛ اوّل، جولائی ۱۹۶۸ء؛ ص ۱۰۔
۳۔ ایضاً؛ ص ۱۱۔
۴۔ ”دیباچہ“ مشمولہ: مسدسِ حالی (صدی ایڈیشن مرتب: ڈاکٹر سید عابد حسین) کراچی؛ اُردو اکیڈمی سندھ؛ چھٹی بار ۱۹۹۲ء؛ ص ۶۳ تا ۶۵۔
۵۔ مکتوباتِ سرسید: مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی؛ لاہور؛ مجلسِ ترقیِ ادب؛ ۱۹۵۹ء؛ ص ۳۱۲۔
۶۔ ایضاً؛ ص ۳۱۲۔
۷۔ ایضاً؛ ص ۳۱۳۔
۸۔ کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل)؛ ص ۶۱۔
۹۔ شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر؛ لاہور؛ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ؛ طبع پانزدہم، ۱۹۸۸ء؛ ص ۱۲۶۔
۱۰۔ کلیاتِ نظمِ حالی (جلد اوّل)؛ ص ۶۱، ۶۲۔
۱۱۔ ”مقدمہ“ مشمولہ مسدسِ حالی (صدی ایڈیشن): ۴۷۔
۱۲۔ ”تقریب“ مشمولہ مسدسِ حالی (صدی ایڈیشن): ۲۱۔

☆☆☆☆

حمیدہ شاہین

حالؔی کی نظم ''مناجاتِ بیوہ''

مولانا الطاف حسین حالؔی کی شہرہ آفاق تخلیق مسدّس کے علاوہ ان کی دو کتابیں ''مجموعہ نظم حالؔی'' اور ''دیوانِ حالؔی'' ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئیں، لیکن ان سے پہلے کی تین نظمیں ان مجموعوں میں شامل نہیں کی گئیں کیوں کہ یہ اس سے پہلے ہی کثیر تعداد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں۔ یہ نظمیں ''مناجاتِ بیوہ''، ''مثنوی حقوقِ اولاد'' اور ''شکوۂ ہند'' ہیں۔ ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' ایسی نظمیں ہیں جنھیں تانیثی شعور کی اہم نظموں کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نظمیں اپنے موضوع، ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے ایسی منفرد اور اثر انگیز تھیں کہ اردو ادب کے خواص میں ہی نہیں، عوام میں بھی مقبول ٹھہریں۔ وہ زمانہ، جب اردو ادب میں حقوقِ نسواں کے لیے کوئی لہر، کوئی آواز نہ تھی، ایسی نظموں کا ایسی اثر آفرینی کے ساتھ سامنے آنا ایک انفرادیت بھی تھی اور اہمیت بھی۔ اگر صرف ''مناجاتِ بیوہ'' کی بات کی جائے تو یہ طویل شاہکار نظم، پُرسوز آہنگ اور پُرکار سادگی سے بھرپور ہے۔ کم سن بیوہ کے احساسات بیان کرتی یہ نظم مولانا حالؔی کی داخلی دنیا کی ایک جھلک ہے جہاں ایک دردمند دل دھڑکتا تھا کیوں کہ محض خارجی تحریک سے یا فقط فکری و نظریاتی منصوبہ بندی کے تحت ایسے ادبی شہ پارے وجود میں نہیں آتے۔ یہ نظم ۱۸۸۴ء میں لکھی گئی۔ سنسکرت اور ہندوستان کی متعدد زبانوں میں اس نظم کے تراجم ہوئے۔ اس طرح اردو داں طبقہ کے علاوہ دیگر زبانوں کے لوگ بھی اس نظم کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ اس نظم کے چھوٹے بڑے بارہ (۱۲) حصے ہیں۔ کُل ملا کر اشعار کی تعداد ۴۵۸ ہے۔

پہلا حصہ ۱۷ اشعار پر مشتمل ایک داخلی باغیچہ ہے جس میں حمدِ باری تعالیٰ کے پھول کھِلے ہیں:

جوت ہے تیری جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں

دوسرے حصے میں ۱۱۴ اشعار ہیں۔ یہ بھی حمدیہ رنگ کے اشعار ہیں زیادہ تر اشعار میں تضادات کے ذریعے خالقِ کائنات کے اختیار کی وسعت کو اجاگر کیا گیا ہے:

تو ہی دلوں میں آگ لگائے
تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے، چمکار کے مارے
مارے، مار کے پھر چمکارے

تیسرے حصے میں ۵۸ اشعار ہیں۔ اس حصہ کے زیادہ تر اشعار کا موضوع پروردگار کا اپنے بندوں کے لیے تقسیم عنایات و آزمائش کا انداز ہے جس میں اس کی بے نیازی ظہور کرتی ہے:

ایک کو تو نے شاد کیا ہے
ایک کے دل کو داغ دیا ہے
کھیتی ایک کی ہے لہراتی
ایک کا ہردم خون سکھاتی

چوتھے حصے میں ۴۸ اشعار ہیں۔ اس حصہ میں حالؔی نے کمال فنکاری سے ایک بیوہ کی داخلی کیفیات اور خارجی صورتِ حال کو موضوع بنایا ہے۔ ایک مرد کے قلم سے کیا گہرائی اور تہ داری کے ساتھ ایسی عورت کے نازک احساسات بیان ہوئے ہیں جو شریکِ حیات کے تحفظ سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے جبر کا شکار بھی ہے۔ سادہ انداز بیان، رواں مصارع، شائستہ زبان، لطیف کنائے اور موزوں تشبیہات سے سجی ہوئی یہ نظم حالؔی کے گہرے خلوص، دل سوزی اور دردمندی کا مرقع ہے۔

نظم کے پانچویں مرحلہ پر اُنسٹھ (۵۹) اشعار میں اسی انداز کو اس طرح آگے بڑھایا اور پھیلایا گیا ہے کہ مشاہدہ کی باریکی اور خلوص کی گہرائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

چھٹا حصہ ۳۵ اشعار پر مشتمل ہے جس میں معاشرے کے اس جبر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو بیوہ عورت پر نہ صرف زینت و آرائش کے دروازے بند کرتا ہے بلکہ اس کے ہنسنے بولنے کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ وہ زندگی کی ہر دل کشی اور رنگینی سے کٹ جاتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ:

سوچ میں میرے سارا گھر ہے
میرے چلن پر سب کی نظر ہے

اسے لگتا ہے کہ:

مل جاؤں گر خاک میں بھی مَیں
بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی مَیں

نظم کی ساتویں کروٹ میں ۱۱۷ اشعار سمیٹے ہوئے ہیں جن میں بیوہ خاتون مظاہرِ فطرت کو اور ذاتِ خداوندی کو اپنی پارسائی کا گواہ بناتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کی ہر شے سے التجا کرتی ہے:

جب واں پوچھ ہو تیری میری
تم سب دیجیو گواہی میری

اس حصہ نظم میں ایک فرد کی بے بسی اس سادگی اور سچائی کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ اثر آفرینی عروج پہ دکھائی دیتی ہے۔

نظم کا آٹھواں حصہ ۱۲۸ اشعار پر مشتمل ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم ایک دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہی ہے کیوں کہ مصائب کے دل دوز بیان کے بعد اب ہلکے سے شکوہ کا انداز ابھرتا ہے جو ایک بندے کی اپنے خالق و مالک کے حضور رقت انگیزی کا تاثر دیتا ہے:

تھاہ تھی پانی کی ، نہ کنارا
تیرے سوا تھا کچھ نہ سہارا

اب ہم نوویں دروازے میں قدم رکھتے ہیں جہاں ۱۶۵ اشعار کی وسعت میں رنج و غم کے بے شمار جھروکے ہیں، ہر جھروکے میں ایک شمعِ سوزاں ہے جس کے قطرہ قطرہ پگھلنے کا درد حالّی کی قدرتِ بیان کا مظہر ہے۔ جنسِ لطیف کی زندگی کا یہ حقیقی المیہ اپنی ہمہ گیر شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس مظلوم کردار کی بے بسی کو حالّی کے بعد بھی کسی شاعر نے اتنی جزرسی کے ساتھ بیان نہیں کیا۔

دسویں منزل پر ۱۱۴ اشعار میں مناجات کا لہجہ پھر تبدیل ہوا۔ گلے شکوے کا اونچا سُر پھر نیچی لے میں آیا اور حمد و ثنا کے ساتھ پروردگار کی رحمت سے آس لگائی گئی۔

گیارھواں حصہ ۱۳۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ نظم کا عروج ہے۔ یہیں وہ بات کہی گئی جس کے لیے تمہید باندھی اور ماحول بنایا گیا۔ وہ مرکز ہمارے سامنے آتا ہے جس کے لیے نظم کی بارہ دری تعمیر کی گئی:

یا عورت کو پہلے بُلا لے
یا دونوں کو ساتھ اٹھا لے

یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی
جس سے گئی ہے پریت جہاں کی

یعنی بیوہ عورت پر جس طرح زندگی کے دروازے بند کیے جاتے ہیں، دراصل معاشرے کے اس تاریک پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے تا کہ اسے روشنی میں بدلا جا سکے۔

آخری اور بارھویں دروازے پر آئیں تو ۶۴ اشعار ضوریز ہیں۔ اس حصہ میں پوری نظم کی اترائیاں اور چڑھائیاں یکجا ہیں۔ نظم نے داخل سے خارج کی طرف سفر کیا اور فرد کی ابتلا و آزمائش کے بعد بیان کا اگلا پڑاؤ زمان و مکان ٹھہرے:

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
آج ہے رہنے کی تیاری
اور کل ہے چلنے کی باری

بابائے اردو نے ایک مرتبہ مہاتما گاندھی کو لکھا کہ:

> ”اگر آپ اس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہیں جو ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے تو حالؔی کی ”مناجاتِ بیوہ“ پڑھ لیں۔ ان نظموں کے بعد اردو شاعری میں عورت کا تصور محض رومان و تغزل کی زینت نہ رہا بلکہ معاشرے کے ایک اہم فرد کے طور پر سامنے آیا جس کی تکلیف کو، جس کی آواز کو ادب کا حصہ بنانا معیوب بات نہ رہی۔ فنی اعتبار سے یہ نظم سہلِ ممتنع کا عمدہ نمونہ ہے اور موضوع کے اعتبار سے اس نظم کو حالؔی کی اجتہادی اور توسیعی کوششوں کا بہترین حصہ کہا جا سکتا ہے۔“

☆☆☆☆

ایم۔ خالد فیاض

وارث علوی کا حالیؔ

الطاف حسین حالیؔ؛ شاعر بڑے ہیں یا نقاد زیادہ بڑے ہیں؟ یہ سوال ہمارے زمانۂ طالب علمی میں اکثر کلاس روم کا موضوع بن جایا کرتا تھا۔ ویسے بھی بچگانہ تنقید کا ایک اہم سوال یہی ہوتا ہے کہ کون کس سے بڑا ہے؟ جب تک کسی کے کسی سے بڑے ہونے کا فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک تنقیدی فیصلہ تسلّی بخش قرار نہیں پاتا۔ ہم کبھی اس بات پر لڑا کرتے کہ میرؔ؛ غالبؔ سے بڑے شاعر ہیں یا غالبؔ؛ میرؔ سے اور کبھی اس پر کہ اقبالؔ سب سے بڑے شاعر ہیں۔ کبھی منٹو، بیدی اور کرشن چندر میں اسی حوالے سے گھمسان کا رن پڑتا تو کبھی فیضؔ، راشدؔ اور میرا جی کا اس ضمن میں ٹکراؤ ہو جایا کرتا۔ غرض یہ کہ کسی بھی تخلیق کار کی اہمیت اسی صورت متعین ہوتی جب وہ دوسروں سے افضل قرار پا جاتا۔ یہ بات بہت بعد میں جا کر سمجھ آئی کہ ادب میں بڑا، بڑا ہی ہوتا ہے اور کسی ایک بڑے کا کسی دوسرے بڑے سے بڑا ہونا کچھ ضروری نہیں۔ اسی طرح ایک ادیب بیک وقت ایک جیسی دو حیثیتوں کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ حالیؔ اگر شاعر بڑے ہیں تو نقاد بھی بڑے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ اردو میں تنقیدی ادب کی کم عمری کی وجہ سے بطور نقاد حالیؔ کی اہمیت ذرا سی بڑھ جاتی ہے وہ بھی اس لیے کہ حالیؔ کی اس حیثیت سے پہلی بار اردو میں ادب کے بارے میں کچھ سنجیدہ سوالات منظر عام پر آئے اور پہلی بار اردو میں تنقید کا کوئی باقاعدہ پیٹرن یا ڈسپلن نظر آیا۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حالیؔ نے ہمیں پہلی بار تنقید لکھنا سکھائی۔

اس میں شک نہیں کہ ”مقدمۂ شعر و شاعری“ جہاں ایک طرف شاعری کے اصولوں اور تنقیدی معیاروں سے بحث کرتی ہے وہیں ایک ایسی ”تنقیدی جرأت“ کا اظہاریہ بھی ہے جس کی مثال ہمارے تنقیدی ادب میں خال خال ہی ملے گی۔ گو یہ بات اپنی جگہ پر بامعنی ہے کہ اُس وقت کی تاریخی، سیاسی اور سماجی قوتوں کی کارفرمائی اس ”جرأت“ کو شکل پذیر کرنے میں بے حد معاون تھی مگر اس کے باوجود یہ حالیؔ ہی ہو سکتے تھے جن کا ذہن وقت کی ان کروٹوں کو سمیٹ کر آنے والے تنقیدی ادب کو ایک وژن فراہم کرنے کے لائق تھا۔ اگرچہ ہماری تدریسی تنقید ”مقدمہ“ کو بالعموم تخیل، وزن اور اخلاق وغیرہ کے مباحث تک ہی محدود رکھتی ہے مگر سنجیدہ تنقید نے اردو کی کلاسیکی شاعری پر اٹھائے گئے حالیؔ کے سوالات سے معاملہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

گو وہاں بھی ردِعمل زیادہ ہے اور تجزیہ کم۔ اور غیر ضروری معاملات سے سروکار زیادہ۔ ایسی صورت میں وارث علوی "مقدمہ" کا اور "مقدمہ" کے ناقدین، دونوں کا غائر مطالعہ کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں، جس کا نتیجہ "حالی، مقدمہ اور ہم" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی مگر انتہائی "تیکھی" کتاب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وارث علوی خود بھی اِدھر اُدھر کی باتیں بہت کرتے ہیں اور حالؔی کی تنقید کی اُس خوبی کو کہ جس سے سیکھنے کی تلقین وہ دوسروں کو بڑی شدومد سے کرتے ہیں کہ حالؔی اپنے موضوع پر مرتکز رہنے کا ہنر خوب جانتے تھے، خود فراموش کردیتے ہیں، مگر اس کے باوجود وارث علوی کی تنقید، حالؔی شناسی کے ذیل میں کسی بھی طور نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ وارث اپنے مخصوص تنقیدی اسلوب (جسے طنزیہ اور اصرافی تنقیدی اسلوب کہہ سکتے ہیں) میں حالؔی کے "مقدمہ" کا جو عمیق تجزیہ کرتے ہیں وہ حالؔی کی تنقید سے متعلق نہ صرف یہ کہ ایک گہری بصیرت عطا کرتا ہے بلکہ بہت سے نئے سوالوں کو بھی جنم دیتا ہے۔ گو وارث علوی کی تحریر سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر حالؔی کے "مقدمہ" پر ان کا مقدمہ اپنے ان معاصر ناقدین کے ردِعمل میں، وجود میں آیا جن کے مفاہیم یا تشریحاتِ تنقیدِ حالؔی سے وارث مطمئن نہیں تھے۔ انہیں ان ناقدین کی تنقید پر بہت سے اعتراضات پیدا ہوئے جن کا جواب دینا انہوں نے ضروری سمجھا۔ لہٰذا اسی جواب دینے کے عمل میں وارث علوی کا حالؔی کی تنقید پر ایک اہم تجزیہ معرضِ وجود میں آ گیا جو بلا شبہ حالؔی شناسی کے باب میں ایک اہم اضافہ سے کم نہیں کہا جا سکتا۔

حالؔی کے ناقدین نے حالؔی پر جو اعتراضات اٹھائے، وارث علوی نے ان کا دفاع کیا ہے۔ اور اس دفاع میں حالؔی کے تنقیدی نظریات کے بارے میں بھی معاملہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے کہیں کہیں وہ ناقدین کے اعتراضات پر بے جا اعتراض اور حالؔی کی بے جا حمایت کے مرتکب بھی ہوئے ہیں جس میں ان کا قصور کم اور اس تحریر کے بنیادی محرک کا کردار زیادہ ہے۔ کیوں کہ جب آپ تنقید کے ردِعمل میں تنقید کرتے ہیں تو ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ وارث علوی چوں کہ ایک بڑے نقاد ہیں (اور اس میں شک نہیں) اس لیے وہ ان مسائل کو بہر حال اپنی تنقید پر حاوی ہونے نہیں دیتے (ہاں اس ذیل میں بنیادی خامی کیا پیدا ہوئی، اس کا ذکر آخر میں کیا جائے گا)۔ اسلوب کی "گرمی" کو تو خیر وہ اسلوب کی خامی سمجھتے ہی نہیں اس لیے اس سے وہ بچنے یا گریز کرنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کرتے اس لیے ان کی یہ "گرمی" اس تحریر میں بھی اُسی شدت سے موجود ہے جیسے ان کی دیگر تنقیدی تحریروں میں پائی جاتی ہے اور جو ان کی تنقیدی شناخت بن چکی ہے اور اب جسے ان کی تنقید کا منفرد لہجہ بھی مانا جاتا ہے۔

جن ناقدین کے اعتراضات سے وارث علوی نے یہاں زیادہ بحث کی ہے ان میں کلیم الدین احمد، سلیم احمد اور شمیم حنفی کے نام نمایاں ہیں۔ ان ناقدین کے اعتراضات کو موضوع بناتے ہوئے وارث علوی؛ حاؔلی کی تنقید کے جن اہم گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں ہمارے لیے یہاں وہ گوشے ان ناقدین کے اعتراضات سے زیادہ اہم اور توجہ طلب ہیں کہ ان گوشوں سے ہی وارث علوی کی حاؔلی سے ملاقات ممکن ہے۔ لہٰذا آیئے ان پر نظر کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ وارث علوی؛ حاؔلی کے ذہن، شخصیت، زبان اور اسلوب کو سراہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسا کلاسیکی رچاؤ والا ذہن اور سلجھا ہوا اسلوب ہماری تنقید کو آج تک میسر نہیں آیا۔ اس بحث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وارث علوی تنقیدی اسلوب کو نقاد کی شخصیت اور ذہنیت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ جیسا ذہن اور شخصیت ہوتی ہے ویسا تنقیدی اسلوب اور زبان ظہور میں آتی ہے۔ حاؔلی کے اسلوب میں اگر بناوٹ نہیں تو اس لیے کہ ان کی شخصیت میں بناوٹ نہیں۔ ان کی زبان میں اگر سادگی ہے تو یہ "سادگی ایک متمدن آدمی کی سادگی ہے، اُس آدمی کی سادگی نہیں جو متمدن زندگی کی تمام لطافتوں سے بے بہرہ ہو۔۔۔ حاؔلی کا تنقید لکھنا گویا ایک مہذب آدمی کا تہذیب کے مسئلے پر دوسرے مہذب آدمیوں سے سرگرمِ گفتگو ہونا ہے۔" (ص:۱۳) اور پھر وارث علوی کا یہ کہنا کافی غور طلب بھی ہے اور بحث طلب بھی ہو سکتا ہے کہ "ہمارے تنقیدی اسالیب کی اکثر خرابیاں کردار کے نقائص کی خرابیاں ہیں۔" (ص:۱۳) اسی بنیاد پر وہ حاؔلی کی تنقید کو آج بھی اردو کی تنقید میں نہایت اہمیت دیتے ہیں۔ گو ہم تنقیدی اسلوب میں نقاد کے کردار اور ذہنیت جیسے عناصر کو خارج از بحث قرار نہیں دیتے لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ کیا یہی وہ اوصاف ہیں جو تنقیدی اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں؟ اور کسی بھی دوسرے عنصر کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا؟ وارث علوی کے متذکرہ بالا بیان سے بڑی حد تک متفق ہونے کے باوجود یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن وارث علوی ان کا جواب نہیں دیتے۔ خیر ہم بھی ابھی اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ ہمیں توفی الوقت وارث علوی کے حاؔلی اور حاؔلی کے "مقدمہ" سے ملنا ہے۔ اس لیے آیئے آگے بڑھتے ہیں۔

کسی بڑے فن پارے کی عظمت کا راز کیا ہوتا ہے؟ اس پر دنیائے ادب اور فن کے مفکرین کی بیسیوں بحثیں ملتی ہیں لیکن کسی بڑے تنقیدی ادب پارہ کی عظمت کس بات میں پوشیدہ ہے اس پر مباحث بہت کم پائے جاتے ہیں۔ وارث علوی اپنی تنقید میں اس معاملہ سے اکثر معاملہ کرتے ہیں اور بڑی فکر انگیز بحثیں اٹھاتے ہیں۔ حاؔلی کی تنقید اور ان کے "مقدمہ" کے حوالے سے بھی یہاں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ اس کے

بغیر وارث علوی کی اس تنقیدی کاوش کے کوئی معنی نہ رہتے۔ اردو میں حالی کی تنقید یا "مقدمۂ شعر و شاعری" کی عظمت کا راز کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وارث علوی لکھتے ہیں:

> "کسی بھی نقاد کی عظمت کا اندازہ محض ان تصورات کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا جو اس نے شاعری سے متعلق قائم کیے ہیں ۔۔۔ تنقید میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ نقاد نے مسائل پر سوچ بچار کیسے کیا ہے؟ اس کی تنقید شاعری کے بارے میں ہمیں کچھ نئی اور اہم باتیں بتاتی ہے یا نہیں؛ نقاد فکر کی نئی سرزمینوں کے انکشاف اور دریافت میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں؛ ادب کی سیاحت میں وہ جن تجربات سے گزرا ہے ان کی نوعیت کیا رہی ہے، اور ان تجربات سے وہ کس قسم کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ تنقید کی اہمیت دعوے کو ثابت کرنے میں نہیں بلکہ اسے explore کرنے میں ہے، کسی نظریے کو پیش کرنے میں نہیں بلکہ نظریے کی تشکیل کے پورے عمل کو پیش کرنے میں ہے۔ تنقید اس معنی میں دریافت، انکشاف اور جہانِ فکر کی سیاحی کا عمل ہے۔ 'مقدمہ شعر و شاعری' کی عظمت کا راز اسی نکتے میں پنہاں ہے کہ یہ نتائج نظریوں، فیصلوں اور رایوں سے بھری ہوئی کسی پروپیگنڈسٹ، پمفلٹ باز، مفتیِ عصر کی جھولی نہیں، بلکہ ایک شائستہ اور متجسس ذہن کی سیاحت اور ادب کی دستاویز ہے۔" (ص: ۱۵ تا ۱۶)

یہیں سے وارث علوی؛ حالی اور ترقی پسند تنقید کے فرق کی بحث اٹھاتے ہیں۔ عام تاثر تو یہی ہے کہ ترقی پسند تنقید کی بنیاد، حالی کے تصوراتِ نقد بنتے ہیں مگر وارث علوی اس سے کسی طور متفق نہیں۔ وہ نہ صرف ان دونوں تنقیدی نظاموں کو الگ الگ سمجھتے ہیں بلکہ حالی کے تصورات کو ترقی پسند تنقیدی تصورات سے کہیں زیادہ افضل گردانتے ہیں۔ اس ذیل میں حسبِ عادت وارث علوی شدت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ترقی پسند ادب اور تنقید سے متعلق تجزیاتی طریقِ نقد کی بجائے جذباتی بیانات سے کام لیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "ترقی پسند بھی حقیقت جیسی ہے ویسی پیش نہیں کرتے بلکہ اپنے انقلابی مقصد کے زیرِ اثر اس کی صورت مسخ کرتے ہیں۔" (ص: ۳۵) ابھی ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہی ہے کہ ان کا یہ بیان کہ "ایک نظر سے دیکھیے (ایک ہی نظر سے کیوں دیکھنا ضروری ہے؟) تو ترقی پسندوں نے بھی خیالات اور آدرشوں کے طوطا مینا ہی اڑائے ہیں، اور ان کے ادب میں بھی کوئی واقعیت اور اصلیت نہیں" (ص: ۳۵) ہمیں فوری احساس دلاتا ہے کہ وارث علوی کو اس وقت محض حالی کی حمایت مقصود ہے لہٰذا اس وقت وہ صرف حالی کا تجزیہ ہی کر سکتے ہیں، کسی اور

طرف وہ ہم دردی سے سوچنے کی پوزیشن میں نہیں۔ بہر حال ان کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ:

> ”ترقی پسندوں کے آدرش وادی اور سماجی ادب کے تصورات کا ان تصورات سے کچھ لینا دینا نہیں جو حالؔی کے تصورات رہے ہیں۔۔۔ حالؔی اور ترقی پسند ادیبوں میں ایک بھی چیز مشترک نہیں۔۔۔ حالؔی کا ادب کا تصور اتنا وسیع تھا کہ ترقی پسند اس کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔“ (ص: ۳۵، ۳۶ اور ۴۰)

ہمیں چوں کہ ترقی پسند تنقید اور حالؔی کے تصورات میں مناسبت تلاش کرنے کی کچھ زیادہ فکر نہیں، کیوں کہ ہمارا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ترقی پسند فکر کا کوئی نہ کوئی رشتہ حالؔی کے تصورات سے ہونا بہت ضروری ہے؟ اور یہ بھی کہ کیا اگر اردو کا کوئی تنقیدی دبستان حالؔی کے تنقیدی تصورات سے کوئی قدر مشترک نہ رکھتا ہو تو کیا اس کا وجود صرف اور صرف اس وجہ سے مشکوک ہو جائے گا؟ خیر فی الوقت یہ بحث ہمارا مطمحِ نظر نہیں۔ ابھی تو یہ دیکھنا مقصود ہے کہ وارث علوی کے نزدیک حالؔی کا ادب کا وسیع تصور کیا ہے؟ اس کے لیے انھوں نے حالؔی کے اس اقتباس کا حوالہ دیا ہے جس میں حالؔی نے لکھا ہے کہ ”نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے جا بجا مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے، اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ حالاں کہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع اور نا پیدا کنار میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعرا طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔“ (ص: ۶۸) یعنی شاعری میں حالؔی مضامین کے باب میں کسی حد بندی کے قائل نہیں تھے بلکہ تنوع پسند تھے اسی لیے وارث علوی ان کے تصورِ ادب کو وسیع قرار دیتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ بھی ہے کہ حالؔی کے ادب کے اس وسیع تصور کی بنیادیں کیا ہیں؟ اس ضمن میں وارث علوی لکھتے ہیں:

> ”مذہب، سیاست، سماج اور ادب کے متعلق حالؔی نے جو فیصلے کیے وہ خود ان کے اپنے تھے؛۔۔۔ حالؔی سمٹی سکڑی شخصیت کے مالک نہیں تھے کہ کسی ایک چیز کے ہو رہتے۔ ایک عظیم شخصیت کی مانند وہ زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کی ذات مذہب، سیاست، ادب، سماج، تہذیب، ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اور زندگی کے ان تمام شعبوں میں وہ نہایت انکسار اور نرم مزاجی سے، بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے، سرگرمِ عمل رہے۔ ایک نہایت ہی حوصلہ شکن اور تاریک دور میں وہ اپنی قوم اور اپنی تہذیب کے بکھرے اجزا کو سمیٹتے رہے؛ ٹوٹتی ہوئی روایتوں کو سنبھالتے ہوئے، نئی قدروں کا چیلنج قبول کرتے رہے۔ جب آدمی حالات کے مقابلے پر کمر بستہ ہوتا ہے،

> سرکتی ہوئی زمین پر قدم جمانے کی کوشش کرتا ہے، طوفانِ حوادث میں اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتا ہے، اور ایک قیامت خیز عبوری دور میں کچھ چیزوں کو بچانے اور کچھ چیزوں کو اپنانے کے لیے چند اہم اخلاقی فیصلے کرتا ہے، تب کہیں جا کر اس کی شخصیت میں وہ کلاسیکی حسن پیدا ہوتا ہے جو حالؔی کی شخصیت کو آج ہمارے لیے اتنا دل نواز بنائے ہوئے ہے۔" (ص:۳۶ تا ۳۷)

یہاں اگرچہ یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ حالؔی سے متعلق اس نتیجہ تک پہنچنے میں وارث علوی کے ہاں ترقی پسند تنقید کے مخالف نظریات کا کردار بہت اہم رہا ہے مگر اس کے باوجود ہم ان کے اس تجزیہ کو تنقید کا نشانہ اس لیے نہیں بنا سکتے کہ اپنی اصل میں یہ تجزیہ غلط نہیں۔

اردو مرثیہ، قصیدہ، مثنوی اور غزل پر حالؔی کے اعتراضات کا وارث علوی نے جو تجزیہ کیا ہے وہ اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس جہت سے کسی اور نقاد نے حالؔی کی تنقید کو سمجھنا چاہا ہی نہیں۔ ان کا موقف ہے کہ حالؔی کو مرثیہ کی اخلاقیات یا موضوع اور مواد پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اعتراض تھا تو مرثیہ کے فارم پر، جو چند ایسے نقائص کا شکار ہے کہ اس میں اعلیٰ یا بڑی شاعری ممکن ہی نہیں۔ اگر ہم فن میں موضوع یا مواد اور خیال کی ادائیگی میں فارم کی اہمیت کو سمجھتے ہوں تو حالؔی کا نقطۂ نظر بھی سمجھ آئے اور وارث علوی کے تجزیہ کی داد دینے کو بھی جی چاہے۔ اسی طرح مثنوی اور غزل کے ذیل میں حالؔی کی تنقید کا جواب بھی وارث علوی کے پاس بہت Valid ہے کہ حالؔی کو مثنوی یا غزل کے عشقیہ موضوعات پر اعتراض نہیں تھا، اعتراض تھا تو اس فنی پھوہڑ پن پر جو ابتذال کی حد تک جا پہنچا تھا۔ اور حالؔی جیسے کلاسیکی ذہن کے مالک نقاد کو فن کا ابتذال یا فنی خام کاری کبھی خوش نہیں آ سکتی۔ یہاں وارث علوی نے ایک بات انتہائی پتے کی، کی ہے جسے ان ناقدین کو ضرور سننا چاہیے جو حالؔی کے تصورِ عشق پر، ان کے غزل کے عشقیہ تصورات پر تنقید کی بنیاد پر معترض ہوتے ہیں۔ وارث علوی کہتے ہیں:

> "حالؔی کی یہ تنقید کلاسیکی بنیادوں پر شاعرانہ مذاق کی تخلیق کی طرف پہلا قدم ہے۔ عشق و محبت پر حالؔی نے جو کچھ کہا ہے اسے اسی context میں سمجھنا چاہیے۔ حالؔی اس عشق پر بات کر رہے ہیں جو غزل میں ہے، اس عشقیہ جذبے پر بات کر رہے ہیں جو غزل میں اظہار پاتا ہے، جس عشق کی وہ نکتہ چینی کر رہے ہیں وہ بھی وہی ہے جو غزل میں بیان ہوا ہے؛ اور عشق کی اس تنقید اور نکتہ چینی کو زندگی میں عشق کی مخالفت سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ (پھر یہ کہ) انہوں نے عشقیہ جذبے کو ختم کرنے کی بات نہیں کی

بلکہ اسے تہ دار، پہلو دار اور آفاقی بنانے کا مشورہ دیا۔"(ص: ۱۰۵ تا ۱۰۶ اور ۱۰۹)

حالؔی کو بالعموم ایک مذہبی آدمی سمجھا جاتا ہے لیکن کیا وہ ان معنوں میں مذہبی تھے جیسے کہ ایک ظاہر پرست مذہبی شخص ہوتا ہے جو عقائد پرستی اور ظواہر کی پابندی پر خوش ہو لیتا ہے؟ جو انسان کے باطن کو نہیں بس ظاہر کو بدل کر چین کی بانسری بجاتا ہے؟ وارث علوی نے حالؔی کے اس پہلو سے بھی بامعنی بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ حالؔی ایسے مذہبی آدمی نہیں تھے کہ انسان کے ہر مسئلے کا حل مذہب میں تلاش کریں بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان کے بہت سے اخلاقی، سماجی اور سیاسی مسائل کو انسانی سطح پر ہی حل کرنا پڑتا ہے۔ حالؔی کی یہی ذہنی اپروچ ہے جہاں ان کی "شخصیت ایک مذہبی آدمی کی شخصیت سے بلند ہو جاتی ہے۔"(ص: ۷۶) وہ انسان کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن محض انسان کے ظاہر کو نہیں، اس کے باطن کو بدلنے کی تدبیر کرتے ہیں یعنی انسانیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انسانیت؛ انسان کے باہر سے نہیں، اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ حالؔی کی اس خوبی کو وارث علوی ان الفاظ میں سراہتے ہیں جس سے کم سے کم ہمیں ضرور اتفاق ہے۔ لکھتے ہیں:

> "حالؔی سماجی اور انسانی مسائل پر غور کرتے وقت خالص مذہبی نقطۂ نظر نہیں اپناتے۔ سماجی مسائل کے وہ سماجی حل ہی تلاش کرتے ہیں اور انسانی مسائل کو وہ انسانی سطح پر سلجھاتے ہیں۔ وہ خود ایک خدا ترس مذہبی آدمی تھے، لیکن مذہب کو انہوں نے ایک آئیڈیالوجی میں نہیں بدلا۔ ایک ایسے سماج میں جس پر مذہب کا گہرا اثر ہو، ایک مذہبی آدمی کے لیے انسان کی انسانیت کو اس کے اعمال کی کسوٹی بنانا عدم مفاہمت کی طرف پہلا قدم ہے۔ انسانی شخصیت کی پرکھ کے لیے ایک ایسی اخلاقی کسوٹی کی تلاش جو مذہب کے خلاف نہ ہو لیکن خالصاً مذہبی بھی نہ ہو، حالؔی کے لیے ناگزیر تھی۔"(ص: ۷۷)

وارث علوی چوں کہ ادب پر آئیڈیالوجی اور نظریہ سازی کے اطلاق کو بہت برا عمل سمجھتے ہیں کیوں کہ وہ ادب کی آزادانہ پرکھ کے قائل ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ معیارات کی تشکیل کو غلط سمجھتے ہیں مگر معیارات کسی آئیڈیالوجی کا شاخسانہ ہوں تو انہیں گوارا نہیں۔ حالؔی کی تنقید کا یہ پہلو بھی ان کے لیے توجہ کا باعث بنتا ہے۔ ان کے خیال میں حالؔی نے محض ادب کی پرکھ کے لیے چند معیاروں کی تشکیل ضروری کی اور چند تصورات قائم کیے مگر کوئی نظریہ نہیں بنایا جس کی وجہ سے ان کی تنقید اکہرے پن کا شکار ہونے سے محفوظ رہی۔ اور اسی وجہ سے حالؔی ادب، سماج اور انسان کو ایک Totality میں دیکھ سکے۔

یہاں بہت سے سوال پیدا ہو سکتے ہیں اور وارث علوی کی یہ پوری کتاب جگہ جگہ ہمارے لیے سوال پیدا کرتی ہے۔ بہت سی باتوں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے، بہت سی باتیں ہماری تائید حاصل کرتی ہیں، کہ یہی وارث علوی کی تنقید کی اصل خوبی ہے۔ اگرچہ یہاں ہم وارث علوی سے اختلافی امور پر طول طویل بحث کرنے کا فی الوقت کوئی ارادہ نہیں رکھتے مگر حالؔی پر ان کی اس تحریر کے حوالے سے اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ انہوں نے حالؔی کی تنقید پر اب تک کی بہترین تنقید لکھ دی ہے مگر کیا انہوں نے حالؔی کی حمایت میں کہیں بھی غلو سے کام نہیں لیا؟ کیا بعض جگہوں پر حالؔی کو سر پہ اٹھانا محض اس لیے نہیں ہے کہ کچھ معاصر ناقدین کو نیچا دکھایا جا سکے؟ کم سے کم ہم اپنے مطالعے کی بنیاد پر ان سوالوں کا جواب نفی میں دینے سے قاصر ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر کہ وارث علوی نے حالؔی کی ناقدانہ حیثیت کو ثابت کرنے میں اپنا حق ادا کر دیا مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ ”دفاعی تنقید“ کی آخری حدوں کو چھو آئے ہیں، جو بہر حال ایک مثبت تنقیدی رویہ نہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر اب اردو میں حالؔی کے علاوہ کسی اور نقاد کو پڑھنا ہمیں ہماری حماقت لگنے لگی ہے۔ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ حالؔی اور دیگر اردو ناقدین (پتہ نہیں اس میں وارث علوی بھی شامل ہیں یا نہیں) میں وہی فرق ہے جو ایک پیغمبر اور فقیہوں میں ہوتا ہے۔ ”پیغمبر ذہنی بصیرت عطا کرتا ہے، فقیہ موشگافیوں میں الجھا کر ذہن کو تنگ، مزاج کو تند اور فکر کو پریشان کرتا ہے۔ پیغمبر آئیڈیا دیتا ہے، فقیہ اسے آئیڈیالوجی میں بدل دیتا ہے۔ حالؔی اور حالؔی کے بعد آنے والے ہمارے نقادوں میں یہی فرق ہے۔“(۱۲۶) اور یہ تاثر وارث علوی نے کتاب میں متعدد جگہوں پر ابھارا ہے۔ خیال یہ آتا ہے کہ آخر کلیم الدین احمد اور وارث علوی کے تنقیدی رویے میں کس قدر فرق ہوا؟ کلیم الدین احمد کا لب لباب جو سامنے آیا تھا اور ہمارا جو تاثر بنا تھا وہ یہ کہ کوئی اردو نقاد اس قابل نہیں کہ جس کا مطالعہ کیا جا سکے۔ وارث علوی کی اس تنقید سے صرف اتنا ہوا کہ اب اردو تنقید میں ایک حالؔی قابلِ مطالعہ ٹھہرے ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ کوئی ایسی تنقید جو قاری کے لیے کسی ایک نقاد یا ایک تخلیق کار کے علاوہ باقی سب کا مطالعہ فضول قرار دینے کا تاثر ابھارے، وہ تنقید اپنی Totality میں کہاں تک اہم ہو سکتی ہے؟

☆☆☆☆

عابد خورشید

الطاف حسین حالؔی کی یک کتابی طویل نظم

الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) کی یک کتابی طویل نظم ''مدوجزرِ اسلام' معروف بہ ''مسدس حالؔی'' پہلی بار ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ حالؔی کی زندگی میں یہ شہ پارہ گیارہ مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ زیرِ نظر ایڈیشن، تاج کمپنی لمٹیڈ، لاہور/کراچی نے شائع کیا، جس پر سن کا اندراج نہیں ہے۔ ۱۴۰۰ شعروں سے زائد اِس نظم میں غیر معمولی مظاہر پنہاں ہیں۔ آج طویل نظم جس مسند پر جلوہ افروز ہے، بلاشبہ اِس کا پہلا بھرپور اظہار ''مسدس حالؔی'' میں ہوتا ہے، اِسے ہم طویل نظم کی خشتِ اول بھی کہہ سکتے ہیں۔ حالؔی شاعری کی اِس طرز کے خود ہی موجد تھے۔ حالؔی کو اُردو ادب میں بہت سی اصناف کے تعارف کی اولیت حاصل ہے۔ محض یہ انفرادیت بھی اپنی جگہ ایک نشانِ امتیاز ہے، لیکن اِس طویل منظومے میں اُن کے ہاں 'اصلاح' سے زیادہ 'بیداری' کا عنصر نمایاں ہے۔ اصلاح غلطی کی ہوتی ہے اور بیداری کا تعلق خوابِ غفلت سے ہے۔

حالؔی کے سامنے اسلامی تاریخ کے اوراق بکھرے پڑے تھے، حالؔی نے اُنھیں ترتیب وار جوڑا، ماضی کو نہ صرف حال بلکہ مستقبل سے مربوط کیا۔ اقداری معیار کے اعلا منصب پر فائز ہونے کے باوجود، انکساری کی ایسی مجسم تصویر جس میں ناقدری کے شکوے ہیں نہ ہی خودستائشی کی کوئی جھلک، حالؔی کی شخصیت بذاتِ خود کسی شہ پارے سے کم دِکھائی نہیں دیتی۔ ''مسدس حالؔی'' خود حالؔی کے پاکیزہ اور زریں شخصی اوصاف کا پرتو ہے، جو پروردگار کا عطا کردہ ہے:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اِک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جُدا تھا
نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا

تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا [1]

حالؔی اگر مسلمانوں کی زبوں حالی پر فکرمند ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی فکر کو مہمیز یوں دی کہ اُنھیں عالمگیر شہرت سے نوازا۔ حالؔی نے اپنے استدلال سے اگر ایک سوئی ہوئی قوم کو غفلت کے احساس سے بیدار کیا تو خالقِ باری نے اُن کے اسلوب میں وہ گداز اور مٹھاس بھر دی جس کی حلاوت سے سماعتوں پہ پڑی گرد آنِ واحد میں چھٹ گئی۔ آنحضورؐ سے عقیدت کے دعوے ہر مسلمان کے دل میں بسے رہتے ہیں، لیکن ہر کسی کو حالؔی ایسا ظرف میسر نہیں آتا :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ [2]

حالؔی کے آنسو آنکھوں سے نکل کر زمین پر نہیں گرے بلکہ مدہوشی میں ڈوبے ہوئے اُن کند دماغوں پر پڑے جنھیں صدیوں کی غفلت نے زنگ آلود کردیا تھا، اور پھر یوں بھی جب بارش برستی تو انسان بھیگتے ہوئے خود بھی بارش کا حصہ بن جاتا ہے بالکل اسی طرح جس دروازہ پر بھی یہ دستک ہوئی اُس نے بے تابی سے اپنا در کھول دیا :

گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی
پڑی چار سو یک بیک دُھوم جس کی
کڑک اور دمک دُور دُور اُس کی پہنچی
جو ٹیکس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی [3]

حالؔی نے اُنگلی پکڑ کر مسلمانوں کو اُن کی گزشتہ تہذیبی و ثقافتی عظمت کے نشان دکھائے۔ ہاتھ رکھ کر بتایا کہ دیکھو تغیراتِ زمانہ نے اپنا کام کیا لیکن تمھاری غفلت نے تمھارے لیے اجنبیت پیدا کر دی ہے ، لیکن یہ دوری صرف اُس لمحے تک ہے جب تک تم اسے پہچان نہ لو گے۔ وہ استحصال اور تسلط کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے قائل تھے، بظاہر نظر آنے والی رکاوٹوں سے متصادم ہونے کے بجائے، خرابی کو تہ سے ختم کرنے کے قائل تھے:

وہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں [۴]

حالؔی کی زیرک نظری اور مشاہدہ اُن کی تخیلاتی حس کو متحرک رکھنے کا ایک سبب تھا۔ وہ وسیع المطالعہ شخص تھے، اُن کے متعلق یہ بے معنی بات ہے کہ وہ انگریزی زبان و ادب سے واقف نہیں تھے، اِس تاثر کو رد کرنے کے لیے اُن کی وہ نظمیں ہی کافی ہیں جو اُنھوں نے انگریزی سے ماخوذ کی ہیں۔ ہاں اُنھوں نے بلاوجہ حوالے نہیں دیے، جو اُن کا ایک فطری انداز تھا، اُن کا لسانی برتاؤ انجذاب کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے :

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ اُن میں پہلے تونگر
کمال اُن میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل اُن کی ہادی نہ دین اُن کا رہبر
نہ دُنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا [۵]

حالؔی نے جب ”مسدس حالؔی“ لکھی تو شاعری کے مزاج میں تبدیلی آ رہی تھی لیکن غزل سے نظم کے

اِس سفر میں ابھی نظم، غزل کے موضوعات اور غزل کی ڈکشن، لفظیات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی تھی۔ نظم اور غزل کے مصرع میں کوئی فرق نہیں تھا۔ تراکیب سازی، مشکل پسندی، قافیہ کا بے دریغ استعمال وغیرہ ایسی خوبیاں تھیں جو غزل سے وابستہ تھیں اور ان کا اثر نظم پر نمایاں تھا لیکن "مسدس حالؔی" کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ یہ شاعری کی ایک الگ صنف کی قرأت ہے۔ اِسے غزل کی طرح پڑھا نہیں جا سکتا:

اندھیرا تواریخ پہ چھا رہا تھا
ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
درایت کے سورج پہ اُمڈ آ رہا تھا
شہادت کا میدان دُھندلا رہا تھا
سرِ رہ چراغ اِک عرب نے جلایا
ہر اِک قافلہ کا نشاں جس سے پایا [۶]

حالؔی کا سنجیدہ اور حساس رویہ اُن کے تخلیقی مزاج کا آئینہ ہے۔ اُنھیں علمی فیوض سے رغبت نے اُن عوامل کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اُبھارا کہ جن کا تعلق اہلیت سے ہے، وہ جن سے مخاطب تھے اُن کی ناکسی کو بھی جانتے تھے کہ اہل ہونے کی خصوصیت حاصل کرنے سے حاصل ہوگی۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> "آج کی معاشرتی اُلجھنوں اور اَدب اور عوام کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کو دیکھتے ہوئے حالؔی کو دریافت کرنے اور حالؔی کے تناظر میں ان کی معنویت وافادیت کی شدید ضرورت ہے۔ ان کی شاعری کو نئے سرے سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے یقین ہے کہ موجودہ اَدب کے پراگندہ اور بے ہنگم شور وغل میں ان کی بامقصد اور پاکیزہ شاعری نشاط وانبساط، حرکت وحرارت بخشے گی۔" [۷]

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل
نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اُٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر [۸]

ظہیر ملک اپنے مضمون ''مسدسِ حالیؔ' کا تاریخی پس منظر'' میں لکھتے ہیں :

''حالیؔ نے مسدس میں ہر ایک طبقے کی تعلیمی، معاشی اور اخلاقی حقیقت حال کی واضح، مفصل تصویر کشی کی ہے۔ ان کے خیال میں ملت کی تنزلی کا سبب اس کے سربراہوں کی اجتماعی مفاد، فلاح و اصلاح کی طرف سے غیر دلچسپی اور بے رُخی تھا۔ تغیرات زمانہ سے پیدا ہوئیں نئی حقیقتوں کا تحقیق و اجتہاد کے ذریعے مقابلہ کرنے میں وہ ناکامیاب رہے۔''[۹]

اِن اشعار کو ملاحظہ کیجیے، جو محض کسی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے نہیں بلکہ اِن مصرعوں کے بطون میں جو عقیدت ہے، وہ ہر پڑھنے والے کے دل میں جاگزین ہو جاتی ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے[۱۰]

''مسدسِ حالیؔ'' میں جن شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں آنحضورؐ، آمنہؓ، آلِ عدنان، آلِ غالب، ابوبکر رازی، ارسطو، الپ ارسلاں، سقراط، بوجہل، بونصر، سام، سکندر، سلیمان، صاحبقرانی، ضحاک، طغرل، طوسی، فلاطون، فریدوں، ساسانی، جنید بغدادی، بازید، شامل ہیں نیز چند ایک مقامات میں ارم، ارمنی، بوقبیس، ٹیکس، زابلی، سمرقند، اندلس، سیلون، صور، صیدا، قلزم، کوفہ، کوہِ آدم، کے حوالے آئے ہیں۔ جو حالیؔ کے وسیع المطالعہ ہونے کے لیے بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ: مسدسِ حالیؔ لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، س ن، ص ۱۱
۲۔ ایضاً، ص ۱۵
۳۔ ایضاً، ص ۲۶

۴۔ ایضاً، ص ۵۲

۵۔ ایضاً، ص ۵۰

۶۔ ایضاً، ص ۳۲

۷۔ علی احمد فاطمی ’حالی کی معنویت‘ ”مسدس حالی کا تاریخی پس منظر ۱۸۷۱ء - ۱۹۸۲ء“ مشمولہ غالب نامہ (الطاف حسین
حالی نمبر) نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ۳۵۵۔۳۵۶

۸۔ مولانا الطاف حسین حالی: مسدسِ حالی لاہور: تاج کمپنی لمٹیڈ، س ن، ص ۶۹

۹۔ ظہیر ملک ’مسدس حالی کا تاریخی پس منظر ۱۸۷۱ء - ۱۹۸۲ء‘ مشمولہ غالب نامہ (الطاف حسین حالی نمبر) نئی دہلی:
غالب انسٹی ٹیوٹ، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ۳۰۴

۱۰۔ مولانا الطاف حسین حالی: مسدسِ حالی لاہور: تاج کمپنی لمٹیڈ، س ن، ص ۱۲۵

☆☆☆☆

کلیم احسان بٹ

عہدِ سرسید میں انگریزی اور حالیؔ کی مقدمہ شعر و شاعری

سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک سے قبل انگریزی تعلیم اور خیالات بالخصوص ہندوؤں میں پھیل چکے تھے۔ سرسید کو بھی اسی بات کا قلق تھا کہ مسلمان اگر تعلیم میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے تو آئندہ خوش حالی کی امید بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم اور خیالات سے آگاہی کی سرتوڑ مہم شروع کی۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کا کمال ہے کہ ان میں سے زیادہ تر خود انگریزی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ لیکن انگریزی خیالات کی ترسیل میں انہوں نے ازحد کاوشیں کیں۔ انہوں نے خود انگریزی زبان اور خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے متعدد ذرائع کا استعمال کیے۔ انگریزوں کی سرپرستی نے ان کے لیے یہ دشوار مرحلہ کسی حد تک آسان بھی کر دیا تھا۔

سرسید کا خلوص اپنی جگہ، اردو ادب کے ارتقا میں ان کا کردار اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزی خیالات کو اردو ادب میں سمونے کی جس روایت کا آغاز سرسید اور ان کے ساتھیوں نے کیا وہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اور اردو ادب کے تخلیقی سوتوں کو خشک کرنے میں اس روایت کا بہت بڑا کردار ہے۔ بالخصوص اردو ادب میں تنقید کی روایت انتہائی کمزور بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہماری تنقید کے کل سرمایہ کی مقدار کچھ زیادہ قابل فخر نہیں۔ مشاعروں کی داد و بیداد سے بڑھے تو تذکروں کی اندھی گلی میں ایسے پھنسے کہ نکات الشعرا سے لے کر آبِ حیات تک نکل آئے مگر راہ راست نہیں ملی۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے مقدمہ لکھا تو تنقید کے خدوخال کچھ نمایاں ہوئے اور اس میں بلوغت کے کچھ آثار نظر آئے۔ حالیؔ نے اس اندھی گلی سے نکلنے کے لیے انگریزی لالٹینوں کا سہارا لیا۔ مگر ہوا یہ کہ راستے تک پہنچ کر بھی ہم یہ لالٹینیں ہاتھ سے دینے کو تیار نہیں۔ اور آج تک ہماری تنقید مغرب زدہ اور مستعار خیالات کی جگالی پر مبنی ہے بس اتنا ہوا ہے کہ ہم اپنی مغرب نوازی میں کچھ ترقی کر گئے ہیں اور سارا زور اس دلیل پر صرف کر رہے ہیں کہ حالیؔ کو تو انگریزی آتی ہی نہ تھی اور انہوں نے جن انگریزی خیالات سے استفادہ کیا ہے وہ ہمیں بہتر معلوم ہیں اور حالیؔ نے ان خیالات کو سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری یہ دلیل بھی بودی ہے۔ حالیؔ ایم اے

انگریزی نہ سہی لیکن وہ انگریزی سے ایسے بھی ناواقف نہ تھے اور انگریزی خیالات کو سمجھنے میں جس قدر کاوش انہوں نے کی ہے آج کا نقاد اگر اتنی ہی کاوش حالؔی کو سمجھنے کے لیے کرتا تو حالؔی پر الزامات کی بارش نہ ہوتی۔ سرسید کے مقاصد کی تکمیل میں حالؔی بہت مدد و معاون ثابت ہوئے۔ مقدمہ میں انہوں نے جو انگریزی خیالات بیان کیے ان کی روشنی میں ان کی انگریزی دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کس قدر انگریزی اور انگریزی خیالات سے واقف تھے اس حوالے سے مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

”خواجہ الطاف حسین حالؔی ۱۸۳۷ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ایزد بخش تھا۔ نو برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی تربیت کا بوجھ ان کے بڑے بھائی اور بہن پر آپڑا۔ زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد انہوں نے رسمی تعلیم عربی اور فارسی کی شروع کی۔ ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ سترہ برس کی عمر میں ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی گئی۔ علم کے شوق میں ۱۸۵۴ میں گھر چھوڑ کر دلی چلے گئے اور یہاں مولوی نوازش علی سے ڈیڑھ برس تک عربی کی تعلیم حاصل کی۔ حالات انہیں واپس پانی پت لے گئے مگر تین چار سال بعد انہیں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت کا موقع ملا تو جہانگیر آباد جا پہنچے۔

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا، نواب صاحب کی صحبت، فارغ البالی کی زندگی۔۔۔ ان سب چیزوں نے پرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا۔ آپ اپنی شاعری اصلاح کے واسطے غالب کو بھیجنے لگے اور یوں مرزا غالب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ جہانگیر آباد میں آٹھ سال قیام کے بعد بسلسلہ روزگار لاہور پہنچے اور یہاں سررشتہ تعلیم میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی کتابوں کی عبارت کو دیکھنے اور اصلاح کرنے کی ملازمت مل گئی۔ لاہور میں کرنل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر ۱۸۷۴ میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔ یہاں چار برس گزارنے کے بعد دلی چلے گئے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی اور ان کے حلقے میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ سے سرسید کی وساطت سے حیدرآباد دکن پہنچے اور یہاں سے ملازمت سے دست کشی کے بعد واپس اپنے وطن پانی پت چلے گئے اور وہیں ۱۹۱۴ میں دارفانی سے کوچ کیا۔

ان کی نثری و شعری تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے:

تریاق مسموم مطبوعہ	۱۸۶۸
طبقات الارض	۱۸۷۴
مجالس النسا مطبوعہ	۱۸۷۴

حیات سعدی مطبوعہ ۱۸۸۶
مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ ۱۸۹۶
یادگار غالب مطبوعہ ۱۸۹۶
حیات جاوید مطبوعہ ۱۹۰۱
مثنویاں: مناظرہ تعصب و انصاف، رحم و انصاف، برکھارت، نشاط امید، حب وطن
مسدس حالؔی
شکوہ ہند
کلیات حالؔی
مناجات بیوہ، چپ کی داد
مراثی غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ
مجموعہ نظم حالؔی
مجموعہ نظم فارسی''(۱)

اس فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی کی ادبی زندگی کا شجر سرسید احمد خاں سے تعلق خاطر کے بعد تناور اور بارآور ہوتا ہے۔ ان کی زیادہ تر اور مقبول تر تصنیفات علی گڑھ سے تعلق کے بعد منصۂ شہود پر آئیں اور حقیقت یہ ہے سرسید کی علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو جو کچھ دیا اور جتنا کچھ دیا اس میں سے اگر حالؔی کی نظم و نثر کا سرمایا الگ کر لیا جائے تو باقی جو کچھ بچتا ہے وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ ہم اس پر وہی ناز کرسکیں جو آج ہم کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سرسید کے تمام ساتھیوں میں سے صرف حالؔی اپنے مزاج کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک کے مقاصد سے ہم آہنگ تھے۔ اس لیے سب سے مفید بھی وہی ثابت ہوئے۔

حالؔی ایک نقاد کا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ کہ ان کی شاعری سے بھی ناقدانہ خیالات کو یکجا کر کے ان کی تنقیدی افتاد کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ سوانح میں بھی ان کا موضوع شاعر اور ادیب ہیں اور سعدی، غالب اور سرسید کی سوانح میں کافی مواد ان عظیم ادبا و شعرا کی تخلیقات پر تنقیدی آرا وتجزیہ پر مشتمل ہے مگر ان کا تنقید میں اصل کارنامہ مقدمہ شعر و شاعری کو سمجھا جاتا ہے۔ عبدالشکور نے ''تنقیدی سرمایا اردو میں'' میں لکھا ہے

> ''حالؔی اغلبا اردو کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے فن تنقید پر انگریزی اور عربی سے مواد لے کر ایک جگہ جمع کیا۔''(۲)

سوال یہ ہے کہ عربی کی تعلیم کا ذکر تو حالؔی کے حالات میں ملتا ہے مگر انگریزی سے مواد حاصل کرنے

کے وہ کیونکر اہل ہوئے جبکہ ان کی انگریزی دانی کے بارے میں کوئی مستند ثبوت یا شہادت موجود نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

> ''مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا نہ ہو سکا''(۳)

ناظر کاکوروی نے حالی کے اپنے بیان کا حوالہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پانی پت میں تو انگریزی کو تعلیم سمجھا ہی نہیں جاتا تھا سو انگریزی تعلیم کے حصول کا امکان کہاں؟ فرماتے ہیں:

> ''انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔''(۴)

یہی وجہ ہے کہ یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ حالی نے اپنی تصنیفات میں جو انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں یا انگریزی خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے پس پردہ کون سے محرکات موجود ہیں۔ یہ سوال اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے کہ انگریزی خیالات کو سمجھنے میں انہوں نے کس قدر اہلیت کا ثبوت دیا یا کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

یہ سوال پہلی دفعہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ حالی کے تمام ناقدین نے اس طرف توجہ دی ہے۔ مگر جواب نامکمل، تشنہ یا سرسری ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی یہ سوال اٹھانے کے بعد کہ ''آخر وہ مغربی اثرات کیا تھے جن کے زیر اثر حالی نے نظام تنقید میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔''(۵) مندرجہ ذیل دعوے کرتے ہیں:

(پنجاب بک ڈپو کے) تراجم کے ذریعے بقول طاہر جمیل گولڈ سمتھ وغیرہ سے کچھ استفادہ کیا گیا۔(۶)

انہوں نے قدیم و جدید مغربی تنقید کا مطالعہ کیا۔(۷)

میکالے کو انہوں نے خاصا دیکھا تھا۔ اس کا اظہار ان کی دوسری تصانیف سے ہوتا ہے۔(۸)

جتنا گہرا اثر میکالے کے نظریات کا ہے اتنا گہرا اثر جانسن کا نہیں۔(۹)

حالی ورڈز ورتھ کی شاعری سے واقف تھے۔(۱۰)

مگر اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ آخر وہ ان سے خیالات سے واقف کیسے ہوئے۔ اور کب اور کہاں انہیں ان خیالات سے استفادہ کا موقع ملا۔ ڈاکٹر حسن ملک اختر نے بھی ورڈز ورتھ کے ساتھ ان کے مشترک پہلوؤں پر زور دیا ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ:

> ''حالی کا مقدمہ ہمیں ورڈز ورتھ کے مقدمے preface کی یاد دلاتا ہے۔ حالی

> اور ورڈز ورتھ میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں نے اپنی شاعری کی مدافعت میں مقدمہ لکھا۔ دونوں کی شاعری پر اوراس سے زیادہ نظریات شعر پر اعتراض کیے گئے۔ دونوں کے مخالف زمانے نے مٹادیے۔ مگر مقدمات اب بھی زندہ ہیں اور تاریخ تنقید میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ دونوں سادگی پسند ہیں اور نیچرل اسلوب چاہتے ہیں۔"(۱۱)

مگر ورڈز ورتھ سے وہ کہاں واقف ہوئے۔ اور ورڈز ورتھ کے خیالات سے استفادہ کا موقع انہیں کیسے ملا اس بارے میں ان کے پاس بھی کوئی جواب موجود نہیں۔ حاؔلی کی تنقید میں یہ انگریزی الفاظ وخیالات کہاں سے در آئے یہ مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ میرے خیال میں ضروری ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے حاؔلی کے عہد کے ہندوستان میں انگریزی ادب کے نفوذ واثرات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

انگریز ہندوستان میں گذشتہ کئی صدیوں سے موجود تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام تقریباً ۱۶۰۰ کے زمانہ میں عمل میں آیا۔ انگریز کاروباری مقاصد کے لیے عام ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ رابطے میں تھے اور ان میں برابر لین دین جاری تھا۔ جس طرح ہندو مسلم میل جول نے ایک نئی ثقافت اور زبان کو جنم دیا تھا اسی فارمولے پر ثقافت اور زبان میں تبدیلی کا عمل مسلسل وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ اور انگریزی الفاظ کثرت کے ساتھ اردو زبان میں شامل ہو رہے تھے۔ الفاظ اپنی تاریخ رکھتے ہیں اور خیال کا خارجی پیکر ہوتے ہیں۔ لامحالہ انگریزی الفاظ کے ساتھ انگریزی خیالات بھی معاشرے میں پھل پھول رہے تھے۔ انگریزوں کی سیاسی برتری سے یہ عمل تیز تر ہو گیا۔ حاؔلی کو جو زمانہ ورثے میں مل رہا تھا اس میں ایسے بہت سے افراد اور ادارے موجود تھے جو انگریزی خیالات کی تبلیغ واشاعت کا مرکز ومحور بن چکے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حاؔلی سرسید کے حلقہ میں شامل ہونے سے قبل شیفتہ کی صحبت اور غالب کی شاگردی سے فیضیاب ہو چکے تھے۔ وہ ناپختہ ذہن لے کر علی گڑھ کالج نہیں آئے تھے اور نہ بلا سوچے سمجھے سرسید کے حلقہ میں داخل ہوئے تھے۔ شیفتہ کی علم دوستی اور معتدل مزاجی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ غالب سرسید سے بھی قبل تبدیلی کے آثار کا ادراک کر چکے تھے اگر چہ وہ انگریز یا انگریزی سے اس طرح مرعوب نہیں تھے جس طرح سرسید اور ان کے ساتھی نظر آتے ہیں۔ غالب کے بہت سے انگریزوں کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے انگریز کی کوٹھیوں میں جاتے تھے انگریزی شراب پیتے تھے اور انگریز پسندی میں سرسید سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ انگریزوں سے باہم اختلاط سے انگریزی الفاظ کا اردو زبان میں استعمال تو عام ہونے لگا تھا۔ ان

الفاظ کو میر و سودا کی شاعری میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مگر غالب کے ہاں نثر میں تو انگریزی الفاظ نامعلوم انداز میں اس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ ان کا مطالعہ ہمیں حیران کر دیتا ہے۔ غالب کے ہاں انگریزی الفاظ کا نفوذ فطری ہے۔ اور غالب کی طرز زندگی اور جزئیات کے مطالعہ کے بعد اگر ہم ان کی نثر میں انگریزی الفاظ دیکھتے ہیں تو زیادہ تعجب نہیں ہوتا (۱۲)

غالب کی نثر میں انگریزی الفاظ کا نفوذ زبان کے فطری ارتقا کا معاملہ ہے مگر حالؔی کے عہد تک انگریزی الفاظ اور خیالات کے نفوذ کی پوری ایک تاریخ ہے۔ مختلف ادارے ان مقاصد کے لیے خود انگریزوں نے قائم کیے یا ان کی سرپرستی میں قائم ہوئے۔ ان اداروں میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، فورٹ ولیم کالج، دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی شامل ہیں۔

علمی سطح پر انگریزوں اور اردو زبان کے ماہرین کا پہلا باہم ربط فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰) میں پیدا ہوا۔ یہاں ایک انگریز جان گلکرائسٹ کی نگرانی میں ترجمہ نگاری کا کام ہوا۔ یہ تراجم انگریزی زبان سے تھے نہ انگریزی زبان میں تھے مگر اس کے باوجود حالؔی کے زمانے کو سمجھنے کے لیے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں اردو لکھنے والے انگریزوں کے منشائے تحریر سے واقف ہوتے ہیں اور ان کی ہدایت پر سادہ نویسی اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ سادہ نویسی سرسید کے زمانے میں سکہ رائج الوقت قرار پاتی ہے۔ رام بابو سکسینہ کے نزدیک جان گل کرائسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں مثلاً کپتان روبک، کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہیں۔ (۱۳)

انگریزی اور اردو کا دوسرا علمی ملاپ دہلی کالج (۱۸۲۵) میں ہوا۔ دلی کالج میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ دلی کالج کے زمانے میں سائنسی کتب کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس منصوبے کو عملی طور پر کامیاب بنانے کے لیے "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا۔

دلی کالج سے شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست میں سے مندرجہ ذیل کا تعلق ہمارے موضوع سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ گولڈ اسمتھ کا ذکر ہمیں مقدمہ شعر و شاعری میں بھی ملتا ہے۔

نام کتاب	**مترجم/مصنف**	**مطبع**	**سن اشاعت**	**صفحات**	
۱۔ تاریخ انگلستان	حسن علی خاں و پنڈت دھرم نرائن	دہلی			
۲۔ تاریخ روم	شیوا پرشاد و ڈاکٹر گولڈ اسمتھ	دہلی	۱۸۴۵	۳۴۰	
۳۔ تاریخ یونان	وزیر علی اور شیوا پرشاد و ڈاکٹر گولڈ اسمتھ	دہلی	۱۸۴۶	۴۰۳	(۱۴)

ڈاکٹر عبدالقیوم کے مطابق:

> ''دلی کالج انگلش انسٹی ٹیوٹ میں انگریزی کتابیں ترجمہ ہو رہی تھیں۔ گولڈ سمتھ کی traveler اور deserted village ملٹن کی فردوس گم گشتہ پوپ کا essay in man رچرڈسن کے انتخابات بیکن کی advancement of learning اور برک کے مضامین اور تقاریر یہاں کے نصاب میں شامل تھیں'' (۱۵)

ان تراجم میں جو اسلوب یا طریقہ اختیار کیا گیا وہ آزاد ترجمے کا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد اسی کالج کے تربیت یافتہ تھے اور دلی کالج کی نثری خدمات کو سمجھنے کے لیے ان کی تحریریں چراغ راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اردو نثر کی داستان میں ڈاکٹر طیبہ خاتون نے لکھا ہے کہ:

> ''لفظی ترجمہ سے زیادہ یہاں آزاد ترجمہ پر زور دیا گیا تا کہ متن اصل کے قریب ہونے کے ساتھ طلبا کے لیے آسان ہوں وہ ان میں اپنی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کر سکیں'' (۱۶)

۱۸۵۷ کے ہنگامے کے بعد انگریزی خیالات کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ اسلوب سے موضوع کی سطح تک انقلابی تبدیلیوں کے لیے زمین پہلے سے ہموار ہو چکی تھی۔ اب پیروی مغرب کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اردو نثر میں کافی ایسا سرمایہ جمع ہو چکا تھا جس کے ذریعے انگریزی خیالات تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی اس کے باوجود شرق و مغرب کی کشمکش کا عمل جاری تھا۔ سرسید احمد خاں کی مساعی سے اس کشمکش میں مغرب کا پلہ بھاری رہا۔ سید عبداللہ کے بقول تو ''مذہب، سیاست اور معاشرت کے ہر مسئلے میں سرسید پر کسی وکٹورین صاحب قلم اور صاحب فکر کا دھوکہ ہوتا ہے۔'' (۱۷) سرسید نے اس طرز فکر کو مقبول عام بنانے اور اردو دان طبقہ میں عام کرنے کے لیے انتھک کوشش کی۔ اس کوشش میں ان کو بہت سے الزامات کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر اس امر کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ سید عبداللہ نے لکھا ہے۔

> ''سرسید کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس دور میں ان کی طبیعت میں ایک طرح کا تشدد نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے ان کے لہجے میں نرمی اور ملائمت تھی اب وہ اظہار خیال میں نڈر اور بے خوف معلوم ہوتے ہیں۔ اور پبلک کی مخالفت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔'' (۱۸)

سرسید نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے غازی پور میں قیام کے دوران میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ اس کے زیر اہتمام تراجم کا کام بہت سرگرمی سے ہوا اور محض ایک سال کی قلیل مدت میں آٹھ کتابوں کے تراجم سرسید احمد خاں کے نجی چھاپہ خانہ سے چھپ کر شائع ہوئے۔ (۱۹)

طیبہ خاتون کے الفاظ میں:

> ''دہلی کالج میں جن چیزوں کی ابتدا ہوئی علی گڑھ تحریک کے تحت ان کی توسیع ہوئی۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ مصنفین کی خصوصیات ان کے اسالیب کا تنوع، حقیقت پسندی، مقصدیت، افادیت اور نقطہ نظر کی اہمیت رہی تھی۔ ان سب کی داغ بیل تو دہلی کالج میں پڑ چکی تھی لیکن ان میں مسلسل تجربات و روایات کا خزانہ علی گڑھ تحریک کے ہاتھوں میسر آیا۔'' (۲۰)

ان اداروں سے ہٹ کر سرکاری اور نجی سطح پر بھی تراجم کا کام جاری تھا۔ طارق محمود نے لکھا ہے کہ ''اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کر کے دیسی زبان کو رائج کرنے کا فیصلہ ۲۰ نومبر ۱۸۳۷ کو کیا تھا لیکن اردو زبان میں قانونی موضوعات کے تراجم اس سے بہت پہلے شروع ہو گئے تھے۔'' (۲۱) اس عمل نے ترجمہ نگاری کی ایک لہر عام کرنے میں اور انگریزی خیالات کی معاشرتی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔

گولڈسمتھ کی The Vicar of Wakefield کا ہندوستانی ترجمہ J.Shakespear کے ہندوستانی ایڈیشن میں شائع ہوا۔ (۲۲) انگریزی شاعر gray کے افسانوں کا ترجمہ جس کا عنوان احسن المواعظ ہے اور انگریزی جسے کا نام Fables by the late Mr Gray with a translation into urdu poetry ہے کلکتہ سے ۱۸۳۶ میں شائع ہوئی اس میں انگریزی کے ساتھ اردو منظوم کہانیاں بھی شامل ہیں اور انگریزی شعر کے مقابلے میں ایک اردو شعر لکھا گیا ہے اور ہر کالم میں انگریزی اردو دونوں شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مترجم نے ایک اردو دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں ترجمہ کرنے کے اسباب اور طریقہ پر روشنی ڈالی ہے۔ نظام الدین منشی نے انگریزی کہانی Henery and his bearer اور The Lady and her Ayah کا اردو میں ترجمہ کیا۔۔۔ شیکسپیئر کا Merchant of Veinc کا اردو ترجمہ ہرچند گھوش نے (تاریخ ہندوستانی۔ اردو ترجمہ غیر مطبوعہ) (۲۳)

> اس کے علاوہ مشرقی شاعری کے نقائص اور مغربی شاعری کی خوبیوں کے اجاگر کرنے کی رو علمی و صحافتی حلقوں میں پھیل چکی تھی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم کے مطابق ''گارساں دتاسی نے اپنے ۱۸۷۲ اور ۱۸۷۳ کے خطبات میں جستہ جستہ اخبارات سے عبارتیں نقل کی ہیں اور بعض نامہ نگاروں اور ایڈیٹروں کی رائے لکھی ہے۔ جس میں مشرقی شاعری کے نقائص بیان کیے گئے ہیں اور تقلید کو ترک کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ نیز

> انگریزی ادب کی خوبیاں بتائی گئی ہیں۔ اس طرح کے مشورے ذہنی رجحان بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔" (۴۴)

سرسید اور ان کے تمام ساتھیوں میں انگریز سے مرعوبیت کا عنصر مشترک ہے۔ اس مرعوبیت کی نوعیت ذاتی تھی یا یہ سرسید کے توسط سے آئی تھی یہ ایک الگ معاملہ ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے تمام مصنفین نے اپنی نثر میں انگریزی الفاظ اور خیالات کا جا و بے جا استعمال کیا ہے حالانکہ سرسید سمیت ان میں سے بیشتر انگریزی زبان لکھنے اور پڑھنے سے قاصر تھے۔ سرسید کی نثر میں انگریزی الفاظ کا بے محابا استعمال ایک عیب بن گیا ہے۔ سرسید کے ساتھیوں کی نثر میں بھی انگریزی الفاظ و خیالات کا استعمال عام ہے۔ اور حالیؔ کو اس سلسلے میں کوئی استثنیٰ حاصل نہیں۔ اگرچہ حالیؔ کے اعتدال نے ان کو انتہا پسندی سے روکے رکھا مگر اس کے باوجود ان کے ہاں انگریزی الفاظ اور خیالات تکرار کے ساتھ ملتے ہیں۔

گذشتہ صفحات میں بیان کیے گئے پس منظر میں دیکھیں تو انگریزی خیالات تک رسائی کے لیے ان کے پاس کئی مواقع موجود تھے۔ ان کی زندگی کا سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ علم کے حصول کی لگن میں تمام عمر سرگرداں رہے۔ گھربار چھوڑا۔ کبھی عظیم آباد، کبھی دلی اور کبھی لاہور۔ تمام عمر مطالعہ اور تصنیف و تالیف ہی آپ کا مرغوب مشغلہ رہے۔

حالیؔ جب شیفتہ کے پاس مقیم تھے تو ان کو مطالعہ کا کافی موقع ملا۔ ناظر کاکوروی نے لکھا ہے کہ:

> "دن کو ۱۱ بجے تک اور سہ پہر کو تھوڑی دیر عصر کے بعد اور شب کے اکثر ابتدائی اوقات حالیؔ شیفتہ کی علمی و رنگین اور پر کیف صحبت میں گزارا کرتے تھے۔ صبح حالیؔ کتب خانہ چلے جاتے تھے اس کتب خانہ سے حالیؔ کو بے حد فائدہ ہوا اور اسی دوران شیفتہ کے نو تالیف تذکروں کے مسودات کو دیکھا اور جا بجا معقول اصلاح کی۔" (۴۵)

شیفتہ اپنے زمانے کے صاحب مرتبہ اور معزز شخص تھے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے کتب خانے میں وہ تمام کتابیں پہنچتی ہوں گی جن کی اشاعت ان زمانوں میں ہوتی رہی۔ شیفتہ کے کتب خانے میں اغلب امکان ہے کہ اس عہد کی وہ تمام ترجمہ شدہ کتابیں بھی ہوں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔

اسی طرح حالیؔ جب علی گڑھ میں سرسید کے پاس مقیم تھے تو وہ وہاں سرسید کی لائبریری سے بھی مستفید ہوتے رہے۔ بقول ناظر کاکوروی:

> "علی گڑھ میں سید احمد کے کتب خانہ میں بہترین عبرانی عربی اور فارسی مخطوطات کے مطالعہ کا بھی حالیؔ کو سکون سے موقع ملا۔ یہ کتب خانہ اپنی نوعیت کا نرالا تھا اور یہیں حالیؔ

> نے ان انگریز اساتذہ سے بھی تعلقات پیدا کیے جو مدرسۃ العلوم میں موجود تھے یا برطانوی نقطۂ نظر کی تبلیغ کے لیے اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے۔"(۲۶)

اور یہ ممکن نہیں کہ سرسید کی لائبریری میں وہ تمام کتابیں موجود نہ ہوں۔ جو اس زمانے میں انگریزی خیالات سے آشنائی کے لیے ضروری خیال کی جا سکتی ہیں۔ خود سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی ترجمہ شدہ کتابیں بھی وہاں ضرور موجود ہوں گی۔ حالؔی حسب ضرورت جن کتابوں سے استفادہ کے خواہش مند ہوں وہ ان کو وہاں ضرور دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ناظر نے لکھا ہے کہ:

> "سید احمد کے نام جو رسائل و کتابیں ولایت سے آتی تھیں ان کو بھی دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا اور جو چیز سمجھ میں نہ آتی تھی تو بے تکلف انگریز اساتذہ سے دریافت کر لیا کرتے تھے۔"(۲۷)

ڈاکٹر عبدالقیوم نے خواجہ تصدق حسین کے نام ۱۸۹۰ کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے(۲۸)

> "حالؔی انگریزی کتابوں کے تراجم پڑھتے تھے۔ اور انگریزی کتابوں کے تراجم فرمائش کر کے منگواتے تھے۔"(۲۹)

میرے خیال میں اسے محض قیاس آرائی نہیں کہا جا سکتا کہ حالؔی اپنے زمانے کی زیادہ تر ترجمہ شدہ کتابوں سے واقف تھے اور انہوں نے حتی الامکان ان کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لیے ان کے عہد تک جس قدر انگریزی خیالات ہندوستان تک پہنچے تھے وہ ان سے کما حقہ آگاہ تھے۔ یہ خیالات علی گڑھ کالج کے طلبا کے ذریعے بھی ان تک پہنچتے تھے۔ (۳۰) سرسید احمد خان کے صاحبزادے سید محمود کے ذریعے بھی (۳۱) اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے سرسید کے پاس آنے والے انگریز اساتذہ کے ذریعے بھی۔ ناظر کاکوروی نے لکھا ہے کہ:

> "حالؔی نے یہاں (علی گڑھ) قیام کے دوران میں انگریزی ادب کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں پروفیسر آرنلڈ نے ان کی مناسب رہنمائی بھی کی۔"(۳۲)

سید احمد کے دولت کدہ پر قیام کی بنا پر اکثر بڑی اور اہم شخصیتوں سے حالؔی کے تعلقات شروع ہوئے "مشہور ادیب سر والٹر ریلے سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جن کے مشورہ سے ملٹن، بائرن، شیکسپئر، کیٹس، شیلے، ورڈز ورتھ کے حالات پڑھے اور ان کے کلام پر غور و خوض کا بھی موقع ملا۔"(۳۳) لاہور میں ایک عربی کتاب جو جیولوجی طبقات الارض پر تھی اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ

کے پنجاب یونیورسٹی کو دیے چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کیا۔ (۴۴)

ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النسا لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے ۴۰۰ روپیہ کا انعام دلوایا تھا (۴۵)

انگریزی خیالات تک رسائی میں حالؔی کے لاہور کے قیام کا زمانہ بھی اہم ہے۔ ناظر کاکوروی نے حالؔی کی زبانی لکھا ہے

> ''پنجاب بک ڈپو میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت مجھ کو درست کرنے کو ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی۔'' (۴۶)

حالؔی کا گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت کے دوران میں کام ان انگریزی کتابوں کے تراجم کی اصلاح تھا جو گورنمنٹ کالج کے نصاب کے لیے تیار ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم کا کہنا درست ہے کہ ''یہ بات تاریکی میں ہے کہ پنجاب بک ڈپو نے کس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا'' (۴۷) مگر بہت سے ناقدین نے اسی زمانے کو حالؔی کے خیالات میں انقلاب کا زمانہ تصور کیا ہے مگر یہ درست نہیں اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حالؔی کی زندگی میں انگریزی خیالات سے آگاہی کا عمل ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے۔ معین احسن جذبی نے بھی حالؔی کا سیاسی شعور میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ جب:

> ''۱۸۷۲ میں حالؔی کو ملازمت کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔ یہاں وہ ترجموں کے ذریعے انگریزی ادب سے روشناس ہوئے اور یہیں ان کے شعر و ادب کے قدیم مذاق و تصور میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ (۴۸)

اگر پنجاب بک ڈپو کی شائع شدہ کتابوں کی فہرست دستیاب ہو جائے تو زیادہ بہتر طور پر حالؔی کی انگریزی خیالات سے شناسائی پر روشنی پڑ سکتی ہے تاہم حقیقت یہی ہے کہ:

> ''ناظر ادبی کے عہدہ پر فائز ہو کر حالؔی نے اکثر انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو دیکھا اور ان پر نظر ثانی بھی کی۔ اب حالؔی کی زندگی کا رخ ناقدانہ حیثیت سے پلٹا۔ اس عہدہ پر وہ چار برس (۱۸۷۴) تک رہے۔ اب انگریزی تعلیم کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور حالؔی نے اس کمی کو پورا کیا۔ انگریزی ناقدین کے شہ پارے دیکھنے کے بعد

ان کو رسمیہ نظریہ شعری میں مناسب ترمیموں کا موقع مل گیا۔" (۳۹)

اب گذشتہ سطور کی روشنی میں حالؔی کی مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کریں تو میرے خیال میں حالؔی پر الزام تراشی اور دشنہ طرازی کا سلسلہ لایعنی معلوم ہوتا ہے حالؔی نے مقدمہ شعر و شاعری میں جو انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں ان کی ایک سرسری فہرست ملاحظہ فرمائیں۔

سوسائٹی (Society)، میجک لیٹرن (Magic Laterin)، پولیٹیکل (Political)، پوئٹری (Poetry)، پارلیمنٹ (Parliament)،، ڈریمیٹک پوئٹری (Dramatic Poerty)، سوشل (Social)، سولزیشن (Civilization)، نیچر (Nature), امیجینیشن (Imaginaton)، کانسٹیٹیوشن (Constitution) لٹریچر (Literature)، نیچرل (Natural)، ڈکشنری (Dictionary)، ورس (Verse)، بلینک ورس (Blank Verse)، سمپل (Simple)، سیلف ہلپ (Self Help)، گریمر (Grammar) سیکنڈ نیچر (Second Nature)، ان نیچرل (Un natural) کلاسیکل (Classical) لٹریری (Literary)،، نوول (Novel)، ڈراما (Drama) انٹروڈیوس (Introduce)، پبلک (Public) لائف (Life)، ایشیاٹک پوئٹری (Asiatic Poerty) ڈسپاٹک گورنمنٹ (Despotic Government) پوئنٹ (Point) سوپر نیچرل (Super Natural) ام مورل (Immoral)، سین (Scene) مورل (Moral)

ان میں سے کچھ الفاظ حالؔی نے محض ایک آدھ دفعہ استعمال کیے ہیں۔ اور کچھ الفاظ بہ تکرار۔ سب سے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ میں نیچرل اور لٹریچر وغیرہ شامل ہیں۔ بہت کم الفاظ ایسے ہیں جو زبان کی روانی میں رکاوٹ ڈالتے ہوں یا محل استعمال کے لحاظ سے نامانوس محسوس ہوتے ہوں لیکن چند ایک کے سوا شاید ایسا کوئی لفظ نہیں جس کا متبادل اردو میں موجود نہ ہو بلکہ خود حالؔی نے وہ متبادل الفاظ اپنی نثر میں استعمال بھی کیے ہیں اس لیے کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی کہ یہاں ان الفاظ کی جگہ انگریزی الفاظ کیوں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حالؔی کی نثر کہیں بھی ان الفاظ کی وجہ سے گراں نہیں ہو پائی اور جس طرح انگریزی الفاظ سرسید کی نثر میں روڑے اٹکاتے ہیں حالؔی کی نثر میں ایسا کوئی منظر دیکھنے کو نہیں ملتا۔

حالؔی اصولی طور پر زبانوں کے ایک دوسرے سے الفاظ لینے کے عمل کو سراہتے ہیں اور اس خیال کے حامی ہیں کہ الفاظ اپنی زبان کے مزاج میں ڈھال کر قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ خود انگریزی زبان ایسے الفاظ سے بھری پڑی ہے۔ انہوں نے ایسے انگریزی الفاظ کی ایک فہرست بھی دی ہے جو دراصل عربی یا

فارسی زبان کے الفاظ ہیں لیکن انگریزی میں مستعمل ہیں۔ لیکن کسی لفظ کو اس کی اصلی صورت پر قائم نہیں رکھا گیا۔ (۴۰)

مقدمہ شعر و شاعری میں کئی مقامات پر انگریزی ملکوں اور شہروں کے نام بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً یورپ، ایتھنز، سگارا، جزیرہ سلیمس، ویلز، فرانس، اٹلی، آسٹریا، ڈنمارک، پیرس، مارسیلز، ٹورنٹو، ویمبار وغیرہ۔ ان مقامات اور ان کے بارے میں واقعات صاف ظاہر ہے کہ تاریخ کی کتابوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ اور حالؔی کے زمانے میں تاریخ یونان، تاریخ روما اور تاریخ انگلستان وغیرہ شائع ہو چکی تھیں۔ حالؔی نے بالضرور ان کا مطالعہ کیا ہے اور اس معاملے میں ان سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی نہ کسی نقاد نے ان واقعات کی صحت سے انکار کیا ہے۔

حالؔی کے مقدمہ میں کچھ مغربی مصنفین، انگریزی کتابوں، نظموں یا اقتباسات کے حوالے بھی موجود ہیں۔ مثلاً مصنفوں میں افلاطون، بائرن، سولن، ایڈورڈ، شیکسپیئر، گولڈ سمتھ، لارڈ میکالے، سر والٹر سکوٹ، ورجل ارسطو (شاعر)، ملٹن، ہومر، سفوکلیز، پنڈار وغیرہ کے نام موجود ہیں۔ سب سے زیادہ ذکر ملٹن کا ملتا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری کے ابتدائی صفحات میں افلاطون کی خیالی ریاست کا ذکر ملتا ہے۔ حالؔی لکھتے ہیں:

> ”افلاطون نے جو یونان کے لیے جمہوری سلطنت کا خیالی ڈھانچہ بنایا تھا اس میں شاعر کے سوا ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی تھی“ (۴۱)

افلاطون کے شاعری کے بارے میں خیالات سے اب ہم آگاہ ہیں اور ہمیں حالؔی کے بیان کی تصدیق میں اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بائرن کی نسبت مقدمہ میں تحریر ہے کہ:

> ”لوگ اس کی تصویر نہایت شوق سے خریدتے تھے۔ اور اس کی نشانیاں اور یادگاریں بینت بینت کر رکھتے تھے۔ اس کے اشعار حفظ کرتے تھے۔ اور ویسے ہی اشعار کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ خود بھی ویسے ہی دکھائی دینے لگیں۔ اکثر لوگ آئینہ سامنے رکھ کر مشق کیا کرتے تھے کہ اوپر کے ہونٹ اور پیشانی پر ایسی ہی شکن ڈالیں جیسی کہ لارڈ بائرن کی بعض تصویروں میں پائی جاتی ہے۔ بعضوں نے اس کی ریس سے گلوبند باندھنا چھوڑ دیا تھا۔“ (۴۲)

یہ بھی امر واقعی ہے اور حالؔی کی معلومات میں کسی قسم کی کوتاہی یا خرابی موجود نہیں۔ اسی طرح ورجل کے بارے میں مقدمہ میں مرقوم ہے:

> ”روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو وہ اپنے اشعار لکھواتا تھا اور

> دن بھر ان پر غور کرتا تھا۔ اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہا کرتا تھا کہ ''ریچھنی بھی اسی
> طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے'' (۴۳)

میرے خیال میں ان واقعات کے جاننے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ نے افلاطون، بائرن یا ورجل کو پڑھا ہو۔ یہ واقعات تاریخ کی کتابوں میں بھی رقم ہیں اور یاد رہے کہ یونان، روم اور انگلستان کی تاریخوں کے تراجم حالی کے زمانے تک چھپ چکے تھے اور ان کی دسترس میں بھی تھے۔ شیکسپیئر کے باب میں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انیسویں صدی میں ان کے تقریباً تمام تر ڈرامے ترجمہ ہو چکے تھے۔ اور ان میں سے بہت سے ڈرامے حالی کی مقدمہ شعر و شاعری کے زمانے سے قبل بھی ترجمہ ہو چکے تھے۔ جن کی تفصیل مرزا حامد بیگ کی کتاب مغرب سے نثری تراجم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۴۴)

اتنے زیادہ تراجم کی موجودگی میں یہ سمجھنا کہ ان میں سے کسی تک حالی کی رسائی نہ ہوگی نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ''بچوں کا شیکسپیئر'' کے نام سے پنجاب بک ڈپو نے بھی ایک کتاب چھاپی تھی جس میں بچوں کے لیے شیکسپیئر کے اہم ڈراموں کے اقتباسات ترجمہ کیے گئے تھے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پنجاب بک ڈپو میں حالی ان تراجم کی زبان کی اصلاح کی ملازمت پر مامور رہے ہیں۔

گولڈ سمتھ کی کتابیں اور خطوط بھی حالی کے عہد تک ترجمہ ہو چکے تھے۔ ان کا ذکر دلی کالج اور دیگر ترجمہ شدہ کتابوں کے باب میں پہلے ہو چکا ہے۔ امکان غالب ہے کہ حالی نے گولڈ سمتھ کا براہ راست یا کم از کم ترجمہ کے ذریعے ضرور مطالعہ کیا ہے۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں گولڈ سمتھ کی ایک نظم کا حوالہ دیا ہے جس میں اس نے اپنی نظم سے خطاب کیا ہے۔ (۴۵) حالی نے بھی اسی انداز سے ایک نظم کہی ہے۔ جس میں شعر سے مخاطب ہوئے ہیں۔

شعر کی طرف خطاب

اے شعر دل فریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپے کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو

اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنے بچ سے کیے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو

جو نا بلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہ راست پہ تو جبکہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو، لے نکل
بیڑوں کے ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جو قدر داں ہو اپنا، اسے مغتنم سمجھ
حالؔی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو (۴۶)

انگریزی شعروادب کے بارے میں بسا اوقات حالؔی کی معلومات براہ راست نہیں مثلاً مقدمہ شعرو شاعری کے صفحہ چالیس پر مرقوم ہے:

> ”وہ (لارڈ میکالے) کہتے ہیں کہ شاعری“ جیسا کہ دو ہزار سال پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصور، بت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعری کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعری کل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر اور ڈیلٹی جیسے صناع بھی ان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا ٹھیک اور صحیح نقشہ نہیں اتار سکتے جیسا کہ موقلم اور چھینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اترتا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی مصوری اور ناٹک تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اس کے لیے الفاظ مہیا کر دیے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے۔ اس کو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔“ (۴۷)

اس اقتباس میں شاعری کے بارے میں ارسطو کے خیالات کو میکالے کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ اقتباس میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں وہ ارسطو کی کتاب بوطیقا سے ماخوذ ہیں۔ مگر حالؔی نے چونکہ انہیں میکالے کی تحریروں میں پڑھا ہے اس لیے انہوں نے میکالے کے حوالے سے ہی پیش کر دیے ہیں۔

بعض اوقات حالؔی کسی نقاد یا محقق کا نام لیے بغیر حوالہ دیتے ہیں۔ ایک نقاد کا کہنا ہے، یورپ کا ایک محقق کہتا ہے۔ اس طرح یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حالؔی نے یہ خیال کہاں سے اخذ کیا ہے اور ان کی معلومات کہاں تک درست ہیں۔ مثال کے طور پر:

> ”یورپ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ اگر چہ وزن پر شعر کا انحصار نہیں ہے اور ابتدا میں وہ مدتوں اس زیور سے معطل رہا ہے مگر وزن سے بلاشبہ اس کا اثر زیادہ تیز اور اس کا منتر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے“(۴۸)

> ”زمانہ حال کے محقق ۔۔۔ شعر کا براہ راست کام یہ ہے کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کر دے عام اس سے کہ حکمت کا کوئی مقصد اس سے حاصل ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ نظم میں ہو یا نثر میں(۴۹)

یہ بیانات شاید کولرج سے ماخوذ ہیں مگر حاؔلی نے انہیں کہاں سے حاصل کیا۔ یہ معلوم کرنا دشوار ہے۔ جب تک ان تمام ترجمہ شدہ کتابوں تک رسائی نہ ہو اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کیا جائے جو حاؔلی کے زیر مطالعہ رہی ہیں یا زیر مطالعہ رہنے کا امکان ہے۔

حاؔلی پر سب سے زیادہ اعتراضات شعر کی خوبیوں کے بیان سے ہوئے ہیں۔ حاؔلی لکھتے ہیں:

> ”ملٹن کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔“(۵۰)

اس حوالے سے کچھ اعتراضات معقول بھی ہیں۔ جیسے ملٹن کا انگریزی تنقید میں وہ مرتبہ اور مقام نہیں کہ اس کا حوالہ بطور سند استعمال ہو سکے؛ حاؔلی نے ترجمہ کرنے میں خطا کھائی ہے اور اس تعریف میں وہ ملٹن کے مدعا سے بھی بہت دور جا نکلے ہیں۔ حاؔلی نے اس باب میں جو توضیحات کی ہیں وہ ملٹن کا مدعا رہی ہوں یا نہ رہی ہوں ان کی قدر و قیمت کم نہیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے آپ جس چیز کو چاہیں مبہم بنا سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں بھی انگریزی تو دور کی بات خود اردو کی تحریروں کی وضاحت میں عالموں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ (۵۱) حقیقت یہ ہے کہ حاؔلی نے نہ صرف اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز کیا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے ”انگریزی مصنفین سے بہت سا مواد حاصل کیا ہے لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے اردو اور فارسی میں اس فن پر بہت کم لکھا گیا تھا بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ ہندوستان اور ایران میں یہ فن کوئی جداگانہ فن سمجھا ہی نہیں گیا“ (۵۲) اس لیے انہوں نے انگریزی مصنفین کا بہت محنت اور خلوص کے ساتھ مطالعہ کیا۔ چونکہ وہ انگریزی زبان پر عبور نہیں رکھتے تھے اس لیے انہیں تراجم پر انحصار کرنا پڑا اور انگریزی تحریروں کو سمجھنے کے لیے مختلف لوگوں سے مدد حاصل کرنا پڑی۔ اسی دشواری کے باعث انہوں نے مولوی عبدالحق کے بقول انگریزی زبان ”ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا نہ ہو سکا لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے“ (۵۳) یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد کو حاؔلی پر تمام تر

اعتراضات کے باوجود یہ بات تسلیم کرنا پڑی کہ:

> ”افسوس کی بات ہے کہ آج جب لکھنے والوں کا مطمع نظر حالی کی طرح محدود نہیں؛ جب وہ بہترین مغربی ادب، تنقیدی ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی نے بھی ”مقدمہ شعر و شاعری“ سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا۔“ (۵۴)

حواشی و تعلیقات

۱۔ یہ معلومات رام بابو سکسینہ کی کتاب تاریخ ادب اردو (ت۔ مرزا محمد عسکری) مطبوعہ سنگ میل پبلی کشنز لاہور کے ایڈیشن ۲۰۰۴ کے صفحات ۲۹۸ تا ۳۰۲ سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ عبدالشکور پرنسپل۔ تنقیدی سرمایہ اردو میں۔ الہ آباد۔ کتاب محل۔ ۱۹۴۶۔ ص ۶۷

۳۔ عبدالحق مولوی۔ چند ہم عصر۔ کراچی۔ اردو اکیڈمی سندھ۔ ۱۹۷۰۔ ص ۱۸۰

۴۔ ناظر کاکوروی۔ حالی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ۱۹۵۹۔ ص ۱۷

۵۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی۔ لاہور۔ دارالادب لاہور۔ س۔ ن۔ ص ۶۳

۶۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی۔ ص ۳۳

۷۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی۔ ص ۴۶

۸۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی۔ ص ۶۵

۹۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی۔ ص ۶۵

۱۰۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی ط۔ ص ۶۶

۱۱۔ حسن اختر ڈاکٹر ملک۔ تنقیدی نظریے۔ لاہور۔ میری لائبریری۔ ۱۹۸۱۔ ص ۱۷۳

۱۲۔ اس موضوع پر راقم کا مضمون غالب کی اردو نثر میں انگریزی الفاظ کا استعمال مشمولہ تفہیم و تحسین مطبوعہ ۲۰۰۸ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ رام بابو سکسینہ۔ تاریخ ادب اردو۔ ت۔ مرزا محمد عسکری سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۴۔ ص ۳۳۶

۱۴۔ ضمیمہ مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ م۔ اعجاز راہی۔ طارق محمود۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ۱۹۸۶۔ ص ۶۸، ۶۹

۱۵۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴۔ ص ۳۵۱

۱۶۔ طیبہ خاتون ڈاکٹر۔ اردو نثر کی داستان۔ میرپور۔ آزاد کشمیر۔ ارسلان بکس۔ ۲۰۰۳۔ ص ۳۲

۱۷۔ عبداللہ، سید ڈاکٹر۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۱۷

۱۸۔ عبداللہ، سید ڈاکٹر۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸۔ ص ۱۶

۱۹۔ حامد بیگ مرزا ڈاکٹر۔ مغرب سے نثری تراجم۔ اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان۔ ۱۹۸۸۔ ص۱۷۲

۲۰۔ طیبہ خاتون ڈاکٹر۔ اردو نثر کی داستان۔ میر پور۔ آزاد کشمیر۔ ارسلان بکس۔ ۲۰۰۳ص ۳۲

۲۱۔ اردو کے سائنسی اور فنیاتی تراجم کا جائزہ، مشمولہ: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی۔ طارق محمود۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ۱۹۸۶۔ ص۴۹

۲۲۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالؔی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴۔ ۳۵۴

۲۳۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالؔی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴ص ۳۵۵

۲۴۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالؔی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴۔ ص۳۴۹

۲۵۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ۱۹۵۹۔ ص۴۵

۲۶۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ۱۹۵۹۔ ص۵۷

۲۷۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ص۵۸

۲۸۔ حالؔی نے خواجہ تصدق حسین کے نام ۱۸۹۰ کے ایک خط میں لکھا ہے کہ ”شمس العلما (مولوی ذکاءاللہ) کی انگریزی کتابوں میں سے جس قدر انتخاب اور ترجمہ ہو گیا ہو مجھے بھیج دو“

۲۹۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالؔی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴۔ ۳۴۸

۳۰۔ طلبا کی پر جوش اور نوجوان جماعت میں بھی حالؔی کی بے حد عزت تھی اور اکثر خوش ذوق طلبا ان سے سبقاً ادب پڑھا کرتے تھے اور یہی لڑکے اکثر انگریزی کتابوں کے تراشے حالؔی کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ (ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ص۵۸)

۳۱۔ سید محمود نے اکثر معاملات میں حالؔی سے مشورہ کیا اور وہ حالؔی کی بڑی عظمت کرتے تھے اور مغربی افکار و آرا سے حالؔی کو باخبر کرتے رہتے تھے۔ (ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو، ص۵۹)

۳۲۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ص۶۴

۳۳۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ص۵۸

۳۴۔ معین احسن جذبی۔ حالؔی کا سیاسی شعور۔ لاہور۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۶۳۔ ص۲۲

۳۵۔ معین احسن جذبی۔ حالؔی کا سیاسی شعور۔ لاہور۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۶۳۔ ص۲۲

۳۶۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ۱۹۵۹۔ ص۲۱

۳۷۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالؔی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴۔ ص۳۵۴

۳۸۔ معین احسن جذبی۔ حالؔی کا سیاسی شعور۔ لاہور۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۶۳۔ ص۹۹

۳۹۔ ناظر کاکوروی۔ حالؔی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ۱۹۵۹۔ ص۵۰

۴۰۔ حالؔی نے مقدمہ میں ان الفاظ کی فہرست دی ہے۔ خلیفہ، ترجمان، مخزن، نواب، تعریف، قطن، امیر البحر، عثمان، فردوس، منارہ، سپاہی، شغال، کارواں، شکر، قرمزی کی جگہ جو کہ عربی و فارسی کے الفاظ ہیں کیلف، ڈریگومین، میگزین، نباب، ٹیرف، کاٹن، ایڈمرل، اوٹومن، پیرے ڈائز، منرٹ، سیپوئے، جیسول، کیروِن، شگر، کرمسن بولتے اور استعمال کرتے ہیں (مقدمہ شعر و شاعری۔ ص۱۱۳)

۴۱۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۸
۴۲۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۱۱،۱۲
۴۳۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۵۴
۴۴۔ حامد بیگ مرزا ڈاکٹر۔ مغرب سے نثری تراجم۔ اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان۔ ۱۹۸۸۔ ص ۴۱۱ تا ۵۰
۴۵۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۳۵
۴۶۔ الطاف حسین حالیؔ۔ دیوان حالیؔ۔ لاہور۔ خزینہ علم و ادب۔ ۲۰۰۱۔ ص ۲۷، ۲۸
۴۷۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۴۰
۴۸۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۳۸
۴۹۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۳۹
۵۰۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س ن۔ ص ۶۱
۵۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اردو کی قابل قدر اور انتہائی قابل احترام شخصیت ہیں۔ ایک عالم ان سے مستفیض ہے مگر صرف ایک لفظ کی غلط قرات سے بھٹک کر کہاں سے کہاں نکل گئے ہیں۔ چند نئے اور پرانے شاعر کے صفحہ ۴۹ پر انہوں نے لکھا ہے:

خوبیِ رو و چشم سے آنکھیں اٹک گئیں
پلکوں کی صف کو دیکھ کے بھیڑیں سرک گئیں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں عجیب قسم کی مرکب تصویر ہے۔ جو سراپا محسوس ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ بھیڑیں خوف کے موقع پر گھبرا کر سب کی سب ایک سمت میں سرک کر خوف کو ٹالنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔ تصویر میں کیفیت بھی ہے اور مشاہدہ بھی واضح ہے'' حالانکہ جو لفظ بھیڑیں بمعنی جانور سمجھا ہے وہ دراصل بھیڑیں بمعنی ہجوم ہے۔

۵۲۔ عبدالشکور پرنسپل۔ تنقیدی سرمایہ اردو میں۔ الہ آباد۔ کتاب محل۔ ۱۹۴۶۔ ص ۶۷
۵۳۔ عبدالحق مولوی۔ چند ہم عصر۔ کراچی۔ اردو اکیڈمی سندھ۔ ۱۹۷۰۔ ص ۱۸۰
۵۴۔ کلیم الدین احمد۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ اسلام آباد۔ پورب اکیڈمی۔ ۲۰۱۲۔ ص ۹۰

حوالہ کتب

۱۔ اعجاز راہی (م)۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ۱۹۸۶
۲۔ الطاف حسین حالیؔ خواجہ۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ س۔ ن
۳۔ الطاف حسین حالیؔ۔ دیوان حالیؔ۔ خزینہ علم و ادب لاہور۔ ۲۰۰۱
۴۔ حامد بیگ مرزا ڈاکٹر۔ مغرب سے نثری تراجم۔ اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان۔ ۱۹۸۸
۵۔ حسن اختر ڈاکٹر ملک۔ تنقیدی نظریے۔ لاہور۔ میری لائبریری۔ ۱۹۸۱۔ ص ۱۷۳
۶۔ رام بابو سکسینہ۔ تاریخ ادب اردو (ت۔ مرزا محمد عسکری)۔ لاہور۔ سنگ میل پبلیکیشنز۔ ۲۰۰۴

۷۔ طیبہ خاتون ڈاکٹر۔ اردو نثر کی داستان۔ میر پور۔ آزاد کشمیر۔ ارسلان بکس۔ ۲۰۰۳
۸۔ عبدالحق مولوی۔ چند ہم عصر۔ کراچی۔ اردو اکیڈمی سندھ۔ ۱۹۷۰
۹۔ عبدالشکور پرنسپل۔ تنقیدی سرمایہ اردو میں۔ الہ آباد۔ کتاب محل۔ ۱۹۴۶
۱۰۔ عبدالقیوم ڈاکٹر۔ حالی کی اردو نثر نگاری۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۴
۱۱۔ عبداللہ، سید ڈاکٹر۔ سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ۔ لاہور۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۸
۱۲۔ عبداللہ ڈاکٹر سید۔ چند نئے اور پرانے شاعر۔ لاہور۔ اردو مرکز لاہور۔ ۱۹۶۵
۱۳۔ کلیم احسان بٹ۔ تفہیم و تحسین۔ گجرات۔ روزن پبلشرز۔ ۲۰۰۸
۱۴۔ کلیم الدین احمد۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ اسلام آباد۔ پورب اکیڈمی۔ ۲۰۱۲
۱۵۔ معین احسن جذبی۔ حالی کا سیاسی شعور۔ لاہور۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۶۳
۱۶۔ ناظر کاکوروی۔ حالی کا نظریہ شعری۔ الہ آباد۔ ادارہ انیس اردو۔ ۱۹۵۹
۱۷۔ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعہ حالی۔ لاہور۔ دارالادب لاہور۔ س۔ ن۔

☆☆☆☆

سلطان فریدی

مولانا حالؔی کی مرزا غالب سے اصلاحِ سخن

اردو شعر و سخن کے حوالے سے پاک و ہند میں اُستادی شاگردی کا عجب تعلق چلا آ رہا ہے مگر اب اس کی وہ شان اور آداب باقی نہیں رہے۔ نثری اور آزاد نظموں نے شاعروں کا کام آسان کر دیا ہے کیوں کہ بزرگ شعرا کے پاس فالتو وقت نہیں کہ وہ شاگردوں کا سلسلہ جاری رکھ سکیں اور نو مشق نوجوان شعرا کے ہاں بھی اتنی فرصت نہیں کہ وہ اپنے فن کو صیقل کرنے کے لیے بزرگ شعرا کے دامن کو کچھ عرصہ کے لیے تھامے رکھیں۔ غزل پابندی سے لکھتے ہیں، نظم آزادی کے ساتھ۔

آج کا شاعر گزشتہ دور کے شعرا کی طرح باریک بین نہیں، نہ اتنا تخلیق کہ اساتذہ شعرا کے دواوین کو تلاش کر کے حاصل کرے اور اُن کا بغور مطالعہ بھی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دور میں مشقِ سخن اور شاعری کی تربیت کا ایک خوبصورت ذریعہ یہی استادی شاگردی کا تعلق تھا۔ آتشؔ مصحفی کا شاگرد تھا۔ وزیر علی صبا خواجہ آتش کا شاگرد۔ صبا کا یہ شعر ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

شیخ ابراہیم ذوق، مرزا داغ کا استاد اور داغ اقبال جیسے بلند پرواز شاعر کا استاد۔ حفیظ جالندھری امیر مینائی جیسے غزل گو اور نعت گو استاد کا شاگرد۔ اس زور اثر تعلق نے حفیظ جونپوری مرحوم سے یہ دل میں اترنے والا شعر منسوب کیا۔

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

مصرع ثانی اصلاح سے یوں تھا ؏

کچھ عجب چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

الغرض اصلاح ایک ضروری عمل ہے۔ ہر کام میں اصلاح کی ضرورت ہے جس کا کام یا کلام اصلاح شدہ ہے وہ بزمِ عالم میں سربلند ہے۔ جو کسی ایک کے آگے سر جھکانے سے پہلوتہی کرتا ہے، اُس کی گردن سب کے سامنے جھکی رہتی ہے۔

باکمال اساتذہ اپنے شاگردوں کو شعر کی باریکیاں بتاتے ہیں۔ خاص کر الفاظ کے صحیح استعمال، زبان کی فصاحت، بول چال کی صفائی، اسلوبِ بیاں اور مضمون کے ادا کرنے کے ڈھنگ سے واقف بناتے ہیں۔ اس کے برعکس جو خود مشق کرتا رہتا ہے اُسے کامیاب ہونے کے لیے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے۔ ایک قادرالکلام شاعر اپنے کلام کو شاعرانہ معیار سے خود ہی بار بار جانچتا اور تولتا ہے۔ خود ہی اس کے عیوب دُور کر لیتا ہے جب کہ نو مشق اپنا کلام درست کر لینے سے جھجکتا ہے۔ اصلاح کا مقصود محض عیوب و نقائص کو رفع کرنا، کمی کو پورا کرنا یا ماند رنگ کو اُجالنا ہے۔ عیوب مطالعۂ فطرت سے متعلق ہوں یا زبان سے متعلق، قابلِ اصلاح ہیں۔

مصلحِ قوم مولانا حالی اور عبقری شاعر مرزا غالب کے درمیان اُستادی شاگردی کا رشتہ ضرب المثل ہے۔ اس مبارک رشتے کا اثر ہی تو تھا کہ مولانا حالی نے یادگارِ غالب جیسی خوبصورت کتاب تصنیف کی۔ گویا شاگردی کا حق ادا کر دیا۔

ہم ۱۹۲۸ء میں شائع ہونے والی کتاب مشاطۂ سخن، مصنف صفدر مرزاپوری سے معلوم ہونے والے چار اشعار کی اصلاح یہاں نقل کرتے ہیں جو مرزا غالب نے مولانا حالی کو دیے۔ یہ اشعار اسی طرح دیوانِ حالی میں بھی درج ہیں۔ یعنی اصلاح شدہ شکل میں۔

۱۔ کریں اہلِ دنیا نہ آتش مزاجی
اُنھیں ایک دن خاک ہونا پڑے گا
اصلاح: عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمھیں ایک دن خاک ہونا پڑے گا

جناب حالی اہلِ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں مگر اصلاح میں اُستاد غالب نے عزیزوں کو مخاطب کیا ہے۔ اس نازک فرق کو باریک بین نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ اصلاح سے کیا بات پیدا ہو گئی ہے۔ جس کی شرح نہیں ہو سکتی۔

۲۔ ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالؔی
مگر اب بڑھاپے میں ہونا پڑے گا

اصلاح: ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حآلی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

اس اصلاح کو اُسی زمانے کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ کریں۔ زمانۂ حال کی تہذیب شاید (مری جان) کی متحمل نہیں۔ جان کا لفظ جان کے استاد غالب نے رکھا۔ لطفِ زبان کس قدر بڑھ گیا ہے۔

۳۔ چپ چپاتے کسی کافر کو دیا دل ہم نے
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

اصلاح: چپ چپاتے اسے دے آئے دل اِک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

اللہ اللہ پہلا مصرع کس حُسن سے بنایا۔ ''اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم'' اس بات کی کیا بات ہے۔

۴۔ بارہا دیکھ چکے تیرا فریب اے ظالم
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

اصلاح: بارہا دیکھ چکے تیرا فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

پہلے مصرع میں بجائے ظالم کے (دنیا) بنایا جس سے شعر میں حد درجہ کی ترقی ہوئی اور یہی ایک لفظ دنیا شعر کی جان بن گیا۔ اصلاح اسی کا نام ہے۔ وہ بھی مرزا غالب جیسے اُستاد کی اصلاح۔

☆☆☆☆

تسنیم صنم

مولانا الطاف حسین حالی فن اور شخصیت کے آئینے میں

دنیائے ادب کو جدیدیت کی راہ دکھانے والے مولانا الطاف حسین حالی نے نہ صرف اہلِ ادب کو شاعری کی اصل مقصدیت سے روشناس کرایا بلکہ اہلِ ہند کی حمیت و غیرت کو بھی اپنی تحریروں کے ذریعے جگایا۔ حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔

یہ وہ دور تھا کہ جب ہندوستان میں غالبؔ، مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ اور آزردہ کی شاعری کا طوطی بولتا تھا۔ حالیؔ بھی شاعری کا ذوق لیے اس وسیع سمندر میں کود پڑے۔ ان کے مدِ مقابل نامی گرامی شعرا تھے اور ان کی عمر ۱۹۔۱۸ سال تھی۔ حالیؔ کو نیچرل اور قومی شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں کہ جہاں ایک طرف دلی میں ذوق، مومن، غالب اور ظفر کا شہرہ تھا تو دوسری طرف حالیؔ اپنی شاعری کا تغزل لیے اس میدان میں کھڑے تھے۔ بہت جلد حالیؔ کے انداز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ حالیؔ کے لیے ان شعرا کی جانب سے ملنے والی پذیرائی تبرک کی مانند تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا رنگ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تبرک باعثِ تقلید بھی ثابت ہوا۔ چناں چہ حالیؔ نے بغیر کسی تردد کے ان چاروں شعرا کی روش اختیار کی لیکن جلد ہی انھوں نے غزل گوئی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنی شاعری کا رُخ موڑ لیا۔ اس رُخ کو اختیار کرنے کا موجب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تھی۔ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو تاراج کر ڈالا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ شاید مسلمان قوم کا بحیثیت مسلمان اپنے مذہب، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اقدار و روایات کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو قائم رکھنا بظاہر ناممکن ہو گیا تھا۔ اس وقت حالیؔ کی سوچ نے ایک کروٹ لی اور انھوں نے لب و رخسار، گل و بلبل کی شاعری سے ناطہ توڑ کر اپنی قوم، اپنی اقدار کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور قومی شاعری کا آغاز کیا اور ایک محبِ وطن شاعر کے طور پر سامنے آئے۔ اس وقت اُن کی عمر صرف بیس برس تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے حالیؔ کی سوچ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا اور سرسید احمد خاں کی اصلاحی

تحریکوں میں شامل ہو کر ملک و ملت کے لیے اپنے الفاظ کے ہتھیار کا استعمال شروع کیا۔ پنجاب میں جدید اردو شاعری کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ حالیؔ بھی اسی رو میں بہہ نکلے جو ملک و قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے کے لیے سرسید احمد خاں کی مرہونِ منت تھی۔ سرسید احمد خاں کی جانب سے پذیرائی ملنے کے بعد حالیؔ نے قومی شاعری کی جانب اپنا رخ موڑ لیا۔ حالیؔ کو نظر آ رہا تھا کہ ہندو مسلمانوں کو یا تو اپنا تابع بنا کر ان کی زندگی کو عبرت ناک بنانا چاہتے ہیں یا انھیں ہندوستان سے مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان خدشات سے قوم کو آگاہ کرنے کے لیے حالیؔ نے اپنی شاعری کا سہارا لیا اور اردو کے پہلے قومی شاعر کہلائے۔ ان کی قومی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں مہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ان کو ہیں نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

حالیؔ کی نظموں کی برتری یوں ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں انسانی جذبات، المیوں اور دلچسپیوں کو اپنے شعری اظہار کا مرکز بنایا اور ان معاملات کو شعروں کے ذریعے زبانِ زدِ عام کیا جن پر بات کرنے سے عام آدمی گھبراتا تھا۔ حالیؔ نے اپنی نظموں کو قومی اور سماجی مسائل کے لیے استعمال کیا۔ مقدمہ شعر و شاعری لکھنے کا مقصد واضح ہے۔ مسدس حالی سے پہلے مسدس صرف مرثیے کے لیے مخصوص تھی۔ مد و جزر اسلام بھی مسدس کے انداز میں لکھی گئی۔ حالیؔ نے قصیدے لکھے۔ تراکیب بند، قطعات و رباعیات لکھیں جن کا مقصد صرف اور صرف اس زمانے کے گھٹن زدہ سماج میں ہوا کا تازہ جھونکا محسوس ہوں۔ نیچرل نظمیں، بچوں کی نظمیں، لاہور میں لکھی ہوئی وصفیہ اور اخلاقی نظمیں سب کا مقصد ایک نئے سماج اور ایک نئے شعور کا آغاز ہیں۔ ان کی ملی شاعری کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن نثر میں بھی مولانا حالیؔ نے اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ انہیں اگر اردو زبان کا پہلا سوانح نگار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

انھوں نے سوانح نگاری کو ایک الگ روپ عطا کیا اور سوانح نگاری کو یادگاری اور موضوعاتی پیرائے سے نکال کر ایک فن کی حیثیت دی۔ ان کی نثر شستہ، سلیس اور عام فہم زبان میں ہے۔ انھوں نے تین سوانح

عمریاں لکھیں۔ حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب۔ ان سوانح عمریوں میں سرسید احمد خاں کی حیات پر لکھی گئی سوانح عمری کو جامع قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ حیاتِ سعدی میں ذاتی جزئیات اور داخلی زندگی کی تفصیلات ذرا کم ملتی ہیں اور یہ سوانح عمری سے زیادہ ایک تنقیدی مضمون لگتی ہے۔ جب کہ یادگارِ غالب میرزا غالب کی ظرافت اور خوش دلی پر مبنی سوانحی خاکہ ہے۔ اس سوانح کو لکھنے کا مقصد حالؔی کے نزدیک شاید یہ رہا ہو کہ قوم میں زندہ دلی پیدا کی جا سکے۔ اس سوانح میں فنی اعتبار سے کئی نقائص موجود ہیں۔

ان دو سوانح عمریوں کے مقابلے میں حیاتِ جاوید کو جامع قرار دینا درست لگتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی کا اعتراض کہ حیاتِ جاوید مدلل، مداحی اور کتاب المناقب ہے۔ ان کا یہ اعتراض شاید ان کی اپنی نظر میں درست ہو لیکن مہدی الافادی نے اس اعتراض کے جواب میں کہا کہ ''حیاتِ جاوید ایک شریف انسان کے قلم سے ایک شریف تر انسان پر لکھی گئی سرگزشت ہے۔ اس کی یہ کوتاہی رہی کہ بعض جگہوں پر اس میں سرسید کی کمزوریوں کے بارے میں حالؔی نے معذرتی لہجہ اختیار کیا ہے۔''

مہدی کے خیال میں حالؔی کی شرافت اور مشرقی لحاظ داری نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی ہوگی اس لیے انھوں نے معذرتی لہجہ اختیار کیا۔ وہ کسی کی شخصی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرنا چاہتے ہوں۔ ان کے نزدیک اوصاف کی اہمیت شاید نقائص کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

حالؔی کی تینوں سوانح عمریاں موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ حیاتِ سعدی کو اردو ادب میں جدید طرزِ تحقیق کا پہلا نمونہ کہا گیا ہے جب کہ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید معاصرین کی سوانح عمریاں ہیں اور ہم عصروں کی سوانح عمری لکھنا ایک دشوار کام ہے۔ حالؔی نے یہ دشوار کام نہایت سلیقے اور استادانہ انداز میں سرانجام دیا۔ ان سب کے باوجود اگر یہ کہا جائے کہ حالؔی کی نثر اردو ادب میں جو مقام و مرتبہ رکھتی ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہو سکتا اور اس حقیقت کا اعتراف زمانے نے کیا۔

☆☆☆☆

نعیم راجہ

حالی کا تنقیدی شعور

حالی، سرسید کے ان ساتھیوں میں سے ہیں جن کو، اپنی ادبی و اصلاحی خدمات، شعر و سخن میں منفرد اسلوب، تنقیدِ ادب اور جدید شاعری کے بانی کی حیثیت سے اردو ادب میں بلند مقام حاصل ہے۔ حالی کا شمار، علی گڑھ تحریک کے درجۂ اول کے لوگوں میں ہوتا ہے اور بطورِ تخلیق کار ان کی تخلیقات میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جسے بقائے دوام حاصل نہ ہوا ہو۔ انھوں نے اپنی نظریاتی اور فنی خصوصیات کو اپنے ادب پاروں میں اس طرح سمویا ہے کہ ہر تصنیف ایک شہ پارہ اور یادگار بن گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب لکھتے ہیں کہ آرزوؤں اور ولولوں کی شدت سے ذہن جو خاکے بناتا ہے وہ سب کے سب ادب کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ (۱) حالی کی ادبی تخلیقات، نظم ہو یا نثر، کی مقبولیت کی بنیادی وجہ اُن کی اصلاح زبان و ادب کی آرزو اور اس مقصد کے حصول کے لیے جوش و ولولہ ہے۔ ان کی مشہورِ عالم تصنیفات میں ”مقدمہ شعر و شاعری“ (تنقید ادب)، حیات جاوید، حیات سعدی، یادگار غالب، (سوانح)، مدوجزر اسلام المعروف مسدسِ حالی (منظوم تاریخ اسلام) اور دیوانِ حالی (شاعری) شامل ہیں۔ حالی نے جدید شاعری کو پروان چڑھایا اور اس کے امام ٹھہرے۔ اس حوالے سے شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ حالی نے اپنے دیوان کے شہرۂ آفاق مقدمہ میں پرانی شاعری کے نقائص اور جدید شاعری کے اصول اس عقل، سمجھ اور قابلیت سے سمجھائے ہیں کہ اس کا جواب اردو تو کیا مغرب کی بہت کم زبانوں میں ملے گا۔ (۲) حالی کی شخصیت کئی حوالوں سے قابل مطالعہ ہے۔ اپنے ہم عصر آزاد اور شبلی کی طرح وہ بیک وقت شاعر، ادیب، سوانح نگار اور زبردست نقاد ہیں۔ وہ ان تمام حیثیات میں اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ حالی کی ذات کے تمام پہلوؤں پر حاوی، ان کی دو خصوصیات قابل ستائش ہیں۔ پہلی خصوصیت ان کی قدیم و جدید شاعری اور دوسری ان کا انتقادی شعور۔ غالب اور شیفتہ جیسے بڑے شعراء نے انہیں اردو کے روایتی شعری سرمائے کی طرف راغب کیا تو آزاد و سرسید کے اثرات سے، وہ شعر و شاعری کے نئے رجحانات کی طرف مائل ہوئے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں اور تصحیحِ تراجم کی ملازمت کے دوران، اردو میں ترجمہ ہونے والی مغربی علمی و ادبی کتابوں کے مطالعے نے حالی کو نئے اسلوب شعر کی طرف راغب کر کے قدیم و

جدید شاعری پر طبع آزمائی کے حوالے سے ان کا تذبذب دور کر دیا۔ اب انھوں نے، دانستہ، پرانی شاعری ترک کر کے نئی طرز کی شاعری پر توجہ دی اور اسے اس طرح عام کیا کہ اردو ادب میں جدید شاعری کے اوّلین استاد کہلائے۔

حالؔی پر اصلاح کا غلبہ اس شدت سے ہوا کہ ان کی نثر و نظم میں ہر جگہ اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ سوانح نگاری کے میدان میں غالبؔ اور سعدؔی کا انتخاب یقیناً ان حضرات سے حالؔی کی محبت کا نتیجہ ہے لیکن پس منظر میں موجود اردو اور فارسی شاعری کی اصلاح کے جذبے سے انکار کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ یادگار غالبؔ کے دوسرے حصے میں اردو شاعری کی قدیم طرز پر جا بجا تعریض اور جدید شاعری کی طرف راہنمائی کے کئی نمونے ملتے ہیں۔ اسی طرح حیات سعدؔی کے حصہ دوم میں فارسی شاعری پر تنقید کی ہے جو شبلی جیسی مفصل تو نہیں لیکن ضرورت کو کفایت کرتی ہے۔ حالؔی کے اصلاحی رجحانات کا منبع و محور، ان کا مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ دیوانِ حالؔی کے لیے مقدمہ لکھتے لکھتے انھوں نے اردو ادب میں پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب لکھ دی۔ اس کتاب میں انھوں نے خیال سے ہیئت تک، شعر کو پرکھنے اور اس کے ”رد و قبول“ کے لیے ایسے اصول وضع کیے جو آئندہ کے لیے اردو ادب میں تنقیدِ شعر و سُخن کا معیار قرار پائے۔ حالؔی کا یہی مقدمہ اردو میں تنقید ادب کے ساتھ ساتھ جدید اردو شاعری کی بنیاد بنا اور حالؔی کے تنقیدی شعور کا اندازہ اسی کتاب سے کیا جاتا ہے۔

اردو نثر کی تسہیل اور اس میں حقیقت نگاری و مدعا نویسی کے حوالے سے غالبؔ، فورٹ ولیم کالج اور سر سیّدؔ احمد خان نے جہاں ایک طرف سلیس اردو نثر کو عام کیا وہیں دوسری طرف اردو ادب میں نئی تنقید کے لیے زمین تیار کر دی۔ حالؔی سے قبل اردو میں تنقید کی روایت کسی منظم اور مربوط شکل میں موجود نہ تھی بس ایک آزادؔ کا تنقیدی سرمایہ تھا جو مختلف مضامین اور ”آب حیات“ میں بکھرا، جدید تنقیدی روایت کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اب جدید تنقید کی طرف مستقل توجہ مبذول ہونے لگی تھی۔ اردو ادب میں ابھی تک کسی تخلیق کے ظاہری حُسن کو خوبی و خامی کا معیار سمجھا جا رہا تھا اور زوال پذیر معاشرے میں تنقید کے نام پر شاعری میں علم عروض اور قافیہ کے حسن و قبح کو بیان کیا جاتا تھا۔ اس دوران مغرب نے فنِ تنقید کو کس قدر بلندی پر پہنچا دیا تھا، ہند کے اہلِ ادب کو ابھی اس کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جب سماجی تبدیلیوں نے ہندوستانی معاشرے کو گھیرا تو ادب اور نقد ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ نئے ماحول میں ادب کی مقصدیت کو اجاگر کیا جانے لگا۔ ادب پارے کی معنوی قدر و قیمت کو پرکھنا، تنقید قرار پایا اور خصوصاً شاعری کو بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور سمجھایا جانے لگا۔ ان حالات میں حالؔی کا وجود

اردو کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں کہ موصوف نے قدیم وجدید، دونوں طرح کے تصوراتِ شاعری سے استفادہ کیا اور اپنے مطالعے اور بصیرت کی بنیاد پر اردو ادب میں نئی تنقیدی روایت کی اساس قائم کی۔ حالؔی کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں مختلف شخصیات اور انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کا خاص اثر رہا جن سے ان کی قوت انتقاد نے جلا پائی اور ’’پیروی مغرب‘‘ اس کا لازمی جز و تھا۔ شخصیات میں حالؔی سب سے زیادہ سرسید کی ذات سے متاثر ہوئے۔ ایک روایتی شاعر کو جدید شاعر او ر نقاد بنانے میں سرسیّدؔ کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا، حالؔی نے سرسیّدؔ سے سیکھا تھا۔ اپنے مربی و محسن سے اپنی محبت اور گہرے تعلق کا اظہار انھوں نے ’’حیات جاوید‘‘ میں کھل کر کیا ہے۔ حالؔی کے خیالات پر اثر انداز ہونے والی دوسری شخصیت مرزا غالبؔ کی ہے جن سے حالؔی نے شاعری کے اسرار و رموز سیکھے۔ غالبؔ کی عظمت کا اعتراف انھوں نے ’’یادگارِ غالبؔ‘‘ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> ’’اس ملک (ہندوستان) میں مرزا غالبؔ پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔۔۔۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، جن کی عظمت وشان اس سے بالاتر تھی کہ انہیں بارھویں یا تیرھویں صدی کے شاعروں۔۔۔ میں شمار کیا جائے۔‘‘ (۳)

تیسری شخصیت جس نے حالؔی کو متاثر کیا وہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ کی ہے۔ نواب صاحب ایک عالم اور بہترین ادبی ذوق کے حامل انسان تھے جن کی اصل وجۂ شہرت اُن کی شاعری ہے۔ پہلے مومنؔ اور پھر ان کی موت کے بعد غالبؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ حالؔی نے ان کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی صحبت کو اپنے لیے مرزا غالبؔ کے مشورہ و اصلاح پر ترجیح دی ہے۔ (۴) نواب شیفتہؔ کی صحبت سے حالؔی نے مبالغے کو ناپسند کرتے ہوئے صاف اور سیدھے طور پر محض حسنِ بیاں سے، شعر کو دل فریب بنانا سیکھا۔ آخر میں انجمن پنجاب کے جدید نظم کے مشاعروں اور پنجاب بک ڈپو کی نوکری کے دوران مغربی ادب کی ترجمہ شدہ کتابوں کے مطالعے سے حالؔی اس قابل ہو گئے کہ اپنی شاعری کی قدیم روایت کے نقائص کو بیان کر سکیں اور نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق جدید اردو شاعری کو رواج دیں۔ حالؔی نے اپنے تمام تر مطالعے، مشاہدات، تجربات اور خیالات کو تنقیدی افکار کی صورت دے کر اپنے دیوان کے مقدمہ کے طور پر لکھا لیکن یہ مقدمہ ایک باقاعدہ تصنیف کی شکل اختیار کر گیا اور "مقدمہ شعروشاعری" کے نام سے معروف و مشہور ہوا۔

مقدمہ شعروشاعری

سوا دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اردو میں اصول تنقید کی پہلی، مکمل اور با قاعدہ کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آزاؔد کے مضامین تنقیدی حوالے سے اہم سہی لیکن با قاعدہ تصنیف کہلانے کے قابل نہیں۔ ”آبِ حیات“ میں تنقیدی مواد ضرور موجود ہے لیکن نہ صرف بکھرا ہوا ہے بلکہ اس کی حیثیت ذیلی قسم کی ہے جبکہ کتاب میں اصل زور تذکرۃ الشعراء پر ہے۔ اس لیے مقدمہ شعر و شاعری اردو میں اصول تنقید کی پہلی کتاب قرار پاتی ہے۔ حالؔی کی یہ کتاب اس دور میں سامنے آئی جب ایک طرف آزاؔد نے انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اور دوسری طرف سرسید نے علی گڑھ تحریک اور رسالہ ”تہذب الاخلاق“ کی شکل میں، ایک ادبی بغاوت کو جنم دے رکھا تھا اور اردو شاعری کے قدیم، روایتی اور جامد اسلوب کے مقابلے میں مغربی ادبیات کے زیر اثر ایک نئے ادبی رجحان کو فروغ دینے کی شعوری کوشش کر رہے تھے۔ حالؔی نے ان حالات میں کھل کر اس ادبی بغاوت کا ساتھ دیا اور ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں قدیم شاعری کے معائب اور جدید شاعری کے محاسن کو بیان کیا۔

حالؔی کی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل نظر آتی ہے۔ پہلے حصے میں شعر کی تعریف، اس کی تاثیر و افادیت اور الفاظ و معانی کی اہمیت تفصیلاً بیان کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری کی تخلیق کے بنیادی اصول مرتب کر کے اس کے لیے ضروری شرائط واضح کی گئی ہیں۔ ان شرائط کی بحث و ترتیب میں عربی کے اصول نقد کے علاوہ مغربی تنقیدی اصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اردو شاعری کی اہم اصنافِ سخن کی تعریف و توصیف کر کے ان کے لیے معیارات قائم کیے ہیں۔ ان اصناف میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ شامل ہیں۔ حالؔی نے شاعری کی خوبی، اس کی اصلاح کے لیے تجاویز، شعر کی خوبصورتی اور اردو شاعری کی ترقی کے امکانات وغیرہ کو ”مقدمہ“ کے دوسرے حصے میں بیان کیا ہے۔

حالؔی کا تصورِ شعر:

شاعری کے حوالے سے ہمیشہ دو آراء پائی جاتی رہی ہیں۔ اہل علم کا ایک طبقہ شاعری کو کارِ لا حاصل اور دوسرا گروہ عطیۂ خداوندی سمجھتا ہے۔ الطاف حسین حالی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس فن کی اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں شاعری، انسان کو روحانی اعتبار سے سکون پہنچاتی ہے اس لیے اس کی تخلیق پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ سماجی اصلاح کے حوالے سے شاعری ایک اہم آلہ ہے یعنی اگر شعر کو بلند مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سماجی اصلاح کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اس کا غلط استعمال اخلاقی بگاڑ کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ حالؔی کہتے ہیں:

> ”ایک ایسے عطیہ کو جو قدرت نے عنایت کیا ہو صرف اس وجہ سے کہ اکثر لوگ اس کو

> فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں کسی طرح عبث اور بے کار نہیں کہا جا سکتا۔ عقل خدا کی ایک گراں بہا نعمت ہے مگر بہت سے لوگ اس کو مکر وفریب اور شر و فساد میں استعمال کرتے ہیں۔ کیا اس سے عقل کی شرافت میں کچھ فرق آ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح ملکۂ شعر کسی بُرے استعمال سے بُرا نہیں ٹھہر سکتا۔ پس جو شخص اس عطیہ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔“(۵)

حالیؔ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس فن کے درست اور غلط استعمال پر، بالترتیب، سماجی اصلاح اور بگاڑ کے قائل نظر آتے ہیں۔ حالیؔ کی یہ بات آزادؔ کے ان خیالات سے مطابقت رکھتی ہے، بلکہ ممکن ہے ان ہی کے اثرات کے تابع کہی گئی ہو، جو انھوں نے ۱۸۶۷ء کے اپنے مشہور مضمون ”نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات“ میں ظاہر کیے تھے۔ دونوں حضرات کی اس فکری ہم آہنگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی معاشرے پر ایک عرصے سے جو جمود چھایا ہوا تھا اس کی ایک اہم وجہ اس روایتی شاعری کو سمجھا جانے لگا تھا جو صدیوں سے، ارضی حقائق سے لاتعلق، حسن و عشق کے نغمے الاپے جا رہی تھی۔ اپنی ظاہری خوبصورتی کے باوجود اس قسم کی شاعری میں کسی بلند مقصد کی عدم موجودگی اسے سوسائٹی کے لیے سَمِ قاتل بنا رہی تھی۔ مغربی رومانوی شعرا کے کلام کی ہندوستان آمد، اس میں حسنِ فطرت کے بیان اور سادہ و پُر جوش اسلوبِ شعر نے آزادؔ اور حالیؔ جیسے اصلاح پسندوں کو خاص طور پر متاثر کیا۔ مغرب کی سائنسی، علمی اور معاشرتی ترقی میں، بلا شک و شبہ، ایک بڑا کردار ان شعرا کا ہے جن کے کلام میں مقصدیت اور سماج کی راہنمائی کا عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ حالیؔ کو شاعری کی یہ صفت بہت پسند آئی کہ وہ قومی بھلائی کے کاموں کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے یعنی وہ شعر کی افادیت تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح جہاں تک شاعری اور اس کے مقصد کا تعلق ہے بقول عبادتؔ بریلوی، حالیؔ بظاہر افلاطونؔ کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔(۶)

اچھی شاعری کی شرائط:

حالیؔ نے جب انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تو وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے جس کا اظہار انھوں نے خود بھی کیا ہے۔(۷) یہی وجہ ہے کہ اصلاحِ شاعری کے عمل میں وہ مغربی ادب اور اس کے تخلیق کاروں سے راہنمائی لینا پسند کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک اچھے شعر کی جو خصوصیات قدما نے بیان کی تھیں ان سے صرفِ نظر کر کے حالیؔ نے اس معاملے میں ملٹنؔ کو قابلِ تقلید سمجھا ہے۔ ملٹنؔ کہتا ہے کہ:

> ”شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔“(۸)

عروض وقافیہ جیسے شعری اوصاف کو ترک کر کے حالؔی کا سادگی وغیرہ پر زور دینا اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنی قدیم شعری روایت کی خوبیوں سے اب نظر چرانے لگے تھے اور ان کے خیال میں شاعری کے حُسن کا جو معیار ہندوستانی معاشرے میں رائج تھا اُس کی نوعیت محض سطحی وظاہری قسم کی تھی جبکہ مغربی شعری معیارات، شعر کی معنوی خوبیوں کو آشکار کر کے اسے معاشرے کے لیے زیادہ مفید بناتے ہیں۔ اچھے شعر کی شناخت کے لیے ملٹن کی بیان کردہ ان شرائط میں سے ہر ایک شرط اپنی الگ پہچان اور معنویت رکھتی ہے۔ سادگی سے مراد الفاظ اور خیالات دونوں کی سادگی ہے تاکہ شعر میں پیش کیے گئے خیالات کو سمجھنے میں مشکل نہ ہو۔ ظاہر ہے جو چیز جس مقصد کے لیے تخلیق کی جائے وہ اسے پورا نہ کرے تو ہر باشعور آدمی اس شے کی افادیت سے انکار کر دے گا۔ شعر کی تخلیق کا مقصد قاری تک شاعر کے خیال کی ترسیل ہے اگر الفاظ و خیالات کی دقّت اس مقصد میں حائل ہو جائے تو شعر کی افادیت مشکوک ہو جاتی ہے پس الفاظ و خیالات کی سادگی ایک اچھے شعر کا لازمی جزو ہے۔ اس مقام پر اصلیت کا مطلب حقیقت لیا گیا ہے یعنی شاعر جو شعر کہے اس میں واقعیت کا ہونا ضروری ہے۔ حالؔی لکھتے ہیں:

> ”اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہیے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو یا ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس کے عندیہ میں ــــــ موجود ہے۔“(۹)

اصلیت کے اس بیان میں حالؔی نے تخیل کے ہندوستانی تصور کی نفی کی ہے یا کم از کم اس پر سخت قسم کی قدغن لگا دی ہے۔ تخیل کی پرواز کو محدود کرنے اور شعر کو نفس الامری کے قریب رکھنے میں حالؔی کی اس فکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو شاعری کو بامقصد اور سوسائٹی کے لیے مفید بنانے پر زور دیتی ہے۔ دُور از کار تخیلاتی اڑانوں نے اردو شاعری کو معروضی حالات و مسائل سے آنکھیں بند کر دینے کا آلہ بنا رکھا تھا۔ حالؔی اس صورتِ حال کو ناپسند کرتے تھے پس انھوں نے شعر کی بنیاد کو حقیقت پر رکھنے کی ترغیب دی۔ جوش سے حالؔی کی مراد یہ ہے کہ شعر ایسے بے ساختہ پیرائے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کیا ہے کہ وہ اسے باندھے(۱۰) آزاؔد کے تنقیدی افکار کے تحت گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ اُن کے خیال میں شعر میں جوش اس طرح ہو کہ سننے والے پر وہی اثرات مرتب ہوں جو شعر کہتے ہوئے شاعر پر گزر رہے تھے۔ آزاؔد سے حالؔی کے خیالات کی ہم آہنگی سے ظاہر ہوتا ہے

کہ اُن کی فکر اپنے عہد کے جدید ادبی رجحانات کی ترجمان ہے۔ مغربی اثرات سے پہلے ہندوستانی معاشرے پر چھائی مردنی نے قوم کے قوائے ذہنی کو مفلوج کر رکھا تھا اور زندگی سے فرار اور مسائل سے چشم پوشی کا چلن عام تھا۔ ان حالات سے پریشان اور مغربی ادبیات سے متاثر، حاؔلی نے اپنے تنقیدی نظریات کی تشکیل کے دوران اپنے عہد کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری میں جوش و ہیجان کو لازمی عنصر کی حیثیت سے داخل کرتے ہیں اور اس جوش کی کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب شاعر کی ذات میں داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ معروضی حالات سے متاثر ہونے کی صفت بھی موجود ہو۔ وہ، فرد سے قوم تک، ہر ایک کے غم اور خوشی میں اس طرح جذب ہو جائے کہ جب کسی جذبے کا اظہار کرے تو سننے والے، شاعر کے الفاظ کو اپنے دل کی آواز سمجھیں۔ حاؔلی نے اسی شرط پر "مدوجزرِ اسلام" لکھی جس کے تاثر کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اس کا قاری حاؔلی کے قومی نوحے کا درد محسوس کرتا ہے۔ اس قسم کی بہترین اور معیاری شاعری کے تخلیق کار شعرا کی پہچان کے لیے حاؔلی نے کچھ قیود مقرر کی ہیں جن پر پورا اترنے والا شخص اُن کی نظر میں شاعر ہے اور ایسا شاعر معاشرے کی اصلاح پر قادر ہوتا ہے۔

شاعر کے خصائص:

کسی نہ کسی حد تک طبعِ موزوں ہر شخص کو حاصل ہوتی ہے اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے پر دنیا کے ہر انسان کو قدرت حاصل ہے۔ اشاروں سے الفاظ تک، کوئی نہ کوئی وسیلہ مافی الضمیر کو ادا کرنے میں معاون ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی تک اپنے افکار کی ترسیل کے لیے شاعر اور غیر شاعر ایسے کون سے وسائل استعمال کرتے ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے ممیز کریں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کی روایت کرنے میں ایک شاعر اور غیر شاعر کیا طریقہ اختیار کریں گے کہ ان کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ حاؔلی نے اس کے لیے خیال اور الفاظ کے فرق کو مابہ الامتیاز قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک شاعر معانی اور خیال سے تاثر لیتا ہے جبکہ عام آدمی کے لیے واقعہ کی ظاہری شکل ہی حقیقت قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کی بات سننے والے پر مؤثر ہوتی ہے جبکہ عام آدمی کی بات کوئی خاص اثر نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر کچھ مزدوروں کو سڑک کنارے سوتے ہوئے ایک شاعر اور غیر شاعر نے بیک وقت دیکھا عام آدمی نے ان کی نیند کو زیادہ سے زیادہ تھکاوٹ سے تعبیر کرتا ہے لیکن شاعر نے کہا:

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

بے فکری کی اس نیند کو قلبی اطمینان کا نتیجہ قرار دینا اور امرا کو اس نعمت سے محروم دیکھنا، صرف ایک شاعر کی آنکھ سے ممکن ہے۔ شاعر کو ایک بلند مقام دیتے ہوئے حالؔی نے ایک اچھے شاعر کے لیے تین صفات کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

تخیل:

> ”(تخیل) ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔“(۱۱)

یہ تعریف مغربی نقادوں مثلاً کولرج وغیرہ کی طرح جامع و مانع نہیں اور حالؔی سے اس کی توقع کرنا کچھ مناسب بھی نہیں کیونکہ انھوں نے مغربی رومانی نقادوں کے تنقیدی خیالات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اردو میں اس سے پہلے تخیل کی کوئی روایت موجود نہ ہونا اس ادھوری تعریف کی دوسری وجہ ہے۔ پس ان کی اس پہلی کاوش میں سطحی پن کا ہونا لازمی تھا لیکن تخیل کے خاکے کی تشکیل کے لیے یہ کوشش کافی نظر آتی ہے۔ اسی بنیاد پر تصور اور تخیل میں امتیاز کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا:

> تخیل اور تصور میں فرق یہ ہوا کہ تصور نام ہے بعض اشیاء کو ذہن میں لانے کا اور تخیل نام ہے ان میں منطقی ترتیب قائم کرنے کا گویا تخیل ۔۔۔ میں مشاہدے کا اتنا ہی دخل ہے کہ تخیل کو خام مواد تصور کی صورت میں ملتا ہے بعد کا منطقی استدلال ہر منزل پر مشاہدے کا اس طرح پابند نہیں رہتا کہ حقیقت سے اس کی جڑیں کامل طور پر ملی رہیں۔“(۱۲)

تخیل کے معاملے میں حالؔی نے بالکل آزادی نہیں دی بلکہ ان کے خیال میں تخیل کو دوراز کار نہیں ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ اس کی بنیاد مشاہدے پر ہو۔ ان کے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مشاہدے کی اساس پر جو خام مال تصور کی شکل میں اکٹھا کرے اسے منطقی ترتیب سے پیش کرتے ہوئے محض حسن الفاظ و بیاں سے کام لے اور حقیقت واقعہ کو سادگی اور اصلیت کے ساتھ، بلا کم و کاست، بیان کر دے۔ مبالغہ یا ایسا جھوٹ جو خشک سچائی کا بدل ہو سکے، ان کے نزدیک، مقبول نہیں ہے یعنی وہ تخیل کے باب میں مبالغے کو ذرا گنجائش دینے کو تیار نہیں۔ اس بحث کے لیے انھوں نے ”مبالغہ“ کے عنوان سے کئی صفحات وقف کیے ہیں۔

مطالعۂ کائنات:

محدود معلومات اور سطحی قسم کے مشاہدے سے ایک حد تک شاعری کی تخلیق ممکن ہے لیکن ایک معیاری اور آفاقی شاعری کے لیے لازم ہے کہ شاعر کا مطالعۂ کائنات وسیع اور بھرپور ہو۔ اس صفت کو حالی نے اچھے شاعر کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے لکھا:

> شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ نسخہ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخہ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے ۔۔۔ کوئی شاعر ان باتوں سے استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے بغیر قوت تخیل کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشو ونما پاتی ہے، نہیں پہنچتی۔” (۱۴)

اچھی شاعری کے لیے حالی نے کائنات کے مطالعے کو لازم قرار دیا ہے لیکن ان کے بیان میں اس مطالعے سے مراد صرف مناظر فطرت یا اردگرد پھیلی کائنات کے مظاہر کا مشاہدہ نہیں ہے بلکہ وہ انسانی فطرت کو سمجھنے پر خصوصی زور دے رہے ہیں۔ ان کے خیال میں کائنات کے مطالعے اور انسانی فطرت کی عقدہ کشائی اس قدر اہم باتیں ہیں کہ ان کے بغیر انسانی تخیل کی قوت ماند پڑ جاتی ہے اور اس کی نشو ونما مکمل نہ ہو تو وہ کام تو کرتی لیکن اس سے عام اور سطحی قسم کی شاعری کا وجود عمل میں آتا ہے جو اس آفاقی شاعری کے مقابلے میں بے وقعت ٹھہرے گا جو ہر زمانے میں زندہ رہتی ہے۔ شاعری میں نفسیات پر توجہ دینا اور اس کے نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرنا، اردو شاعری میں، فرائڈ کے نظریات عام ہو جانے کے بعد شروع ہوا اور اس کا ابتدائی زمانہ ۲۰ویں صدی ہے لیکن حالی نے ۱۹ویں صدی میں اردو شعرا کو اس طرف متوجہ کر کے یقیناً بالغ نظری اور دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔

الفاظ کی تلاش:

نظم ہو یا نثر، مناسب اور صحیح الفاظ کے استعمال سے ہر دو کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی شعر میں اگر ایک غیر موزوں لفظ، خواہ وہ مستعمل لفظ کے مترادف ہو، آ جائے تو شعر کا حسن ختم ہو جاتا ہے میر انیس کا ایک شعر ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اسی طرح ایک دوسری جگہ انھوں نے لکھا:

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

اوس اور شبنم ہم معنی ومترادف الفاظ ہیں لیکن میر انیسؔ نے ان کا استعمال اس قدر برمحل اور موزوں کیا ہے کہ اگر مذکورہ بالا مصرعوں میں شبنم اور اوس کے الفاظ کی جگہ بدل دی جائے تو یقیناً ان کی فصاحت اور دلکشی ختم ہو جائے گی۔ حالیؔ کے تفحصِ الفاظ کی شرط کا یہی لب لباب ہے۔ ان کے نزدیک اگر شاعری میں صحیح الفاظ کے استعمال کا خیال نہ رکھا جائے تو شاعر اپنا مافی الضمیر اچھی طرح پیش نہیں کر سکتا۔ حالیؔ کے نزدیک جسے تفحصؔ الفاظ پر قدرت نہیں اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ شعر نہ کہے۔(۱۴) ۱۹ویں صدی میں حالیؔ کی یہ شرائط بہت اہم ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ابھی اردو تنقید نے کوئی باقاعدہ شکل اختیار نہیں کی تھی اور اس مرحلے پر ایسی اساسی نوعیت کے تنقیدی افکار پیش کرنا کہ آج جبکہ تنقید بہت آگے بڑھ چکی ہے، حالیؔ کے خیالات پر زور دینا ان کی اصابتِ رائے کا ثبوت ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ حالیؔ کے مقدمہ کے مطالعے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ مغربی نقادوں میں سے ان کی پہنچ صرف ملٹنؔ اور مکالےؔ تک ہو سکی ہے کیونکہ شعر اور شاعری کی خصوصیات انھوں نے تقریباً وہی بیان کی ہیں جو ملٹنؔ نے ضروری قرار دی تھیں اور شعر کی تعریف میں انھوں نے مکالےؔ سے استفادہ کیا ہے۔ ان دو کے بارے میں بھی ان کا مطالعہ سطحی سا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اعلیٰ معیار کی شاعری کے لیے مذکورہ ناقدین سے ایسی خصوصیات اخذ کی ہیں جن سے کسی زمانے میں انکار کرنا ممکن نہیں اور یہ ان کی دقتِ نظری اور ژرف نگاہی کی دلیل ہے۔

اردو شاعری کے نقائص اور اصلاحی تجاویز:

حالیؔ کی تحریروں میں عملی تنقید تین جگہ ملتی ہے، ایک مقدمہ شعر و شاعری میں دوسرے ان کی لکھی سوانح عمریوں میں اور تیسرے ان کے وقتاً فوقتاً لکھے ہوئے تبصروں اور تقریظوں میں۔ ان میں سے اُن کی سب سے بہترین تنقید 'مقدمہ' میں بیان ہوئی ہے جو جامعیت اور اُسلوب، دونوں حیثیات سے دیگر تصنیفات پر فائق ہے۔ مقدمہ میں انھوں نے غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اُن کی تنقید کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُنھوں نے شاعری کی اصلاح کے لیے مذکورہ اصناف میں جن خصوصیات کو مدِنظر رکھنے کا مشورہ دیا بعد میں اپنی ''جدید شاعری'' میں انھیں استعمال کر کے دکھایا سب سے پہلے غزل کو موضوع بناتے ہوئے حالیؔ نے مفید مشورے دیے ہیں۔

۱۔ غزل:

غزل کی ہیٔت حالیؔ کو پسند ہے کیونکہ اُن کے خیال میں بڑی بڑی نظمیں کہنا ہر وقت ممکن نہیں ہوتا اور قوتِ متخیلہ بیکار بھی نہیں رہ سکتی اس لیے شاعر کے بسیط خیالات، جو وقتاً فوقتاً اس کے ذہن میں آتے رہتے

ہیں، کے اظہار کے لیے غزل بہترین ذریعہ ہے۔ حالؔی نے خاص مناسبت کی بنا پر رباعی اور قطعہ کو غزل کے ذیل میں شمار کیا ہے۔ غزل کی پسندیدگی کی دوسری وجہ حالؔی کے نزدیک اس میں مختلف النوع خیالات کے اظہار کا امکان ہے کہ اس کے ہر شعر میں نئے سے نیا خیال باندھا جا سکتا ہے اور یہ غزل کی وہ خوبی ہے جو نظم میں نہیں۔ اس کے علاوہ قوم کے سب، بوڑھے، بچے، جوان، پڑھے لکھے، اَن پڑھ، اس صنفِ سخن سے مانوس اور اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ پس غزل کی اصلاح کو حالؔی نے سب سے پہلے بیان کیا ہے اس بارے میں وہ وزن کو لازم اور قافیہ وغیرہ کو ضروری قرار نہیں دیتے:

> ''وزن سے شعر کی خوبی اور اس کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے مگر قافیہ اور خاص کر ایسا جیسا کہ شعرائے عجم نے اس کو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ بند کر دیا ہے اور اس پر ردیف اضافہ فرمائی ہے شاعر کو بلاشبہ اس کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے''(۱۵)

حالؔی نے وزن کو شعر کی خوبی کے لیے ضروری سمجھا اور شعر کی دلکشی اور تاثیر میں اضافے کا سبب بیان کیا جبکہ قافیہ کو انھوں نے غیر ضروری سمجھ کر شعر کی ماہیت سے خارج قرار دے دیا۔ ان خیالات کی تائید میں انھوں نے جس طرح مغربی ادبیات کا سہارا لیا ہے وہ اس بات کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ اُن پر مغربی ناقدین کے گہرے اثرات ہیں۔ وزن کی خوبی کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے ''یورپ کے محقق'' کا قول نقل کیا ہے اور یہی قول اُن کی وزنِ شعر کے حق میں دلیل ہے۔ قافیہ کو شعر کی ماہیت سے خارج کرنے کے پس منظر میں حالؔی نے یورپ میں ''بلینک ورس'' یعنی ''غیر مقفیٰ'' نظم کی مقبولیت کو قرار دیا۔ ان کے نزدیک قافیہ سے شعر کا حسن دوبالا تو ہوتا ہے مگر شاعر اس کے اہتمام میں اپنے حقیقی جذبات کی ترجمانی سے محروم رہ جاتا ہے حالؔی شعر کی خوبی اس کے فی الفور اثر میں سمجھتے ہیں خواہ اس سے حکمت کا کوئی مقصد حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس طرح قدیم اسلوبِ غزل میں پہلی اصلاح دیتے ہوئے انھوں نے ردیف وقافیہ کی پابندی کو غیر ضروری ٹھہرایا ہے۔

حالؔی کو غزل کی ظاہری صورت میں کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی البتہ انھوں نے اس کے معنوی پہلو کی طرف ضرور توجہ دی ہے۔ اُردو غزل، ایک خاص ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے ابتذال کا شکار، اخلاقی بگاڑ کا وسیلہ اور حقیقت واصلیت سے دور ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں اس کی آمد فارسی کے ذریعے ہوئی۔ ابتداءً اس کا استعمال عشق ومحبت کے مضامین کے ساتھ مخصوص رہا مگر رفتہ رفتہ زندگی کے دوسرے موضوعات بالخصوص تصوف اور اخلاقی تعلیمات نے بھی غزل میں جگہ حاصل کر لی۔ اردو غزل میں عاشقانہ خیالات کو اس کثرت سے برتا گیا کہ وہ غزل کا رکنِ اعظم اور جزوِ لازم نظر آنے لگے۔ حالؔی کو غزل کی یہ تحدید پسند نہیں

تھی وہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہشِ حیوانی کے دائرے میں بند رکھنے پر ہرگز تیار نہ تھے۔ محبت کا جذبہ صرف ایک رُخ سے بیان کرنا نہ صرف غزل کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا بلکہ اس نے محبت کے مفہوم کو بھی محدود کر دیا کیونکہ انسان کو والدین، اولاد، اقربا اور دوستوں وغیرہ سے درجہ بدرجہ محبت ہوتی ہے اور حالؔی کے نزدیک غزل میں محبت کا یہی وسیع اور حقیقی مفہوم بیان کرنا چاہیے اس کے علاوہ وہ عاشقانہ مضامین کو رمز و ایماء کی صورت میں پیش کرنے پر زور دیتے ہیں غزل کے ہر شعر کو دوسرے سے مختلف ہونا، حالؔی کو ضروری نہیں لگا بلکہ وہ غزلِ مسلسل کے لکھنے پر زور دیتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''غزل میں جو عشقیہ مضمون باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع واقسام اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہیں آنا چاہیے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔۔۔ اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔''(۱۶)

حالؔی نے غزل کی خراب حالت کو محسوس کیا اور اس کو چھچھورے جذبات اور لایعنی احساسات سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کوشش کی کہ غزل میں عشق کا ایک بلند تصور پیش کیا جائے اس کے مضامین کو وسعت دی جائے اور زبان و انداز بیاں کی سادگی کو اپنایا جائے۔ غزل کے متعلق حالؔی کے یہ خیالات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کی اصلاح کے سلسلے میں اپنے اُن تنقیدی خیالات و نظریات کو پیشِ نظر رکھا جو انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے پہلے حصے میں پیش کیے ہیں۔ وہ غزل میں، سادگی، اصلیت اور جوش کے ساتھ ساتھ وسعتِ مضامین، تسلسل اور عشق و محبت کے باب میں اخلاقی معیار کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے آرزو مند ہیں۔ عبادتؔ بریلوی نے حالؔی کی تنقید کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے اپنے قائم کردہ اصولوں اور تنقیدی خیالات و نظریات کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا۔(۱۷) غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کے بارے میں ان کے خیالات اسی طرح کے ہیں اور وہ ان پر بھی اپنے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ قصیدہ:

قصیدہ، مشرقی شاعری کی ایک اہم صنف ہے خصوصاً عربی اور فارسی شعری روایت میں قصائد کی

تاریخ بہت پرانی ہے۔ اردو میں یہ صنف فارسی کے ذریعے وارد ہوئی اور اردو کے کلاسیکل دور کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے کسی بادشاہ یا نواب کا قصیدہ نہ لکھا ہو۔ کلاسیکی شعرا میں سوداؔ کو اس فن میں کمال حاصل تھا جن کے قصائد اردو شاعری میں بلند مقام کے حامل ہیں۔ اسی طرح ابراہیم ذوقؔ کو قصیدہ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ ہمارے کلاسیکل دور کے اردو شعرا کے قصائد میں ایک کمزوری عمومی پائی جاتی ہے اور حالیؔ نے اسی کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ قصیدہ گو شعرا کی خاصیت یہ رہی ہے کہ اپنے ممدوح کی تعریف بیان کرتے کرتے وہ مدح سے خوشامد پر اتر آتے تھے۔ بزرگان دین کے بارے میں لکھے گئے قصائد اس بحث سے خارج ہیں کہ ان کا محرک ہمیشہ محبت و عقیدت رہی ہے لیکن شاہوں اور نوابوں کی مدح میں یہ غلو کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ حالیؔ نے اس بات پر زور دیا کہ مدح کو خوشامد نہ بننے دیا جائے اور شاعر کو چاہیے کہ وہ اپنے ممدوح میں صرف ان اوصاف کا اثبات کرے جو حقیقتاً اس میں پائے جاتے ہوں اور ان کی خوبی ایسی ہو کہ شاعر کے دل کو مدح و ستائش پر مجبور کر دے۔

۳۔ مرثیہ:

مرثیہ کی روایت عربی اور فارسی کے ذریعے اردو میں داخل اور بے حد مقبول و عام ہوئی۔ مرثیہ پر ایک حد تک مدح کا اطلاق کیا جا سکتا ہے کہ اس میں متوفی کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں تاہم اصل نکتہ جو اسے قصائد سے ممتاز کرتا ہے وہ مراثی میں ماتم گساری کا عنصر ہے جس پر مرثیہ کی اساس رکھی جاتی ہے۔ اردو میں مرثیہ گوئی کی مقبولیت کا راز "واقعۂ کربلا،، کا بیان ہے جو زیادہ تر مراثی کا موضوع ہے۔ حالیؔ نے مرثیہ گوئی کی اصلاح کے لیے دو اہم باتیں کی ہیں۔ ایک تو وہ نئے شعرا کو مرثیہ گوئی سے منع کرتے ہیں جس کی وجہ ان کے نزدیک مراثی کے لوازمات، رزم و بزم کے واقعات، تیر و تلواروں کی نمائش اور شاعرانہ ہنر کا اظہار ہیں جو مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہے۔ اس لیے سوچ سوچ کر مقفع و مسجع فقرے بنانے کی بجائے، جہاں تک ممکن ہو، زبان کی صفائی، مضمون کی سادگی و بے تکلفی، کلام کے موثر بنانے اور آورد کو آمد دکھانے میں صرف کرنا چاہیے اس طرح غور و فکر اور کانٹ چھانٹ کے بعد جو شعر وجود میں آئے گا وہ، ایسا ہوگا گویا ابھی شاعر کے قلم سے ٹپکا ہے۔ مرثیہ کی اصلاح کے لیے ان کی دوسری تجویز یہ ہے کہ مراثی کے مضامین میں توسیع کی جائے اور ان کو صرف واقعۂ کربلا کے ساتھ محدود نہ کیا جائے۔ شاعری کی اصلاح میں ان کی یہ تجویز بہت مناسب ہے کہ موضوعات کی وسعت سے شاعری کا ارتقا یقینی ہے۔ اس لیے حالیؔ نے جب مرثیہ لکھا تو اس کا موضوع اپنے بھائی اور اپنے استاد مرزا غالبؔ کی شخصیات کو بنایا۔

۴۔ مثنوی:

اردو شاعری میں مثنوی کی صنف بھی بہت مقبول رہی ہے۔ اسے غزل اور قصیدہ کے برخلاف ایک خصوصیت یہ حاصل ہے کہ اس میں ایک قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ اردو میں اس کی روایت فارسی سے آئی اور کسی مسلسل مضمون کو بیان کرنے کے لیے یہ بہترین صنف ہے۔ مثنوی کا اردو شاعری میں زیادہ تر استعمال عشقیہ قصے بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور اس موضوع پر بے شمار مثنویاں لکھی گئی ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے گنی چنی مثنویاں ایسی ہیں جو اچھے ادب کے معیار پر پورا اترتی ہیں۔ حالؔی نے مثنوی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے۔ اس کے معائب دور کر کے مثنوی کے بہتر استعمال کی دعوت دی ہے۔ وہ مثنوی میں مافوق العادت قصص کے بیان کے خلاف ہیں اور مبالغہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ حالؔی واقعات کے بیان کو اتنا نیچرل رکھنا چاہتے ہیں کہ جیسے حقیقت میں اس کا امکان ہو۔ قصے کے مختلف مقامات ایک دوسرے کی تکذیب نہ کرتے ہوں اور ان میں ایک ربط ہو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے، راز و نیاز اور باہم اختلاطِ مرد و زن کی باتیں رمز و ایما میں کی جائیں۔

غزل، قصیدہ مرثیہ اور مثنوی وغیرہ کے بارے میں حالؔی کے خیالات کا ایک اساسی نکتہ یہ ہے کہ وہ ان اصناف کی اہمیت کے قائل لیکن ان کی قدیم ہیت و روایتی موضوعات کے خلاف ہیں۔ ان پر مغربی نیچرل ازم کے اثرات اس قدر گہرے پڑے کہ وہ اردو شاعری کے قدیم اسلوب کو ہر سطح پر نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ حالؔی نے اپنے عہد کا ادراک کر کے تبدیلیوں کو قبول کیا کیونکہ وہ یہ بات سمجھ گئے تھے کہ نئے دور کے تقاضے اس قدر ضروری ہیں کہ ان کا حصول اردو شاعری کی ترقی کے لیے لازم ہے اور ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اردو شاعری کی قدیم روایت کی اصلاح اور جدید شعری رجحانات سے استفادہ وقت کی اہم ضرورت ہے "مقدمہ"، میں انھوں نے شعرا کے لیے جو تجاویز دی ہیں ان کے ماخذات مغربی ادبیات سے ماخوذ ضرور ہیں لیکن ان کی خوبی اور اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔

حالؔی کے نزدیک شاعری کی طرف اسی شخص کو متوجہ ہونا چاہیے جس میں قدرتی ملکہ، فطری رجحان اور پیدائشی استعداد موجود ہو ورنہ ان صفات سے محروم شخص کی مشقِ سخن وقت کا زیاں ہوگا۔ اس معاملے میں وہ استاد سے اصلاح لینے کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے ان کے خیال میں استاد زیادہ سے زیادہ گرامر یا زبان کی غلطیاں نکال سکتا ہے اور اس طرح شعر کی نوک پلک سنوارنے کے لیے مفید مشورے دے سکتا ہے لیکن نہ تو شاعر کو بلند کر سکتا ہے اور نہ اپنے جیسا بنا سکتا ہے۔

کائنات کا مطالعہ، ان کی، اچھے شاعر کے لیے مقرر کی گئی شرائط میں سے اہم شرط ہے، اساتذہ کے منتخب کلام کو بار بار پڑھنا اور اسے حفظ کر کے ان سے استفادہ کرنا حالی نے لازم قرار دیا ہے اسی طرح اساتذہ کی صحبت، مبالغہ و جھوٹ سے اجتناب، زبان کا درست استعمال وغیرہ جیسی کئی اہم باتوں کو شاعری کے لوازمات میں سب سے پہلے، اردو میں، حالی نے متعارف کرایا۔

مقدمہ شعر و شاعری'' کے علاوہ یادگار غالب اور حیات سعدی وغیرہ جیسی سوانح عمریوں میں حالی کے تنقیدی افکار واضح نظر آتے ہیں۔ یہ کتابیں چونکہ ''مقدمہ'' کے بعد لکھی گئی ہیں اس لیے ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ حالی نے ''مقدمہ'' میں جو تنقیدی معیارات قائم کیے ہیں غالب اور سعدی کے کلام کو انہی معیارات پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح مقدمہ شعر و شاعری اگر ان کی نظری تنقید ہے تو مذکورہ بالا سوانح عمریاں ان کی عملی تنقید کا ثبوت ہیں۔ ''یادگار غالب'' حالی کے استاد و محبوب، مرزا اسداللہ خاں غالب کی سوانح عمری ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں غالب کے کردار کے پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ ان کی خصوصیات بھی ظاہر ہو گئیں اور بے جا مداحی سے دوری بھی رہی۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا:

> ''یادگارِ غالب میں حالی نے انہی اصولوں کی روشنی میں مرزا غالب پر روشنی ڈالی ہے جو
> مقدمہ شعر و شاعری میں بیان کیے ہیں۔ یہاں ان کی تنقید میں انتخاب و تشریح کا پہلو
> غالب ہے۔''(۱۸)

اس کتاب کی اہمیت اس کے دوسرے حصے کی وجہ سے ہے جس میں مرزا صاحب کے کلام کو پرکھا گیا ہے اور تنقیدی زاویہ نظر سے اس کا جائزہ لیا گیا ہے حالی کی اپنی تصریح کے مطابق:

> ''دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام، نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر قسم پر جُدا
> جُدا ریویو اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت استادوں
> کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔''(۱۹)

کتاب کا یہی دوسرا حصہ اس سوانح عمری کی تالیف کا اساسی سبب ہے مولانا نے غالب کے سوانحی حالات کو کتاب کے ۱۰۵ صفحات تک محدود رکھا اور ان کے کلام کے تنقیدی جائزے کے تقریباً ۳۳۲ صفحات مختص کیے ہیں۔ مرزا کے کلام کو فارسی شعرا کے کلام کے معیار پر پرکھنا اور ان کے کلام کی توصیف کرنا، حالی کے تنقیدی ذوق کی علامت ہے۔ ''حیات سعدی'' کا آغاز ''یادگارِ غالب'' سے قبل لیکن اس کی تکمیل مذکورہ تالیف کے بعد ہوئی۔ سعدی شیرازیؒ کے سوانحی حالات کو اختصار سے بیان کر کے حالی نے ان کے کلام کا

تفصیلی جائزہ، اسی طرح اپنے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں، لیا جس طرح وہ یادگار غالب کے باب میں کر چکے تھے۔ مقدمہ کے علاوہ یہی دو کتابیں حالی کے تنقیدی شعور کا اظہار کرتی ہیں۔

اردو ادب میں حالی وہ پہلے نقاد ہیں جن کے تنقیدی نظریات منظم و مربوط شکل میں ملتے ہیں، ان کا تنقیدی نظام جزئیات کے بجائے اصولوں پر توجہ دیتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی ماہیت پر غور کیا، شعر کی خوبی، تاثیر، شاعری کے لوازم، سماج اور شاعری کا تعلق اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف اصناف سخن پر، اردو میں، پہلی بار تفصیلی، مدلل اور اصولی بحث کی۔ ان سے پہلے اردو میں تنقیدی شعور کی بلند ترین سطح، ذوق و وجدان کو سمجھا جاتا تھا۔ سب سے مفصل تنقید کی آخری حد عروض وقافیہ کی تحقیق اور زبان کی خوبی تک مقرر تھی۔ اس پر تنقید کسی مدوّن و منظم شکل میں موجود بھی نہ تھی کہ مختلف نقادوں کے معیاراتِ تنقید کو پرکھا جاتا اور کسی اختلاف کی صورت میں متفقہ اصولوں کی روشنی میں کسی ایک قول کو ترجیح دی جا سکتی۔ ان حالات میں حالی نے ایک مربوط، منظم، معقول اور جاندار تنقید کی ابتداء کی۔ ان کے دور میں انگریزی اثرات کے تابع، ہندی معاشرے پر معقولیت پسندی کا رجحان غالب آ چکا تھا۔ ہر شعبۂ زندگی میں اصلاحی کوشش جاری ہوئیں اس متحرک دور میں ادب کی اصلاح کا خیال جب پیدا ہوا اور اس کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں تنقید ایک باقاعدہ فن کی شکل میں نمودار ہو گئی۔ حالی نے خصوصی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا۔ انھوں نے مغربی ادبیات کے بالواسطہ مطالعے سے ان کے جاندار تنقیدی نظام کی خوبیوں کو دریافت کیا اور ان کی روشنی میں اردو شاعری کے لیے نئے معیارات قائم کیے، مبالغے اور بے لگام تخیل سے مملو اردو شاعری کو سادگی، اصلیت، واقعیت اور جوش جیسی صفات اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ اردو کی مختلف اصنافِ سخن کا تنقیدی جائزہ لیا اور ان کے نقائص کی نشاندہی کی، نئی تنقید کی بنیاد رکھنے والے حالی کا یہ تجدیدی کام صحیح معنوں میں اس وقت مکمل ہوا جب انھوں نے جدید تنقیدی اصولوں کے قائم کردہ معیارات کے عین مطابق اعلیٰ درجے کی شاعری تخلیق کی اور اس طرح، جو دعوت دی اس کے قابلِ عمل ہونے کا مضبوط ثبوت فراہم کر دیا۔

حوالہ جات

۱۔ شیما مجید (مرتبہ) "مقالاتِ جمل"، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، بار اوّل ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۱۸
۲۔ محمد اکرام شیخ، "موجِ کوثر" ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور ۲۰۰۹ء، صفحہ ۸۲
۳ الطاف حسین حالی، "یادگارِ غالب" ادارہ یادگار غالب، ناظم آباد کراچی ۱۹۹۷ء، صفحہ ۳-۲
۴۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر "اردو تنقید کا ارتقاء" صفحہ ۱۵۸

۵۔ وحید قریشی ڈاکٹر (مرتب) ''مقدمہ شعر و شاعری'' مکتبہ جدید، لاہور، س۔ن، صفحہ ۹
۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر ''اردو تنقید کا ارتقاء''، صفحہ ۱۵۹
۷۔ خلیل عبدالاحد (مرتب) مضمون ''تذکرہ حالی'' مشمولہ ''اردو غزل کے پچاس سال'' مکتبہ کلیسان لکھنؤ ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۷۵
۸۔ وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب) ''مقدمہ شعر و شاعری'' صفحہ ۶۱
۹۔ ایضاً ایضاً، صفحہ ۶۶
۱۰۔ ایضاً ایضاً، صفحہ ۶۹
۱۱۔ ایضاً ایضاً، صفحہ ۴۵
۱۲۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ''مطالعۂ حالی'' صفحہ ۵۲ـ۵۳
۱۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ''مقدمہ شعر و شاعری'' صفحہ ۴۸
۱۴۔ ایضاً ایضاً صفحہ ۵۰
۱۵۔ وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب) ''مقدمہ شعر و شاعری''، صفحہ ۳۸
۱۶۔ ایضاً ایضاً، صفحہ ۱۲۳
۱۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر ''اردو تنقید کا ارتقاء'' صفحہ ۱۶۷
۱۸۔ ایضاً ایضاً، صفحہ ۱۵۱
۱۹۔ الطاف حسین حالی ''یادگار غالب'' صفحہ ۷

☆☆☆☆

شگفتہ پروین

یادگارِ حالؔی

مولانا الطاف حسین حالؔی پر پہلی سوانح عمری ۱۹۳۵ء میں محمد اسماعیل پانی پتی نے ’’تذکرۂ حالؔی‘‘ کے عنوان سے تحریر کی۔ محمد اسماعیل حالؔی کے ہم وطن ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان، دوست، احباب اور ان کے تصنیفی سرمائے سے بھی کامل آگاہ تھے۔ وہ کافی عرصہ حالؔی لائبریری کے انچارج بھی رہے مگر یہ جملہ سہولتیں میسر ہونے کے باوجود انھوں نے ایک کمزور سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اسے حالؔی کی زندگی اور شخصیت کے زیادہ تر پہلوؤں کی عکس کشی کے لحاظ سے ایک اہم حوالہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سوانح کا تیسرا حصہ خاصا کمزور ہے۔ اس حصے میں مختصر طور پر تصانیف کا تعارف کروایا گیا ہے۔ سوانح عمری کا عنوان ’’تذکرہ حالؔی‘‘ ہے۔ مصنف نے عنوان کا تاثر حتی المقدور برقرار رکھا ہے۔ دوسری سوانح عمری ۱۹۴۹ء میں صادق قریشی نے بعنوان ’’ذکرِ حالؔی‘‘ لکھی۔ یہ بھی خاصی کمزور سوانح عمری ہے۔ مصنف نے محض سیرت و شخصیت پر چند مضامین یکجا کر دیے ہیں۔ اسے بجا طور پر تعارفی کتابچہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا پر تیسری سوانح عمری ۱۹۵۰ء میں ’’یادگارِ حالؔی‘‘ کے عنوان سے منصۂ شہود پر آئی۔ اس کی مصنفہ صالحہ عابد حسین ہیں۔ یہ مولانا کی نواسی تھیں۔ ان کی شخصیت اور عظمت سے بہت متاثر تھیں۔ انھی خصائص نے انھیں سوانح عمری ترتیب دینے پر قائل کیا۔

’’یادگارِ حالؔی‘‘ میں مصنفہ نے مولانا حالؔی کی زندگی، ان کی طرزِ بود و باش، ان کے اخلاق و عادات، ان کے اوقات و مشاغل، ان کے اعتقادات اور ان کے نظریات کا صحیح نقش، ان کی تصنیفات، دوست احباب اور اپنے خاندان کے افراد سے معلومات حاصل کر کے کھینچا ہے۔ انھوں نے کتاب کو واضح طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ نشو و نما ہے جس میں حالاتِ زندگی احسن انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسرا حصہ آب و رنگ کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ جس میں حالؔی کی بے نظیر شخصیت کے متعدد پہلو عیاں کیے گئے ہیں۔ برگ و بار یعنی تیسرے حصے میں مولانا کے تصنیفی سرمائے کا بالاستیعاب مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ہندوستان سے تین بار شائع ہو چکی ہے۔ دوسری اشاعت کے دوران مصنفہ نے کچھ اضافے بھی کیے۔ جو موضوعات پہلی اشاعت کے دوران مبہم رہ گئے تھے انہیں دوسرے ایڈیشن میں تفصیل

سے بیان کیا ہے جب کہ تیسری اشاعت میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔

سوانح عمری لکھنا خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ مواد کی جمع آوری سے لے کر سوانح نگاری کے تکنیکی خصائص کی بجا آوری تک کئی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ سوانح نگاری کا فن، تاریخ جیسی وسعت، ناول جیسا پھیلاؤ، تنقید جیسا شعور، شاعر جیسا وجدان، تخلیقی توانائی، تحقیقی جستجو، منصفانہ اور اخلاقانہ رویے، صداقتِ اظہار اور مضبوط ہنر مندی کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ (۱) علاوہ ازیں یوں تو اردو ادب میں سوانح نگاری کے کئی اسلوب بیان مروج ہیں مگر بین الاقوامی طور پر سوانح نگاری کے لیے تحقیقی و تنقیدی اسلوب ہی معیاری گردانا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو ادب میں ایسے اسلوب میں لکھی گئی سوانح عمریاں بہت کم ہیں اور جب کہ افسانوی اسلوب میں لکھی گئی سوانح عمریاں زیادہ ہیں۔ یہاں چند ایک کے عنوان درج کرتی ہوں۔ زندگانی بے نظیر (عبدالغفور شہباز)، آثار ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں (قاضی عبدالغفار)، اکبراله آبادی، (طالب الہٰ آبادی) وغیرہ۔ جبکہ جدید تحقیقی و تنقیدی اسلوب میں لکھی گئی سوانح عمریوں کی نمائندہ مثالیں غالب نامہ (شیخ محمد اکرم)، غالب (غلام رسول مہر)، ذکرِ غالب (مالک رام)، زندہ رود (جاوید اقبال)، انیس (نیر مسعود) قرار دی جا سکتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین کا نظریہ سوانح نگاری مولانا حالیؔ سے مستعار ہے۔ انھوں نے بھی حالیؔ کے حالاتِ زندگی سے زیادہ شخصیت اور تصنیفات کے تنقیدی و تحقیقی جائزے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ سوانح کے پہلے حصے، 'نشو و نما' میں صالحہ نے حالیؔ کے ارتقائے حیات کو چیدہ چیدہ واقعات کی مدد سے بیان کیا ہے۔ عام طور پر سوانح عمریوں میں زیرِ بحث شخصیت کے آبا و اجداد کے متعلق بھی سیر حاصل تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ مصنفہ نے براہ راست حالیؔ کی پیدائش سے سوانح کا آغاز کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حالیؔ کی زندگی کی شروعات بھی نامساعد حالات سے ہوئی۔ والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ والدہ بھی دماغی خلل کے باعث معاملاتِ دنیا سے بیگانہ ہو گئیں۔ اس صورت حال میں بہن بھائیوں نے ان کی پرورش کی۔ حالیؔ فطری طور پر ذہین تھے۔ حافظہ اعلیٰ تھا اس لیے جب رسمی تعلیم کا آغاز ہوا تو بہت جلد قرآن حفظ کر لیا۔ پانی پت میں حافظ ممتاز اور حاجی ابراہیم حسین سے عربی اور فارسی زبان و ادب سیکھا اور بہت جلد ان دونوں زبانوں کے لٹریچر پر دست گاہ حاصل کر لی۔ سترہ برس کی عمر میں حالیؔ کی شادی کر دی گئی۔ ان کی شادی خوشحال گھرانے میں ماموں زاد اسلام النسا سے ہوئی۔ یہ شادی حالیؔ کی مرضی کے بغیر کی گئی تھی۔ وہ ابھی مزید علم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے گھر بتائے بغیر وہ دہلی چلے گئے۔ دہلی علم و ادب کے حصول کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ یہاں پر حالیؔ کو

معروف اساتذہ مولوی نوازش علی، فیض الحسن، مولوی امیر احمد، شمس العلما سید نذیر حسین سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مصنف نے یہاں یہ نہیں بتایا کہ کون سے استاد نے کس علم میں مزید جلا دی۔ حالیؔ کی پہلی تصنیف کا بھی یہی دور تھا۔ انھوں نے ایک عربی رسالہ لکھا جب استاد کو دکھایا تو انھوں نے پڑھ کر پھاڑ دیا۔ مصنف نے یہ واقعہ یوں درج کیا ہے کہ:

> ”غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا۔ جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر کی تائید میں تھا۔ جسے ان کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چوں کہ ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا اس لیے چاک کر دیا گیا۔ (۲)

دلی میں قیام کا ایک اور اہم واقعہ مرزا غالب سے ملاقات تھی۔ حالیؔ دیگر زبانوں کے علوم میں دست گاہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فطری ذوقِ شعری کو بھی فروغ دے رہے تھے۔ دہلی کے مشاعروں میں اکثر و بیشتر شریک ہوئے۔ مرزا غالب سے ان کے فارسی اور اردو کلام کے جن اشعار کی سمجھ نہ آتی، ان سے سمجھتے۔ حالیؔ نے فارسی اور اردو کی اپنی بھی کچھ غزلیں غالب کو دکھائیں۔ غالب نے برخلافِ توقع حوصلہ افزائی کی اور کہا:

> ”میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔“ (۳)

چناں چہ غالب کی نصیحت کی قدر کرتے ہوئے حالیؔ نے غزل گوئی کی طرف زیادہ دھیان دیا اور ”خستہ“ تخلص کر دیا۔

حالیؔ جب دوبارہ دہلی آئے تو نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔ ان کے واسطے سے حالیؔ کی معاشی فکر بھی ختم ہوئی اور علمی و ادبی صحبت بھی میسر آئی۔ حالیؔ شیفتہ کے ہم راہ غالب کے پاس تشریف لے جاتے۔ یہ دونوں غالب کے دوستدار تھے۔ ان کی علمی و ادبی لیاقت کے زبردست مداح تھے۔ حالیؔ مذہبی نوجوان تھے۔ مذہب کی ظاہری رسوم پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ جب دیکھتے کہ غالب کبھی بھولے سے بھی نماز نہیں پڑھتے، روزہ رکھتے نہیں بلکہ بہلاتے تھے۔ شراب نوشی کثرت سے کرتے تھے۔ حالیؔ کو گہرا رنج ہوتا۔

ایک مرتبہ غالب کو لمبا چوڑا خط لکھ ڈالا جس میں خاص طور پر نماز کی ادائیگی پر زور دیا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا "آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز ہجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔" (۴) اس زمانے میں کچھ اور لوگ بھی غالب کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ غالب کسی کی پروا نہ کرتے۔ لیکن حالؔی کی نصیحت نے انھیں سخت صدمہ پہنچایا۔ انھوں نے ایک غزل لکھ کر اس نصیحت کا شکوہ کیا۔ حالؔی کو اپنے عمل پر سخت ندامت ہوئی۔ حالؔی نے بھی ایک قطعہ لکھ کر معذرت کی۔

آخر غالب نے کہا "بس اب بیت بازی موقوف" غالب کی شکایت حالؔی سے محبت ہی پر مبنی تھی۔ وہ حالؔی کو بہت چاہتے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ (۵)

حالؔی کو ایک ہی برس میں دو رفقا شیفتہ اور غالب کی دوستی اور رفاقت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ۱۸۷۹ء میں یہ دونوں رفیق لبیک اجل کر گئے۔

حالؔی کی زندگی کا زیادہ عرصہ سرسید کی رفاقت میں گزرا۔ حالؔی سرسید کی زبردست شخصیت، ان کی مضبوط سیرت اور سب سے زیادہ ان کے بلند مقصد سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے رفقائے سرسید میں سے سب سے زیادہ کام حالؔی نے کیا۔ زندگی کے اڑتیس (۳۸) برس سرسید کے علمی و ادبی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے گزر گئے۔ سرسید بھی حالؔی کے خلوص اور کام کی بہت قدر کرتے تھے۔ "مسدس حالؔی" کو اپنے لیے فخر کا باعث قرار دیتے تھے۔ مصنفہ نے سوانح عمری میں سوائے "مسدس حالؔی" کی تعریف و توصیف کے سرسید کے ساتھ علمی و ادبی رفاقت کا کوئی گہرا نقش مرتسم نہیں کیا۔ میری دانست میں، مصنفہ اگر "حیات جاوید" ہی سے مدد لے لیتیں تو یہاں معلومات درج کی جا سکتی تھیں۔

حالؔی عمر بھر سوئی ہوئی قوم کو جگانے اور علمی و ادبی سرگرمیوں اور گھریلو ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے اعتراف میں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ حالؔی اس خطاب سے خوش نہ تھے بلکہ انھیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ اب مجھے گورنمنٹ کی طرف سے منعقدہ مختلف تقریبات میں شرکت کرنا پڑا کرے گی۔ ایسے امور حالؔی کی طبیعت کے خلاف تھے۔ ۱۹۰۵ء میں حالؔی نے ایک مدرسہ بنانے کے لیے چندہ جمع کیا۔ یہ رقم سکول کے قیام کے لیے کم تھی، چناں چہ انھوں نے پانی پت کے وسط میں ایک لائبریری بنا دی۔ ان کے بیٹے نے بھی تھوڑے عرصے بعد مسلم ہائی سکول کے عنوان سے سکول قائم کیا جو ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔

۱۹۰۷ء تک حالؔی کی بینائی خاصی کمزور ہو گئی۔ زیادہ علیل رہنے لگے۔ بہت سا وقت بیماری کے علاج

میں گزرنے لگا۔ انھیں اس ضمن میں اورنگ آباد و فرید آباد کے کئی اسفار بھی کرنا پڑے۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔ حالی ان بیماریوں میں گھرے ہونے کے باوجود علمی و ادبی کاموں میں برابر منہمک رہے۔ اپنی عربی اور فارسی تحریروں کا مجموعہ بھی اپنی وفات سے چند ماہ پہلے ہی ترتیب دیا۔

چار سال کی عمر سے اسی (۸۰) سال تک تقریباً چھتر برس کام کرنے والا بیدار مغز شخص ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء کو خالقِ حقیقی سے جاملا۔

سوانح عمری کے اس حصے میں بہت سی معلومات کی تشنگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً حالی بہت مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ ان صفحات میں ایسی تفصیلات نہیں۔ نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ حالی نے شعر گوئی کا آغاز کب کیا۔ ابتدائی طور پر کن اساتذہ نے حوصلہ افزائی کی۔ سوانح میں حالی کے دوست احباب کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا گیا۔ اگرچہ تسلسلِ حیات میں نمایاں طور پر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، غالب، سرسید، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر لیاقت حسین سے محبت اور دوستی کے مراسم بھی معلوم ہوتے ہیں۔ حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک کا کیا رنگ تھا، مصنفہ نے ان کے تعلقات کی بھی وضاحت نہیں کی۔ سوانح میں حالی کی تاریخ وفات کو زیادہ واضح کر دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ حالی ۳۱ دسمبر کی شب کو انتقال کر گئے۔ مصنفہ کے لیے وقت کا تعین کرنا بھی سہل تھا اور ضروری بھی۔ اسی طرح انھوں نے جائے مرقد کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائیں ہیں وہ بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ کیوں کہ مولانا اسماعیل پانی پتی نے اپنی سوانح عمری میں تو وضاحت نہیں کی مگر ''کلیاتِ نثر حالی'' کی ترتیب کے دوران اعتماد بخش دلیلیں دی ہیں۔ جو معالجہ کی معلومات کو مشکوک ٹھہراتی ہیں۔ مثلاً محمد اسماعیل کلیات کے دیباچہ کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''۱۳/صفر ۱۳۳۳ ہجری مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو جمعرات کا دن، رات کے دو بجے حضرت شمس العلما مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی کا پانی پت میں انتقال ہوا اور دوسرے دن یکم جنوری ۱۹۱۵ء کو وہ حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے بیرونی احاطے میں حوض کے کنارے دفن کر دیے گئے۔ (۶) (دیباچہ کلیاتِ نثر حالی)
>
> اسی طرح حالی کی جائے مرقد کی تفصیلات درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
>
> یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ صالحہ عابد حسین نے اپنی کتاب ''یادگارِ حالی'' میں لکھا ہے کہ ''سنگِ مرمر کی ایک خوبصورت قبر میں حالی آسودہ خواب ہیں'' اور اسی کی نقل ڈاکٹر شجاعت سندیلوی ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی نے ''حالی

> بحیثیت شاعر'' نامی کتاب میں کردی ہے، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ حالؔی کی قبر سنگ مرمر کی ہے نہ اینٹوں کی، نہ پختہ ہے نہ خام، ایک وسیع وعریض چبوترے پر، جس پر اور بھی قبریں بنی ہوئی ہیں، لوہے کا ایک کٹہرا لگا دیا گیا ہے اور یہی حالؔی کی آخری آرام گاہ ہے۔ کتبہ بھی کوئی لگا ہوا نہیں۔ صرف واقف آدمیوں کو پتہ ہے کہ یہ حالؔی کی مرقد ہے۔ (محمد اسماعیل) (۷)

میرے خیال میں اب یہ کہنا سہل ہے کہ حالؔی کی تاریخ وفات یکم جنوری ۱۹۱۵ء ہی ہے۔

''یادگارِ حالؔی'' کا دوسرا حصہ یعنی ''آب و رنگ'' اس سوانح کا سب سے دلچسپ، جاندار اور وقیع حصہ ہے۔ اس حصے میں مصنفہ ہمیں حالؔی کی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں سے آگاہ کرتی ہیں۔ یہاں میں فرشتہ خصائل انسان کی شخصیت کے محض چند پہلوؤں کے متعلق اقتباسات درج کرتی ہوں۔

> ان کا لباس عام طور پر کرتا، پاجامہ اور اچکن ہوتا تھا۔ زیادہ تر صافہ باندھتے تھے۔ جاڑے میں اچکن پر چوغہ یا روئی کا دگلہ ہوتا تھا اور گلے میں مفلر لپیٹ لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایک گول سی ٹوپی بھی پہنا کرتے تھے۔ لباس کی صفائی ستھرائی اور موزونیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کا فرمانا ہے ''جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہنتے اور پسند کرتے تھے۔ لیکن چوں کہ سودیشی کے بڑے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی چوتار (باریک کھدر) کا تھان مل جاتا تو اس کے کپڑے بنا کر خوش ہوتے تھے۔'' (۸)

> ''موسمی پھل اور ترکاریاں بہت مرغوب تھیں۔ خاص طور پر آم اور خربوزے اور ان دونوں پھلوں کی غضب کی پہچان تھی۔ خواجہ سجاد حسین سے ایک مرتبہ کہا۔ قاضی کے حوض پر فلاں سمت ایک آم والا بیٹھتا ہے اس سے اتنے آم لے آؤ۔ آم زرد رنگ کے ہیں اور ہر آم کے منہ کے پاس ایک سرخ رنگ کا ناخون کا سا نشان تم دیکھو گے۔ اچھی طرح چھانٹ کرا یسے ہی آم لانا۔'' (۹)

''حالؔی اپنے آس پاس کی چیزوں کو آنکھ کھول کر غور سے دیکھتے تھے۔ ان کا مشاہدہ بہت باریک اور گہرا تھا۔ خواجہ سجاد حسین کا بیان ہے کہ والد مرحوم جو مشاہدہ کرتے تھے۔ اس کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ دو تین مرتبہ دلی میں جامع مسجد، چاوڑی بازار سے گزرتے ہوئے انھوں نے کہا پہلے ہر دس بیس آدمیوں میں سے

ایک دو آدمی جسمانی لحاظ سے دیکھنے کے قابل گزرتا تھا اور اب وہی دلی ہے کہ سینکڑوں میں ایک آدمی بھی روادار نظر نہیں آتا۔۔۔۔“(۱۰)

قابل اور ہونہار نوجوانوں کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ آج کل کے کئی بڑے بڑے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی سب سے پہلے حالؔی نے کی۔ کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی تعریف اور قدر کرتے تھے۔ مولوی ظفر علی کے اخبار ”زمیندار“ اور ان کی اس وقت کی قومی خدمات سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ مولوی عبدالحق کے اخبار ”افسر“ کی تعریف اور اس کے مضامین کی داد ان کے بہت سے خطوں میں ملتی ہے جو انھوں نے مولوی عبدالحق کو لکھے ہیں۔ (۱۱)

طبیعت اگرچہ بے حد سنجیدہ پائی تھی لیکن اس کے باوجود مزاج میں شگفتگی تھی۔ صحبت خشک یا بے مزہ نہیں ہوتی تھی بلکہ جو لوگ ان کی صحبت سے فیض اٹھاتے وہ اس سے ایک نئی زندگی اور طاقت حاصل کرتے تھے۔ مولوی محمد تکی تہا پر ان کی صحبت سے جو کیفیت طاری ہوئی تھی اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

آتا ہوں پیرِ دہر کی خدمت میں مست میں
اے زاہدو تمہارے لیے کیا دعا کروں

مزاج میں لطیف مزاح بھی موجود تھا۔ ایک جگہ اپنے بارے میں بیٹے کو لکھتے ہیں:

”جو شخص شیطان سے زیادہ مشہور رہا۔ اس کے مرنے کو کوئی چھپا نہیں سکتا۔“ ایک اور جگہ ایک صاحب کے بارے میں لکھا ”ان کا ارادہ ایسا ہوتا ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے۔“(۱۲)

علاوہ ازیں مولانا کی وسیع قلبی، وسیع المشربی، استغنا، قناعت، مصلح، حیا کا مادہ، عیب اور بدگوئی سے احتراز، نفاست و سلیقگی، نظم و ضبط، مہمان نوازی، وضع داری، اعتدال و توازن، متانت و سنجیدگی، صلح جوئی، بچوں سے محبت، ہمدردی، رقیق القلبی، شہرت سے گریز جیسی خوبیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ ان صفات کی دلیل میں مصنف نے زیادہ تر ان کی عائلی زندگی سے مثالیں پیش کی ہیں۔

”یادگارِ حالؔی“ کا تیسرا حصہ بھی خاصا طویل ہے۔ مصنف نے حالؔی کی مطبوعہ تحریروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ حالؔی پر جو دیگر سوانح عمریاں رقم ہوئی ہیں ان میں حالؔی کی تصنیفات کا جائزہ پیش نہیں کیا گیا۔ اس لحاظ سے یہ سوانح عمری قابل لحاظ ہے، مصنف نے حتی المقدور ان کی تصنیفات کی خوبیوں کی روشنی میں اردو ادب میں حالؔی کا مقام و مرتبہ متعین کیا ہے۔ انھوں نے حالؔی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا زیادہ تعارف

نہیں دیا۔ ایک غیر مطبوعہ کتاب جس کی کچھ تفصیلات خطوط میں درج ہیں، اس کا ذرا تفصیل سے حوالہ دیا ہے۔ حالؔی طنزیہ و تمسخرانہ انداز میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہوتی۔ اس تصنیف کا عنوان ''آل نامہ'' ہے۔ اس کا اندازِ تحریر یہ تھا:

المذہب : اعلانِ جنگ
الدین : تقلیدِ آباو اجداد
العلم : قسمے از جہل مرکب
الامتحان : آزمائشِ لیاقت ممتحان
الیونیورسٹی : کارخانہ کلرک سازی
المسلمانان ہند : چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگان
العلی گڑھ پارٹی : شہید وفا
العلی گڑھ کالج : پرورش گاہ طفلاں بدست مانندراں
الانجمن ہائے اسلامیہ : سبزۂ برشگال
الاتفاق در مسلمانان : چوں اجتماع در نقیضین
الرئیس : آنکہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر : آنکہ تہی دست قرض دار باشد
المولوی : آنکہ مسلمانان را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد
الواعظ : آنکہ در تعریف بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار : بہانہ آدم کشی
الکمشیں : وجہ موجہ برائے فیصلہ یک طرفہ
النیشنل کانگریس : در حق تعلیم ہند چون بغاوت ۱۸۵۷ء در حق اسلحہ اہلِ ہند۔

مصنفہ نے مولانا حالؔی کی شعر گوئی کا جائزہ بلحاظ اصناف لیا ہے۔ غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ و نعت، مسدس، نظم وغیرہ۔ صالحہ عابد نے سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں حالؔی کی شاعری کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تفحص کی روشنی میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حالؔی کی شاعری کا عاشق جھوٹا تھا۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ بات حالاتِ زندگی اور سیرت کے آئینے میں سچ مانی جا سکتی ہے۔ انھوں نے حالؔی کی

شاعری پر جن شعرا کے اثرات ہیں، انھیں بھی بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

> میر سے دردِ دل لیا، اور درد سے تصوف کی چاشنی، غالب سے حسنِ تخیل، ندرتِ فکر اور شوخیِ گفتار سیکھی اور سعدی سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی اور شیفتہ سے سیدھی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانے کا فن اور ان سب کی ترکیب سے حالؔی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔ اگر چہ یہ خصوصیات غزل سے زیادہ ان کی مسدس اور مثنوی میں جا کر چمکیں مگر غزل میں بھی ان کی انفرادیت اجاگر کر گئیں۔

نثری تصانیف کا جائزہ بھی جامع لیا گیا ہے۔ ”مقدمہ شعر و شاعری“ اور ”مکتوباتِ حالؔی“ کی اہمیت وافادیت پر خاصا زور دیا ہے۔ خطوط کے بیان میں ایک غیر مطبوعہ خط کا عکس بھی کتاب میں چسپاں ہے۔ مصنفہ نے نہایت غیر جانبداری سے اپنے تحقیقی وتنقیدی نتائج پیش کیے ہیں۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوانح عمری خلوص اور ہمدردی کے جذبے سے لکھی گئی ہے۔ حالؔی کی سیرت اتنے اعلیٰ اوصاف کی حامل ہے کہ مصنفہ کو کہیں بھی جانبداری کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کی شہرت فرشتوں جیسی اور ان کا علمی تبحر اردو ادب کو نئی راہوں سے روشناس کرانے والا تھا۔ متانت حالؔی کی شخصیت کی نمایاں خوبی تھی۔ مصنفہ کا اسلوب تحریر بھی اسی خوبی سے متصف تھا۔ کہیں تشبیہات واستعارات کا سہارا نہیں لیا گیا نہ ہی شکوہ لفظی کی فسوں گری سے کام لیا ہے۔ سادہ اور رواں اسلوب میں موضوع، شخصیت کی حیات، سیرت اور ادبی مقام ومرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ ہر جگہ ماخذات کا اندراج بھی ساتھ ساتھ کیا ہے۔ سوانح عمری میں بعض واقعات کو بار بار درج کیا گیا ہے۔ مثلاً حالؔی کا غالب کو نماز پڑھنے کی تاکید کرنا، سرسید سے تعلقات اور عورتوں کی ترقی وخوشحالی کے لیے کی گئی کاوشیں۔

مصنفہ نے تصنیف کے دیباچے میں بار بار حالؔی کے متعلق مواد میسر نہ ہو سکنے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ احباب جو حالؔی کو اچھی طرح جانتے تھے ان کی مدد نہ کرنے پر شکوہ کناں بھی ہوئی ہیں اور اس کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا شکریہ بھی ادا کیا ہے کہ انھوں نے نہ صرف مسودہ پڑھا بلکہ خود بھی کچھ یادداشتیں لکھ کر دیں۔ اس لیے ہمیں سوانح عمری میں کئی جگہوں پر تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی کلیات نثر حالؔی کی ترتیب کی مشکلات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ میری دانست میں اگر صالحہ عابد اور محمد اسماعیل کی لکھی گئی سوانح عمریوں کو سامنے رکھ کر ایک اور سوانح ترتیب دی جائے تو ایک مجمل سوانح عمری سامنے آ سکتی ہے۔ کیوں کہ صالحہ نے جو واقعات درج کیے ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر خاندانِ حالؔی ہے اور جو اسماعیل پانی پتی کی کتب اور

دیگر دوست احباب اسی طرح غیر مطبوعہ کتب کا تعارف بھی ''تذکرہ حالی'' میں موجود ہے۔ جب کہ ''یادگارِ حالی'' میں اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ یہ نکات میری دلیل کو روشن کرتے ہیں۔

حواشی

۱۔ محمد یار گوندل، ڈاکٹر، غالب پر سوانحی ادب، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۳۔۱۴
۲۔ صالحہ عابد حسین، ''یادگارِ حالی'' (طبع سوم)، علی گڑھ انجمن ترقی اردو (ہند) (س۔ن)، ص ۴۹
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً، ص ۳۵
۵۔ ایضاً، ص ۳۶
۶۔ اسماعیل پانی پتی محمد ''کلیات نثر حالی'' (دیباچہ)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء،
۷۔ ایضاً، ص ۳۴۵
۸۔ صالحہ عابد حسین، ''یادگارِ حالی'' (طبع سوم)، علی گڑھ انجمن ترقی اردو (ہند) (س۔ن)، ص ۷۶۔۷۷
۹۔ ایضاً، ص ۷۸
۱۰۔ ایضاً، ص ۸۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۸۱
۱۲۔ ایضاً، ص ۷۵
۱۳۔ اس کے متعلق معلومات ''یادگارِ حالی''، ص ۵۹ اور ''کلیاتِ نثر حالی''، ص ۴۵۳ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔
۱۴۔ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، ص ۱۴۷

☆☆☆☆

اختر رضا سلیمی

الطاف حسین حالی

الف	**زندگی نامہ**
پیدائشی نام	الطاف حسین
قلمی نام	خواجہ الطاف حسین حالی
ابتدائی تخلص	خستہ (بعد میں حالی)
سن پیدائش	1837ء بمطابق 1253ھ
جائے پیدائش	محلہ انصار، پانی پت، (مشرقی پنجاب)
والد کا نام	خواجہ ایزد بخش انصاری
والدہ کا نام	امتہ الرسول
والد کی وفات	1846ء حالی کی عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔
ابتدائی علمی استفادہ	سید جعفر علی (فارسی) حاجی ابراہیم حسین (عربی)
شادی	1852ء
زوجہ کا نام	اسلام النسا بیگم (حالی کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی تھیں)
دلی کا سفر	تقریباً 1853ء کے آغاز میں
دلی میں علمی استفادہ	مولوی نوازش علی، مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد، میاں نذیر حسین
دلی سے واپسی	1855ء
پہلی ملازمت	1856ء ضلع حصار کے کلکٹر کے آفس میں، جو سال بھر ہی رہی۔
آغاز سخن	1853ء لگ بھگ، ابتدائی غزلیں اسداللہ غالب کو دکھائیں اور بعد میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے مشورہ سخن کرنے لگے۔
پہلی نثری کتاب	مولود شریف۔ 1864ء
پہلی مطبوعہ نثری کتاب	تریاق مسموم۔ 1868ء۔

پہلا ترجمہ : علمِ طبقات الارض۔ 1872ء اور 1874ء کے درمیان۔

دوسری ملازمت : پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور۔ 1869ء۔

پہلی نظم : 1874ء میں برسات کے عنوان سے۔ یہ نظم انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لیے کہی گئی

علی گڑھ تحریک سے وابستگی : 1875ء

پہلی ملی نظم : مبارک باد۔ 1875ء مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی رسم افتتاح کے موقع پر

پہلی طویل نظم : مسدس مدوجزرِ اسلام، 1879ء

پہلی سوانح : حیات سعدی۔ 1886ء میں شائع ہوئی۔

مدرسۂ نسواں کا قیام : 1894ء

اہلیہ کی وفات : 22 اگست 1900ء

شمس العلما کا خطاب : 1904ء

پبلک لائبریری کا قیام : 1905-6ء کے درمیان

کراچی آمد : دسمبر 1907ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے کی صدارت کرنے کی غرض سے۔

عربی فارسی کلام کی ترتیب : 1912ء

وفات : 31 دسمبر 1914ء

تدفین : درگاہ بوعلی شاہ قلندر کے صحن میں (پانی پت، مشرقی پنجاب)

ب : تصانیف وتالیف (نثر)

مولود شریف : حالی کی اولین نثری تصنیف ہے، جو 1864ء اور 1870ء کے درمیان لکھی گئی لیکن ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ خواجہ سجاد حسین نے اسے 1923ء میں شائع کرایا۔

تریاقِ مسموم : پانی پت کے ایک پادری عماد الدین، جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا، کی کتاب ہدایت المسلمین کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کا سنِ تصنیف 1868ء ہے۔

تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے: پادری عمادالدین ہی کی ایک اور کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں لکھی گئی یہ مختصر کتاب 1871-72ء کے درمیان شائع ہوئی۔ جواب نایاب ہے۔

علمِ طبقات الارض : یہ کسی فرنچ مصنف کی عربی میں ترجمہ شدہ کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو 1872-74ء کے درمیان کیا گیا۔

مجالس النسا : یہ کتاب 1874ء میں لکھی گئی۔ عورتوں کی تعلیم تربیت کے لیے لکھی گئی اس کتاب پر کرنل ہالرائیڈ نے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھوں انھیں چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔

اصولِ فارسی : اس کا سنِ تالیف بھی 1874-75ء ہے لیکن یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی صرف تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

شواہد الالہام : یہ بھی اسی دور کی تصنیف ہے اور کبھی شائع نہیں ہوئی۔ تذکرہ ٔ حالی میں اس کے بارے میں درج ہے کہ اس میں مولانا نے عقلی دلائل سے نبوت اور الہام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے۔

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو : یہ کتاب مولانا حالی نے 1882ء میں فارسی میں محققانہ سوانح اور اپنے دیباچے کے ساتھ مرتب کر کے شائع کی۔

حیاتِ سعدی : یہ صرف حالی ہی کی نہیں اردو کی بھی پہلی باقاعدہ سوانح ہے۔ یہ کتاب 1886ء میں شائع ہوئی۔ یہ شیخ سعدی شیرازی کی سوانح ہے۔

مقدمہ ٔ شعر شاعری : اردو کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب، جس نے اردو شعر و ادب پر دور رس نتائج مرتب کیے اور آج بھی اس کی حیثیت مسلمہ ہے۔ پہلی مرتبہ 1893ء میں دیوانِ حالی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ بعد میں اسے الگ سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا اور اس کے اب تک سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

یادگارِ غالب : جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اردو کے عظیم شاعر اسداللہ خان غالب کی سوانح اور ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے، جو 1897ء میں شائع ہوئی۔

حیاتِ جاوید : سر سید کے حالاتِ زندگی پر مشتمل یہ کتاب 1901ء میں شائع ہوئی۔

مضامینِ حالی : مولوی سید وحیدالدین سلیم نے مولانا حالی کی زندگی ہی میں ان کے مضامین مرتب کر کے 1902ء میں شائع کرائے۔

کلامِ عربی و فارسی : حالی نے اپنے عربی و فارسی کلام کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ جو ان کی وفات سے چند ماہ پیشتر اگست 1914ء میں شائع ہو گیا تھا۔

مکتوباتِ حالی : دو جلدوں پر مشتمل حالی کے خطوط کا یہ مجموعہ 1925ء میں شائع ہوا۔

کلیاتِ نثر حالی جلد اول : شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالی کے مذہبی، اصلاحی، تاریخی اور سوانحی مضامین کو مرتب کر کے 1967ء میں شائع کرایا۔

کلیاتِ نثر حالی جلد دوم : حالی کی تقریروں اور تقریظوں کا یہ مجموعہ بھی شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ہی نے مرتب کر کے 1970ء میں شائع کرایا۔

(نظم)

مسدس مد و جزر اسلام : سر سید کی ترغیب پر لکھی گئی یہ طویل نظم مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے جس میں حالی نے مسلمانوں کی پستی و تنزلی کو موضوع بنایا۔ یہ نظم پہلی مرتبہ 1879ء میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے سینکڑوں ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

مجموعۂ نظم حالی : حالی کی مثنویات اور دیگر نظمیہ شاعری کا یہ مجموعہ 1890ء میں شائع ہوا۔ دوسری مرتبہ یہ مجموعہ ان کی زندگی ہی میں اضافوں کے ساتھ 1903ء میں شائع ہوا۔

دیوانِ حالی : حالی کا خود مرتب کردہ یہ دیوان پہلی مرتبہ 1893ء میں شائع ہوا جس میں ان کی اس سے قبل کی تمام غزلیں جمع کر دیں گئیں تھیں۔

ضمیمۂ اردو کلیاتِ نظم حالی : حالی کے فاسی و عربی کلام کا مجموعہ جسے خود حالی نے مرتب کیا تھا اور ان کی وفات سے چند ماہ قبل شائع ہوا۔ یہ ان کی زندگی میں چھپنے والی آخری کتاب تھی۔

کلیاتِ نظم حالی : حالی کی وفات کے بعد ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شاعری کے مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ جنھیں بعد میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کلیاتِ نظم حالی کے عنوان سے دو جلدوں میں مرتب کر کے مجلس ترقی ادب سے شائع کروایا۔ پہلی جلد 1968ء میں جب کہ دوسری جلد جنوری 1970ء میں منظرِ عام پر آئی۔ جس میں حالی کی تمام شاعری مدون کر لی گئی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسد مصطفیٰ

حیاتِ حالی از منشا پانی پتی: ایک غیر مطبوعہ سوانح

منشا پانی پتی ۲۲ دسمبر ۱۹۱۶ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام قریش علی مولانا الطاف حسین حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے تجویز کیا۔ قریش علی منشا، خواجہ عبدالولی کے فرزند تھے، جو مولانا حالی کی بیٹی عنایت فاطمہ کے چھوٹے بیٹے تھے۔ خواجہ عبدالولی چھوٹی عمر میں صرع کی بیماری کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کا ذکر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب چند ہم عصر میں حالی کے مضمون میں کیا ہے۔ مولانا حالی نے بھی بعض خطوط میں اپنے نواسے خواجہ عبدالولی کی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

منشا پانی پتی کا مولانا حالی سے ایک اور رشتہ پردادی کی طرف سے بھی ہے۔ منشا کے پردادا خواجہ محمد علی، مولانا حالی کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ یوں والد کی طرف سے ان کا حسب نسب بالکل وہی ہے جو مولانا حالی کا ہے۔

منشا تقسیم سے پہلے پانی پت میں پٹواری تعینات تھے۔ تقسیم کے وقت اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی تو اول فیصل آباد میں مقیم رہے۔ فیصل آباد میں انہیں ایک مکان بھی الاٹ ہو گیا اور ان کا تقرر بطور گرداور قانون گو ہوا۔ فیصل آباد میں ان کا قیام ۱۹۵۲ء تک رہا۔ اسی برس ان کا تبادلہ بطور نائب تحصیل دار بھکر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ بھکر، میانوالی، سمندری اور جڑانوالہ میں خدمات انجام دیتے رہے لیکن ان کا مستقل آشیانہ بھکر میں ہی رہا۔ منشا پانی پتی نے ۱۰ نومبر ۱۹۹۳ء کو بھکر میں وفات پائی اور اسی شہر میں آسودۂ خاک ہوئے۔

منشا پانی پتی کی بنیادی پہچان شاعر کی ہے، لیکن انہوں نے چند غیر مطبوعہ نثری تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ ''حیاتِ حالی'' ان میں سے ایک ہے جو مولانا الطاف حسین حالی کی سوانح حیات ہے۔ یہ غیر مطبوعہ ہے اور عام کاپی کے چھ سو چوہتر (۶۷۴) صفحات پر محیط ہے۔ اس سوانح کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کچھ ابواب کے نام موجود ہیں اور کچھ کے نہیں ہیں۔ اس کا سن تصنیف اور دیباچہ بھی موجود نہیں ہے۔ جہاں تک سن تصنیف کا تعلق ہے، اس کے آغاز کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ منشا صاحب نے یہ کتاب کب لکھنی شروع

کی مگر اس کی تکمیل کے وقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ منشا پانی پتی کے خطوط میں ایک خط اسلامک ریسرچ اکیڈمی منصورہ سے رانا جمیل احمد کا دستیاب ہوا تھا جس کا متن یہ ہے کہ:

> ''لاہور میں ایک پبلشر سے بات ہوئی ہے۔ وہ حیاتِ حالی چھاپنے پر آمادہ ہے۔ ان کی آمادگی کا ایک سبب ان کا ضلع کرنال سے تعلق ہونا ہے۔ وہ شاہ آباد کے رہنے والے ہیں اور ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہ رہے ہیں۔ شفیق الاسلام ان کا اسم گرامی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خواجہ صاحب رائلٹی کے عوض حقوق اشاعت ہمیں دے دیں۔ یہ حق صرف ایک اشاعت کا بھی ہو سکتا ہے اور دوائمی بھی۔''

اس خط پر ۱۲ اپریل ۱۹۸۹ء کی تاریخ درج ہے۔ اس تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسودہ کچھ ہی عرصہ قبل مکمل ہوا تھا۔ پھر یہ کتاب شائع کیوں نہ ہوئی۔ منشا پانی پتی کے فرزند فرمان رضا کا مؤقف یہ ہے کہ:

> ''حقوق اشاعت کے مسئلے، رائلٹی کے بہت کم ہونے کے ساتھ ساتھ منشا صاحب کی بیماری بھی اس کی اشاعت میں آڑے آ گئی تھی۔''(۲)

''حیاتِ حالی'' کے مقام و مرتبے کے تعین اور اس کے تنقیدی جائزے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے مندرجات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

باب۱: اس سوانح کے پہلے باب کا نام ''نام و نسب'' ہے اور اس میں مولانا حالی کا شجرہ نسب دیا گیا ہے جو کئی واسطوں سے ہوتا ہوا حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جا ملتا ہے۔

باب۲: دوسرا باب مولانا حالی کی ابتدائی تعلیم و تربیت، بسلسلۂ تعلیم دہلی میں قیام اور ان کے اساتذہ کے تذکرے پر محیط ہے۔

باب۳: اس باب میں جن اہم عنوانات پر بحث کی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں۔ فکر معاش، ملازمت، شادی، اولاد، جنگ آزادی اور مولانا کی مشکلات میں اضافہ، شیفتہ کی مصاحبت میں جہانگیر آباد کا قیام، مرزا غالب سے ملاقات، مرثیہ دلی حالی کی زبانی اور جنگ آزادی۔

باب۴: چوتھے باب میں گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت، مولانا حالی کی والدہ کی دماغی کیفیت اور والد کی رحلت، شادی، انجمن پنجاب کے مشاعروں کی ابتدا، غیر طرحی مشاعروں میں شرکت اور ان میں پڑھی جانے والی مثنویاں، لاہور سے دلبرداشتہ ہونا اور وطن واپسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

باب۵: اس باب کو سماجی و فلاحی خدمات کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں حالی بورڈنگ ہاؤس دلی کا

قیام، عریبک کالج کی ملازمت، نظام حیدرآباد دکن کی طرف سے وظیفہ، سرسید سے تعلق، مسدس حالی کا مکمل تعارف اور مسدس اور سرسید کے حوالے سے حالی پر ہونے والے اعتراضات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

باب۶: اس باب کے اہم موضوعات درج ذیل ہیں: ۔ غیر مسلم ادیبوں کی نظر میں مسدس کی اہمیت، مسدس حالی کے مقابلہ میں ایک اور مسدس، مسدس پر صالحہ عابدہ حسین، وحیدالدین سلیم، رام بابو سکسینہ، مولوی عبدالحق کی آرا، حالی کے بھائی خواجہ امداد حسین مظہر کی وفات، تقرر ملازمت اینگلو عربک کالج لاہور، شاہجہاں آباد دہلی کی دوبارہ واپسی۔

باب۷: اس باب کا عنوان "اخلاقیات و نجی زندگی" ہے۔ اس عنوان کے تحت عریبک کالج کی ملازمت سے علیحدگی، حالی پریس کا قیام، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، بھاٹی دروازہ لاہور میں سرسید کا جلسہ، حالی کا حیدرآباد دکن کا سفر، ریاست حیدرآباد سے وظیفہ میں اضافہ، تصنیف و تالیف، رفیقہ حیات کی وفات، حیات جاوید کی اشاعت، شمس العلما کا خطاب اور پانی پت میں وکٹوریا لائبریری کا قیام زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب۸: اس باب کا عنوان "زندگی کے آخری ایام" ہے۔ اس باب میں دائیں آنکھ میں موتیا کی شکایت، صدارت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، عمر کے آخری دور میں مولانا کی مصروفیات، خواجہ عبدالولی (نواسہ حالی) کی بیماری، وفات خواجہ عبدالعلی (حالی کے داماد)، تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے فرید آباد میں قیام، بائیں آنکھ میں موتیا کا اثر، بازو، ٹانگ اور زبان پر فالج کا اثر، حالی کی وفات، تجہیز و تکفین، زندگی کے آخری ایام میں تنہائی اور گوشہ نشینی کی آرزو،، اردو کلیات نظم کی ترتیب، حالی کی رسم چہلم، اور زعمائے ہند کی شرکت ایسے موضوعات شامل ہیں۔

باب۹: یہ باب اولادِ حالی اور خاندان کے دیگر افراد کے متعلق ہے۔ اس تذکرے میں مولانا حالی کے خاندان کے جن افراد کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے نام اسی ترتیب سے درج ذیل ہیں: خواجہ اخلاق حسین، خواجہ امداد حسین (بھائی) مشتاق فاطمہ، مختار فاطمہ، عنایت فاطمہ (بیٹیاں) خواجہ غلام السیدین، سیدہ خاتون، خواجہ اظہر عباس، مصداق فاطمہ (صالحہ عابدہ حسین) مشتاق حسین، خواجہ اکرام حسین اور خواجہ عبدالولی سمیت چونتیس افراد کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب۱۰: اس باب میں حالی کے کتیس شاگردوں کا تعارف دیا گیا ہے۔ ان میں چند اہم نام درج ذیل ہیں: حکیم آزاد انصاری، مولوی وحیدالدین سلیم، بیر بقااللہ عثمانی، خوشی محمد ناظر، دتا ریہ کیفی، بیدل سہارنپوری، مرزا محمد اشرف گورگانی۔

باب۱۱: یہ باب سب سے طویل ہے اور کاپی کے دوسو چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ منشا پانی پتی نے اس باب کو ”اخلاق وعادات“ کا نام دیا ہے۔ اس باب میں مولانا حالی کے کردار کی بہت سی خوبیاں گنوائی گئی ہیں۔

باب۱۲: اس باب میں حالی منزل اور حالی کی ذاتی جائیداد، اہل شہر سے ان کے تعلقات، مرغوب پھل، کرکٹ سے دلچسپی، گھڑسواری ایسے موضوعات قلمبند کیے گئے ہیں۔

باب۱۳: یہ باب مولانا حالی کے سوسالہ یوم پیدائش پر حالی سینٹری کی طرف سے پانی پت میں ایک بہت بڑی ادبی تقریب کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس تقریب کی صدارت والی بھوپال نواب حمید اللہ خان نے کی تھی جبکہ تقریب میں نواب بہادریار جنگ اور علامہ اقبال سمیت ہزاروں افراد نے شرکت کی تھی۔

ابواب کے اس مختصر جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب مولانا حالی کی شخصیت کا مکمل تعارف نامہ ہے۔ منشا نے یہ تعارف نامہ کیوں تصنیف کیا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے تین رویے سامنے آتے ہیں۔ ایک نیازمندانہ رویہ، دوسرا غیر جانبدارانہ رویہ اور تیسرا معاندانہ رویہ۔ منشا کی حیات حالی صرف نیازمندانہ رویے پر مشتمل ہے، اردو کی بیشتر سوانح عمریوں میں یہی رویہ اپنایا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال خود حیات جاوید ہے جو مولانا حالی کی تصنیف ہے۔ شبلی نے حیات جاوید کو سرسید کی مدلل مداحی قرار دیا تھا۔ سرسید حالی کے نزدیک بہترین شخصیت کے حامل تھے جبکہ منشا صاحب کے نزدیک مولانا حالی کی شخصیت آئیڈیل تھی۔ مولانا حالی سے یہ نیازمندانہ رویہ ان سے قلبی ونسبی رشتے کی بدولت بھی نظر آتا ہے۔ وہ اس سوانح میں مولانا حالی کے زبردست مداح اور حامی نظر آتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا حالی کی اس سوانح حیات کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔ کیا اسے حیات جاوید یا کسی اور اہم سوانح کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تقابلی جائزے میں ڈاکٹر شاہ علی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ”سرسید کی جامع حیثیات شخصیت کے گوناگوں پہلو سوانح نگار کو مختلف چیزوں کے جائزے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس حالی کی یک رخی حیات اتنی دشواری کا باعث نہیں ہوتی“(۲) ڈاکٹر شاہ علی سے جزوی اتفاق ممکن ہے کیونکہ سرسید کی شخصیت حالی کی نسبت بہت بڑی ہے لیکن حالی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی طور پر بھی سرسید سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ اردو شاعری کو نئی جہت دینے میں ان کا مقام کسی مجتہد سے کم نہیں ہے۔ اسی طرح مقدمہ شعروشاعری کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ یقیناً حالی اتنی بڑی شخصیت تھے اور ان کا کام اتنا اہمیت کا حامل ہے کہ ان پر سینکڑوں مضامین اور بیسیوں کتابیں موجود ہیں۔ حالی کی شخصیت کی اہمیت کے حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ سرسید کی اصلاحی تحریک کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کے بھی بے شمار مخالفین پیدا ہو گئے تھے۔

خاص طور پر ''اودھ پنچ'' نے ان کی مخالفت میں ایک تاریخ رقم کر دی۔ انہیں طرح طرح کے غلط القاب و آداب سے پکارا گیا۔ طنز و تشنیع کے نشتر برسائے گئے مگر وہ کردار کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوصف اپنے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا جواب نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب ان کے نواسے خواجہ غلام الثقلین نے اودھ پنچ کا جواب دینا چاہا تو سختی سے منع کر دیا۔ کردار کی یہی عظمت تھی کہ اودھ پنچ کے لکھنے والے اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور انہوں نے مولانا حالی کی شخصیت پر تعریفی مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان مضامین کا سرنامہ یہ شعر ہوتا تھا۔

عیب حالی کے بہت تم نے گنائے اے پنچ
اشک شوئی کرو دوچار ہنر بھی کہہ دو

مولانا حالی ایسی بڑی شخصیت پر لکھنے کے لیے مواد کہاں سے حاصل کیا گیا۔؟ اس سلسلے میں منشا نے جن کتب و رسائل سے استفادہ کیا۔ اس سوانح میں ان کے نام اور صفحہ نمبر تو درج کیے ہیں مگر مصنف کا نام نہیں لکھا۔ شاید کمپوزنگ کے وقت یا بعد میں تحریر کرتے۔ ان کتب کے نام درج ذیل ہیں:

تذکرہ حالی، یادگارِ حالی، ذکرِ حالی، دہلی کی آخری شمع، ترجمہ حالی (مولانا حالی کی خودنوشت)، مکتوبات حالی (جلد اول، دوم) مرتبہ محمد اسمٰعیل میرٹھی، واقعات دارالحکومت دہلی (حصہ دوم) حالی پانی پتی، دیوان حالی، مقدمہ رباعیات حالی، رسالہ حیات نو (پانی پت، جوبلی نمبر) حالی بحیثیت شاعر، روزنامہ مشرق اتوار ایڈیشن (۲۹ جون ۱۹۶۹) روزنامہ امروز، لاہور، یکم فروری ۱۹۵۵ء

منشا صاحب نے ان کتب سے استفادہ کے علاوہ خاندان کے بزرگوں سے مولانا حالی کی شخصیت کے متعلق جو کچھ سنا اور سمجھا وہ بھی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب مواد ایک بڑی اور معیاری سوانح کی تصنیف کے لیے کافی تھا؟ اس بات میں تو کوئی کلام نہیں کہ حیات حالی پر، حیات جاوید کی طرح ایک بہت اہم سوانح رقم ہونا چاہیے تھی اور منشا صاحب نے ایک منفرد سوانح لکھنے کی اپنی سی کوشش بھی کی ہے، مگر یقیناً انہیں صالحہ عابد حسین کی طرح مواد کی کمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ ''یادگارِ حالی'' میں صالحہ عابد حسین مواد کی کم دستیابی کا شکوہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> ''یادگارِ حالی لکھتے وقت باوجود تلاش کے مجھے کوئی ایسی کتب دستیاب نہ ہو سکیں، جن کی بہت ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ مولانا حالی کے ذاتی حالات جاننے والے یا تو خدا کو پیارے ہو چکے ہیں اور باقی زمانے کی گردش اور دیس کے بٹوارے کے ہاتھوں اپنے

> وطن سے بے وطن ہو کر ہندستان اور پاکستان میں اس طرح بکھر گئے ہیں کہ ان کی پھر شیرازہ بندی کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ میں نے اکثر ایسے بزرگوں کو جو حالی کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، جن میں ان کے عزیز، شاگرد اور نیازمند شامل تھے، خط لکھے کہ وہ حالی کی سوانح لکھنے میں میری مدد کریں مگر ان میں سے اکثر نے میرے خطوط کا جواب دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں فرمائی۔ دو ایک نے جواب دیا، ہمت افزائی بھی کی لیکن کوئی مدد نہ دے سکے یا دینی نہ چاہی۔ بہر حال جتنے حالات و واقعات میں، کتابوں سے، عزیزوں سے اور خود اپنی یادداشت سے فراہم کر سکتی تھی، ان کی بنا پر دو ڈھائی سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔"(۴)

کسی بڑی شخصیت کی سوانح میں بنیادی ماخذ تک رسائی مشکل ہو تو مواد کی کمی عموماً خاندان کے دیگر افراد اور شاگردوں کے ذکر سے پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاید یہی پس منظر ہے کہ "حیات حالی" کے باب نہم میں خاندان کے افراد اور باب دہم میں ان کے شاگردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلے باب میں مولانا حالی کے والد اور والدہ کا شجرۂ نسب دینے کے بعد "مولانا حالی کے آبا و اجداد کے مختصر حالات" کے عنوان سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت ابو منصور مت انصاریؒ، شیخ السلام خواجہ عبید اللہ انصاری (پیر ہرات)، ملک شرف الدین محمود شاہ، میرک علی شاہ، خواجہ ملک علی، خواجہ نصیر الدین، مولانا حالی کے والدین، بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بہنوں امت الحسین اور وجیہۃ النسا کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر علی شاہ آبا و اجداد اور خاندان کے افراد کے تفصیلی ذکر کو سوانح کی خامی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "گو خاندان اور احباب موضوع کا ایک حصہ بلکہ اکثر ایک بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہیرو کی ہی شخصیت ہے، جو مرکزی اور اہم ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس وقت جب ہیرو ایک الگ تھلگ زندگی بسر کرتا ہے، اس کے دوست احباب کے ذکر کو ٹھونس دیا جاتا ہے اور خاندان کے معاملے میں تو مناسبت کے اصولوں کو بے طرح نظر انداز کیا جاتا ہے۔ نیز اسلاف سے متعلق یہ پہلا روایتی باب سخت الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ سوا خاص موقعوں کے موروثی اثرات کے بارے میں اس قسم کی تحقیقات، چاہے وہ پشت تک ہی کیوں نہ ہوں، سوانح نگار کے لیے اکثر دام تزویر ثابت ہوتی ہیں۔ گو سائنسی نقطۂ نظر سے یہ اہم ہو لیکن اصولِ اتحاد اسے اصل سوانح سے خارج کر دے گا۔ بے حد

ضروری نسبی تفصیلات کے علاوہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ ایک ضمیمے کی شکل میں ملحق کیا جاسکتا ہے۔"(۴)

"حیات حالی" کے تنقیدی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ خامیاں موجود ہیں، مثال کے طور پر کچھ موضوعات میں ترتیب موجود نہیں ہے۔ ان کی ترتیب اور تصحیح متن کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کتابیات اور حوالہ جات کی تصحیح وترتیب بھی کی جانی چاہیے۔ مگر یہ مسودہ ان خامیوں کے باوجود حیاتِ حالی پر ایک بہت عمدہ قلمی نسخہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف مولانا حالی کی زندگی کے متعدد گوشے بے نقاب ہوتے ہیں بلکہ ان کی پسند ناپسند، نجی زندگی، تعلقات، اسلاف، رشتہ داروں، اور شاگردوں کے کردار پر بھی تفصیل سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ منشا پانی پتی نے مولانا حالی سے نیازمندی اور روحانی تعلق کا جو رشتہ قائم کیا ہے، وہ بہت کم لوگ ان دیکھی شخصیات سے قائم کر پاتے ہیں۔ یہ قلمی نسخہ بھکر میں منشا صاحب کے بیٹے فرمان رضا کے پاس محفوظ ہے۔ حالی کی وفات کے سو سال مکمل ہونے پر اب اس کی اشاعت میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین حالی، مکاتیب حالی، (مرتبہ مولوی اسمٰعیل پانی پتی)، پانی پت، حالی پریس ۱۹۲۵ء ص ۳۷۹
۲۔ منشا کے فرزند، فرمان شاہ سے ملاقات میں استفسار پر جواب
۳۔ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۹ء، ص ۷
۴۔ شاہ علی، ڈاکٹر، فنِ سوانح نگاری، کراچی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء، ص ۴۲،۴۳

☆☆☆☆

قریش علی منشا پانی پتی

اخلاقیات و نجی حالاتِ زندگی

(مولانا حالی کی غیر مطبوعہ سوانح سے ایک باب)

قناعت پسندی

مولانا حالی جہاں اور اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے، وہاں پیدائشی متوکل اور قانع بھی تھے۔ دنیاوی جاہ و حشمت اور ہوس سے ہمیشہ کنارہ کشی اختیار کی۔ ریاست حیدر آباد سے وظیفے کی امداد کو تائیدِ غیبی سمجھ کر ملازمت سے دست برداری اختیار کی اور پھر تمام عمر کبھی کسی لالچ کے تحت ملازمت نہ کی اور نہ ہی کسی کی خوشامد اور چاپلوسی کو شعار بنایا۔

عربیک کالج دہلی کی ملازمت سے علیحدگی

ریاست حیدر آباد سے وظیفہ مقرر ہونے کے بعد ۱۸۸۹ء میں آپ نے عربیک کالج دہلی سے علیحدگی اختیار کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملازمت سے جان چھڑائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی کی قدیم صحبتیں ایک ایک کر کے مفقود ہو چکی تھیں اور مولانا کے بہت سے دوست اور رفقا و احبابِ سخن گو، سخن فہم حضرات جن کے دم سے دلی کی رونق تھی مولانا کو تنہا اس میدان میں چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کبھی کے رُخصت ہو چکے تھے۔ دلی اُجڑ چکی تھی۔ نامور شعرا جن سے دلی کی شہرت تھی اس نگری کو سُونا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ مولانا کو یہ تنہائی بہت پریشان کُن اور شاق گذرتی تھی۔ دوستوں اور یارانِ محفل کی یاد بہت ستاتی تھی جس کو آپ نے ایک رباعی بیان فرمایا ہے جو واقعی مولانا کے جذبات و احساسات کی کھُلی عکاسی کرتی ہے۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت نہ سالک نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یادوں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

جب مولانا نے چاروں طرف ایک خوفناک خاموشی اور ہُو کا عالم پایا تو نہایت درد بھرے انداز میں اُس ماحول اور اُس زمانہ کی ایسی تصویر کشی کی کہ رہتی دنیا تک اردو ادب کا سرمایہ بنے گی۔ مولانا حالی نے مرثیہ کیا کہا ہے کہ واقعات و حالات کو ان میں سمودیا ہے کہ جس کو پڑھ کر ہر شخص بخوبی یہی اندازہ کر سکتا ہے کہ حالؔی کو اپنے معاصر دوستوں کے ساتھ کتنی محبت اور ادب کے ساتھ کتنا گہرا لگاؤ تھا۔ مرثیہ کے چند اشعار دیکھیے:

؎ تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیّر و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سُن کر پھر اس گلشن میں
نہ سنا جائے گا کوئی بُلبل کا ترانا ہر گز

اس وقت دلی میں ہر طرف مکمل جمود اور مایوسی کے بھیانک سائے تھے۔ دلی کی پُر رونق محفلیں سُونی ہو چکی تھیں۔ ادبی ذوق و شوق ختم ہو چکا تھا۔ تمام ادب نواز شخصیتیں ایک ایک کر کے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ بیشتر اہلِ قلم یا تو سفرِ آخرت اختیار کر چکے تھے یا دہلی کو چھوڑ کر لکھنؤ یا دیگر مقامات پر ہجرت کر گئے تھے۔ وضع داریاں دم توڑ چکی تھیں۔ حالی نے یہ تمام ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو بے قرار ہو گئے اور ایسے درد بھرے انداز میں دلی کا مرقع پیش کیا کہ لوگوں کے دل ہلا کر رکھ دیے اور یوں تصویر کشی کی کہ آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

؎ رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالؔی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

(دیوانِ حالی، ص ۲۸۵)

حالی پریس کا حالی منزل میں قیام

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ مولانا نے قوم کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے اور افرادِ قوم کو بیدار کرنے میں تمام عمرِ عزیز صرف کردی۔ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کا شعور بیدار کرنے کے لیے آپ نے اپنے تمام وسائل داؤ پر لگا دیے لیکن ایک کمی جس کی ضرورت محسوس کرتے تھے وہ ایک عظیم الشان مطبع کا قیام تھا۔ مالی مشکلات اور خرابیِ صحت نے ہمیشہ اس کارِ خیر میں رکاوٹیں پیدا کیں مگر حالیؒ کی بلند حوصلگی اور عزم کے سامنے یہ کوئی دشوار کام نہ تھا چنانچہ ۱۸۹۱ء میں باہتمام مولانا سید وحیدالدین سلیم ایک مطبع کی بنیاد ڈالی گئی۔ افسوس کہ یہ مطبع کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد مالی مشکلات کا شکار ہوگیا، لیکن مولانا نے تمام تکالیف اور مشکلات کے باوجود ہمت نہ ہاری۔ آخر کار وہ دن بھی آیا جب ۱۹۰۴ میں خود مولانا نے ایک اور پریس کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے یہ شرف، حالی منزل کو حاصل ہوا۔ یہ پریس مولانا کے ذاتی رہائشی مکان کے زیریں منزل پر قائم ہوا اور یہی وہ پریس ہے جس کے پہلے منیجر خواجہ فرزند علی نبیرۂ حالی ونانا یا راقم الحروف تھے۔ ان ہی کی زیرِ نگرانی مولانا حالی کی بیشتر تصانیف کی طباعت واشاعت ہوئی۔ راقم الحروف کی پیدائش بھی اسی حالی منزل میں ہوئی اور میں نے خود پریس چلتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند وپاک کے وقت تمام سامان وکتب جن کی مالیت اُس وقت -/400,00 ہزار روپے تھی چھوڑ کر راقم کو پاکستان آنا پڑا۔ حالی منزل میں حالی پریس کے اجرا کا زمانہ وہ تھا جب مولانا عربک کالج کی ملازمت چھوڑ کر وطنِ عزیز آچکے تھے اور کسی حد تک فکرِ معاش سے بھی آزاد اور مطمئن تھے۔ لہٰذا پھر وہی دیرینہ مشغلہ جس کے لیے آپ تنہائی اور یکسوئی کے خواہش مند تھے، پانی پت آکر شروع کردیا اور ہمہ تن تصنیف وتالیف اور مطالعہ میں مصروف ہوگئے۔ اسی ضمن میں مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۸۹ء کو حالی پریس کے اجرا سے قبل اپنے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین صاحب کو مطبع کے منصوبے کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ”میرا ارادہ ہے کہ بشرطِ حیات اور بشرطِ صحت وفرصت کے زمانہ میں کوئی نیا کام شروع کروں۔ اب تک جو منصوبہ ذہن میں آیا ہے، وہ یہ ہے کہ دلی میں ایک بڑا مطبع قائم کیا جائے جس میں ہندوستان کے عمدہ مصنفوں کی کتابیں چھپوائی جائیں اور قدماء کی عربی، فارسی تصانیف بھی جواب تک نہیں چھپیں یا بُری طرح چھپیں ہیں نہایت حُسنِ اہتمام کے ساتھ چھپوائی جائیں اور ایک رسالہ ماہواری بطور میگزین کے شائع کیا جائے جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کیا جائے۔“

راقم الطاف حسین حالی از دہلی کوچۂ پنڈت، ۱۳/ جولائی ۱۸۸۹ء، (مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص: ۱۱۸)

مولانا کے پیشِ نظر بڑے بڑے منصوبے اور پروگرام تھے جن کو وہ عملی جامہ پہنانے کے بعد اردو ادب کو دیگر غیر ملکی لٹریچر کے ہم پلہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اردو ادب کو بامِ عروج پر پہنچانے کی آرزو ہر وقت آپ کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ سب سے بڑی دشواری اور مشکل یہ تھی کہ پانی پت ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں نصابِ تعلیم کی کتب بھی بمشکل دستیاب ہوتی تھیں۔ اس زمانہ میں طباعت کا ادارہ یا تو لکھنؤ میں مطبعِ منشی نول کشور کا تھا یا پھر قابلِ اعتماد مطبع دار المصنفین میرٹھ میں یا پھر دہلی میں مختلف چھوٹے چھوٹے ادارے تھے، جہاں نہایت گراں قیمت پر چھپائی کا کام ہوتا تھا۔

حالی ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ قوم کی خدمت اور فلاح و بہبود کو اپنے لیے ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی ناجائز طور پر صَرف نہ ہو۔ اس لیے آپ کا خیال تھا کہ پانی پت ہی میں ایک عظیم الشان مطبع اور اس کے ساتھ ہی ایک بک ڈپو بھی جاری کیا جائے جس سے نادار اور غریب طلبا کے لیے اعلیٰ اور معیاری لٹریچر کی کتابیں جو کمیاب تھیں یا خراب و خستہ ہونے کے علاوہ گھٹیا کاغذ پر چھپی ہوئی تھیں دوبارہ کوشش اور پوری جدوجہد و تلاش سے مہیا کی جائیں۔ ان کو ازسرِ نو اچھے کاغذ اور کم قیمت پر شائع کر کے فروخت کیا جائے۔ علاوہ ازیں فارسی اور عربی زبان کی اعلیٰ ترین کتب کا ترجمہ اردو زبان میں نہایت سلیس اور بامحاورہ و روزمرّہ کیا جائے تاکہ عوام اس کو پڑھ کر معیارِ علم اور تہذیب و اخلاق سے بہرہ ور ہو سکیں۔ مولانا نے اس کام کے لیے اَن تھک جدوجہد کی لیکن مطبع کے لیے خاطر خواہ انتظام اور خوش نویس کاتبوں کی کمی اور چھاپہ خانہ جس کی اُس زمانے میں بہت ہی زیادہ قیمت تھی جلد مہیا نہ ہو سکے۔

مولانا کی وفات کے چند سال بعد حالی منزل کے زیریں حصے میں خواجہ فرزند علی صاحب نے حالی پریس کی باضابطہ بنیاد رکھی۔ آپ نے دن رات کی سخت جدوجہد کے بعد مطبع کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ’’اگر پدر نہ شواند پسر تمام کند‘‘ خواجہ موصوف ایک اعلیٰ دماغ اور مثالی منتظم، محنتی اور دیانت دار شخص تھے۔ آپ نے معیاری کاغذ اور کم قیمت پر کتب چھاپ کر مارکیٹ میں مہیا کیں جس میں جہاں تک مجھے یاد ہے:

(۱) مجموعہ نظم حالی (۲) مناجاتِ بیوہ (۳) مثنوی حقوقِ اولاد (۴) شکوہ ہند (۵) چُپ کی داد (۶) ضمیمہ کلیاتِ نظم اردو (۷) مقدمہ شعر و شاعری (۸) مکتوباتِ حالی ہر دو حصہ (۹) مولود شریف (۱۰) مجالس النسا ہر دو حصہ اسی مطبع میں خواجہ موصوف کی زیرِ نگرانی چھپیں اور ملک کے گوشہ گوشہ میں بہت قلیل قیمت میں فروخت ہوئیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہر کتاب کے سرورق کے اندرونی طرف یہ عبارت چھپی ہوئی ہے کہ ’’مولانا حالی کی زندگی میں اُن کے شاگرد و دوست جناب مولانا سید وحید الدین سلیم نے ایک مطبع اسی نام کا جاری کیا تھا

جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ اب میں نے اپنے نانا جان (مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم و مغفور) کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلہ کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں۔"

راقم الحروف نے مطبع مذکور کو صحیح حالت میں دیکھا۔ پتھروں کے بلاکوں پر لکھائی کی جاتی تھی اور دو آدمی ہاتھ سے اُس کے ہینڈل چلاتے تھے۔ کام واقعی دشوار تھا۔ شیخ شجاع الدین شعلہ اور شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ واقعہ تقریباً ۱۹۳۳-۳۴ء کا ہے لیکن افسوس چار پانچ سال چلنے کے بعد اس مطبع کا بھی وہی حال ہوا جو اول الذکر کا ہوا تھا۔ عوام نے دستِ تعاون سے احتراز کیا اور تجارتی کام مہیا نہ ہو سکا، نیز جو کتابیں شائع ہوئیں اُن کی فروخت بھی قلیل مقدار میں ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب راقم الحروف کو حالی منزل چھوڑ کر اور اپنے وطنِ عزیز کو خیرباد کہہ کر پاکستان آنا پڑا تو بالائی کمرہ میں تقریباً چالیس پچاس ہزار روپیہ کی کتابیں چھوڑ کر آیا جن کا پاکستان لانا یا فروخت کرنا ناممکنات میں سے تھا۔

حالی بُک ڈپو

مولانا مرحوم کی خواہش تھی کہ پانی پت میں غریب طلبا کے لیے ایک معقول بُک ڈپو کھولا جائے اور یہ تمنا آپ کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ اس لیے ایک دیرینہ خواہش کے پیشِ نظر ۱۹۴۲ء میں جناب خواجہ فرزند علی صاحب نے ایک بُک ڈپو بھی قائم کیا جس کا نام "حالی بُک ڈپو" تجویز کیا گیا تھا۔ جس کا اہتمام شیخ محمد اسماعیل قادیانی کے ذریعہ کرایا گیا۔ شیخ صاحب بہت سی کتابیں خواجہ موصوف سے کمیشن پر لے گئے۔ علاوہ ازیں خواجہ سجاد حسین صاحب پسرِ حالی سے بھی متعدد کتابیں برائے فروخت حاصل کیں اور زیریں قلعہ باندر حلوائی ہٹہ میں ایک لکڑی کے کھوکے میں بک ڈپو شروع کیا۔ آخرکار آٹھ دس سال بعد یہ بُک ڈپو بھی خسارے کی نذر ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ رحیم الدین برادر شیخ محمد اسماعیل قادیانی نے بھی اس ڈپو کو چلانے کی کوشش کی لیکن بےسُود۔

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

دو تین سال بعد دہلی میں جامع مسجد شاہی کے بالمقابل مچھلی والان میں باہتمام خواجہ اطہر عباس صاحب نبیرۂ حالی، نہایت اچھے پیمانے پر حالی پبلشنگ ہاؤس کھولا گیا جس کا کام واقعی معیاری تھا لیکن خواجہ موصوف کی عدم دلچسپی اور کارکنان کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ ادارہ بھی بند ہو گیا۔ دراصل افسوس اس بات کا ہے

کہ مُستند اور مخلص کارکن نہ مولانا کو اور نہ ہی مولانا کے بعد خواجہ صاحبان کو اس کارِ خیر کے لیے میسر آ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی زندگی میں ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور نہ ہی بعد وفات حالی کے، اس نیک مقصد کی تکمیل کی گئی جس کی بنیاد نہایت خلوص اور دُور اندیشی سے رکھی گئی تھی۔

بھاٹی دروازہ لاہور سر سید احمد خاں صاحب کا تاریخی جلسہ عام

علی گڑھ کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے سر سید احمد خاں نے کیا کچھ نہ کیا۔ قوم کی گالیاں سُنیں۔ لوگوں نے کافر کہنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ بھاٹی دروازے لاہور کے جلسۂ عام میں ایک سو بیس پرانے اور ناکارہ جوتوں کا ہار قوم کی خاطر اس مردِ مومن نے اپنے گلے میں ڈلوایا۔ سارے ہندوستان میں چندے کی خاطر مارے مارے پھرے۔ امرا اور رؤسا سے امداد کی اپیلیں کیں لیکن پیشانی پر کبھی شکن نہ آئی۔ یہ اُسی مردِ مومن کی پُر خلوص کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان قوم نہ صرف پاکستان بلکہ تمام دنیا میں ہر شعبۂ حیات میں پیش پیش ہے۔

مولانا حالی کا سفر حیدر آباد دکن

علی گڑھ کالج کی امداد کے لیے ۱۸۹۱ء میں ایک وفد جس کے سرکردہ راہنما خود سر سید احمد خاں تھے، نواب میر عثمان علی خان والیِ حیدر آباد کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں مولانا حالی بھی وفد کے رُکن کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا کی تصانیف کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہو چکا تھا اور مُسدس نے قوم کی ڈوبتی ہوئی نیا کو سہارا دے کر ساحلِ مراد تک پہنچانے میں پوری پوری امداد دی تھی۔ یہی وہ کارِ عظیم تھا جس کے صلے میں مولانا کا وظیفہ جو پہلے یک صد روپیہ سکہ ریاست حیدر آباد اور پچھتر روپیہ سکہ سرکاری تھا اب دوبارہ مولانا کی ادبی اور قومی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاست مذکور کے ادارہ مصنفین نے یک صد اُنیس روپیہ سکہ ریاست کے عوض یک صد روپیہ سکہ انگریزی کی منظوری دے دی۔

ریاست حیدر آباد سے وظیفے میں اضافہ

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے تحریر کیا ہے کہ ماہانہ وظیفہ میں پچیس روپیہ کا اضافہ سرکار حیدر آباد کی طرف سے ہو گیا اور یہ وظیفہ مولانا کو تا حیات برابر ملتا رہا جس کے متعلق آپ نے اپنے ایک مکتوب میں جو مورخہ ۱۶؍ نومبر ۱۸۹۱ء کو اپنے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کو تحریر کیا ہے، اس میں مفصل تحریر کرتے ہیں:

> ”یہ تو شاید تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولوی مشتاق حسین صاحب نے بغیر اس کے کہ
> میری طرف سے کوئی درخواست یا تحریک ہو۔ ۲۵/ روپے کا اضافہ وظیفہ مقررہ پر کرا دیا

ہے۔ اب یہ بجائے ۷۵/۔ کے ۱۰۰، سو روپیہ سکۂ حالی جس کے کیمتی بیاسی تراسی کے
قریب ہوتے ہیں ملا کریں گے۔"

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص: ۱۲۲)

اس عطیہ شاہی کا شکریہ مولانا اپنے ایک مشہور قطعہ میں بیان فرماتے ہیں جو واقعی ایک یادگار اور دعائیہ قطعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی شہ پارہ بھی ہے جو دیوانِ حالی میں موجود ہے۔ انتخاب پیشِ خدمت ہے:

؎ اے بشیرِ دولت و دیں نائب شاہِ دکن
ہے مُہماتِ دکن کا ذات پہ تیری مدار
مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اُس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار
پہ مِلا مقصودِ حالی کو تو اس در سے ملا
بے تردّد و بے تذلّل، بے طلب، بے اختیار
یا رب اس سرکار کو ہے جس سے عالم فیض یاب
جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

تصنیف وتالیف میں انہماک

حیدرآباد سے واپسی پر مولانا نے نہایت ذوق وشوق اور انہماک کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا۔ حالی چونکہ فطرتاً نہایت خاموش اور سنجیدہ مزاج واقع ہوئے تھے، اس لیے فکرِ معاش سے نجات ملنے کے بعد دن رات کی کوشش اور انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ شعر وشاعری، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید جیسی عظیم کتب جو برسوں سے زیرِ تکمیل تھیں آپ کے دستِ مبارک سے آپ کی زندگی ہی میں تصنیف ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ یہ وہ کتب ہیں جو ماضی میں برس ہا برس پنجاب یونیورسٹی کے نصابِ تعلیم میں شامل رہیں اور نہ صرف ادبِ اردو کا سرمایہ ہیں بلکہ ادب میں ان کا بلند مقام ہے۔

وفات رفیقۂ حیات بعارضہ ہیضہ

مولانا نے ان پرسکون لمحاتِ وقت کو غنیمت خیال کیا اور ہمہ تن تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ ہر وقت قوم کی خدمت پیشِ نظر تھی۔ لیکن آپ کو یہ کیا معلوم تھا کہ قدرت اخیر عمر میں ایک اور کٹھن

منزل اور کڑے امتحان سے گزارنا چاہتی ہے جب کہ اخیر عمر میں ہر شخص اپنا ہم رزق اور ہم خیال رفیق کا جویا ہوتا ہے۔ افسوس کہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۰ء نو بجے شب آپ کی رفیقۂ حیات ''محترمہ اسلام النسا'' کا بعارضہ ہیضہ انتقال ہوگیا۔ اِنا للہِ وَاِنا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

اہلیہ کے انتقالِ پُرملال کے متعلق خود مولانا ایک قطعہ میں اپنے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین صاحب سرکل انسپکٹر مدراس کو تحریر فرماتے ہیں اور تفصیل درج کرتے ہیں۔

> ''برخوردار سعادت آثار، طال عمرہ۔ بعد دُعا کے واضح ہو کہ یہاں پندرہ بیس روز سے ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا اثر ہوا اور کل نو بجے رات کے انتقال ہوگیا۔ اِنا للہِ وَ اِنا اِلَیہِ رَاجِعُون۔''

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص:۹۵)

ایک دوسرے خط میں جو ۱۶؍ستمبر ۱۹۰۰ء کو لکھا اس میں بیٹے کو صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے رنج و غم کے علاج اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی تعلیم دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''تمہاری تحریر سے بہت زیادہ اداسی اور پژمردگی ظاہر ہوتی ہے اور یہی حال اخلاق حسین کا معلوم ہوتا ہے۔ تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور اُن کی خوبیوں کو بہت مت یاد کرو اور اس دعا کا زیادہ وِرد رکھو۔ (ترجمہ) الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ ہے۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج و غم کا بہترین علاج ہے۔''

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص:۲۹۲)

اگرچہ مولانا کی اہلیہ کا دماغی توازن درست نہ تھا اور ضعیفی میں بہت زیادہ چڑچڑا پن ہوگیا تھا جو اکثر ضعیف العمر حضرات کا ہو جاتا ہے لیکن بایں ہمہ مخدومہ نہایت سنجیدہ، سلیقہ شعار، خوش اخلاق، اعلیٰ منتظم، دُور اندیش اور باوقار عورت تھیں۔ جنہوں نے تمام عمر نہایت صبر و شکر کے ساتھ گزار دی اور مولانا کو کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا۔

اہلیہ کی بے وقت اور ناگہانی موت سے مولانا کو بہت صدمہ ہوا جس کو آپ نے نہایت صبر و تحمل سے برداشت کیا اور اپنے جذبات اور غم کا اظہار کسی عزیز و اقارب اور احباب پر نہ ہونے دیا لیکن آپ کے قلب و

جگر سے جذبات کا سمندر اُمل پڑا ایک ایک لفظ سے حسرت ویاس اور اضطرابی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ آپ بچپن ہی سے رنج وغم برداشت کرتے کرتے ہصبر وتحمل کی تصویر بن گئے تھے لیکن انسان اپنے دلی جذبات اوراندرونی کیفیات کو کہاں تک چھپا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کسی نے حالی کو کھلکھلا کر ہنستے نہیں دیکھا بلکہ ہمیشہ قومی خدمت میں رضا کارانہ تصنیف وتالیف تا دمِ واپسیں کرتے رہے۔

حیاتِ جاوید کی اشاعت

ابھی مولانا کی اہلیہ کے انتقال کو ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ آپ نے دن رات کوشش کر کے اور سخت محنت کے ساتھ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا جس کو اردو ادب میں حیاتِ جاوید کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ سوانح حیات سر سید احمد خان جس کی تصنیف وتالیف مولانا نے کی۔ واقعی اُنہی کی ہمت تھی۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو دو جلدوں میں دارالمصنفین میرٹھ سے اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ نہایت اعلیٰ کاغذ اور کتابت کا معیار بہت اچھا ہے۔

گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا

یہ جون ۱۹۰۴ء کی بات ہے کہ مولانا کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کو سراہتے ہوئے سرکارِ برطانیہ نے آپ کو شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا جس کی وجہ سے ہندوستان کے تمام علمی وادبی اداروں اور حلقوں میں ایک مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ جابجا ایسے جلسے منعقد ہوئے اور مولانا کی خدمت میں مبارک بادی کے پیغامات آنے شروع ہو گئے لیکن حالی اس خطاب کے ملنے سے چنداں خوش نظر نہ آتے تھے اور اپنے لیے ایک دردِ سر سے زیادہ اس خطاب کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس کے متعلق اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ جب کوئی حاکمِ ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ ہمیں جانا پڑے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں۔“

(مکتوباتِ حالی، جلد دوم، ص ۳۶۰)

قاعدہ ہے کہ لوگ خطابات حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ ان تھک کوششوں کے علاوہ سفارش اور اثر ورسوخ استعمال کرتے ہیں لیکن اس خطاب کے متعلق ایک اور خط میں جو آپ نے ۲۰ جولائی ۱۹۰۴ء کو خان بہادر خواجہ تصدق حسین صاحب جوان دونوں دہلی میں سیشن جج تعینات تھے اور آپ کے بھتیجے

بھی تھے اپنی ذاتی رائے کا اظہار اس طرح فرمایا ہے۔

> ”پرسوں تحصیل سے حسبِ حکم صاحب، ڈپٹی کمشنر بہادر کرنال اس مضمون کا خط آیا ہے کہ ۳؍ اکتوبر کو شمس العلما کی سند جو گورنمنٹ سے آ گئی ہے ڈسٹرکٹ بورڈ کرنال کے جلسہ میں تم کو دی جائے گی اُس روز جلسہ مذکور میں آ کر سند حاصل کریں۔“

(مکتوباتِ حالی، جلد دوم)

ان تمام دلچسپ خطوط میں ایک خط مولانا شبلی کا ہے جو انھوں نے ۳۰؍ جون ۱۹۰۴ء کو بحالت بیماری نہایت مختصر مگر جامع تحریر فرمایا ہے۔ جن کو مولانا کے بعد خطاب عطا ہوا۔

> ”آپ کو تو نہیں لیکن شمس العلمائی کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔ بخار کی حالت میں اس قدر لکھ سکتا تھا۔ شبلی ۳۰؍ جون ۱۹۰۴ء۔“

(تذکرہ حالی، ص: ۴۷)

مولانا کو علم و ادب سے جو بے پناہ لگاؤ تھا وہ ہر شخص جانتا ہے جہاں تک ممکن ہوتا آپ ادب کی خدمت سے کبھی گریز نہ کرتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ لوگوں کے سینوں میں علم کے دفتر کھول کر اُنہیں منور کر دیا جائے۔ اسی سلسلے میں ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے کہ جب ملکہ معظمہ وکٹوریا کا انتقال ہوا تو مولانا نے اہلِ شہر سے ملکہ کی یادگار کے لیے چندے کی اپیل کی اور خود گھر گھر جا کر چندہ جمع کیا اور اس ضمن میں بہت جدوجہد کی۔

پانی پت میں وکٹوریہ لائبریری کا قیام

شہر پانی پت کے عوام کی خاطر اور علمی شوق پیدا کرنے کے لیے مولانا نے ایک لائبریری کے قیام کے لیے بہت جدوجہد کی۔ باوجود انتہائی دوڑ دھوپ اور کوششوں کے سارے شہر سے صرف تین ہزار روپیہ سے زائد چندہ کی رقم نہ بڑھ سکی۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر چندہ کافی ہو جائے تو چونکہ شہر پانی پت میں ایک ہائی سکول کی سخت ضرورت ہے اس لیے ایک نیشنل ہائی سکول کی بنیاد ڈال دی جائے جس کے ذریعے غریب و نادار طلبا کی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو جائے لیکن صرف تین ہزار روپیہ سے سکول کیسے کھولا جا سکتا تھا۔ مجبوراً آپ نے بالائے قلعہ شاہی ایم۔ بی مڈل سکول کے ایک کمرہ میں میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام ایک پبلک لائبریری بیادگار ملکہ وکٹوریہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی اور جس کے سب سے پہلے سیکریٹری خود مولانا حالی تھے۔ اس لائبریری میں ہندی، اردو، فارسی اور عربی ادب کی تقریباً ایک ہزار کے قریب کتابیں تھیں۔ حکیم تجمل حسین کیرانوی اس کے اولین مہتمم مقرر ہوئے۔ کافی عرصہ بعد ۱۹۳۴ء میں جب اس کی عمارت علیحدہ میونسپل

کمیٹی نے تعمیر کی تو عرصہ تک ماسٹر عبدالستار خاں اس لائبریری کے منتظم رہے۔ کئی سال تک اسی وکٹوریہ ہال میں ملک کے گوشہ گوشہ سے ہائی سکول کے طلبا پانی پت آ کر عثمانیہ کلب کے اجلاس اور سالانہ مقابلہ تقاریر و مباحث میں حصہ لیتے رہے۔ کلب مذکور ماسٹر عبدالرؤف صاحب کے بھائی قیس عثمانی صاحب کی یاد میں ہر سال تقاریر کے مقابلے اور مشاعرے کراتے تھی جس کا اہتمام جناب ماسٹر عبدالرؤف اور عثمانیہ کلب کے عہدہ داران کراتے رہتے تھے۔ بعد اختتام اجلاس تقسیم انعامات کی ایک انتہائی دلچسپ تقریب بھی ہوتی تھی جس میں افسران و اہلِ شہر و معززین کے علاوہ ملحقہ بستیوں کے عوام بھی جوق در جوق آتے تھے۔ اس کے علاوہ آل ہند والی بال ٹورنامنٹ کا انتظام بھی ہوتا تھا اور باقاعدہ انعامات تقسیم کیے جاتے تھے۔ علم و ادب سے دلچسپی اور شوق رکھنے والے حضرات کے لیے یہ تمام پروگرام اس گئے گزرے دور میں بہت غنیمت تھے۔ اس ادبی سیمینار کے بعد مقامی اور دور و نزدیک سے آنے والے شعرا حضرات کی ضیافت طبع کے لیے ایک طرحی اور غیر طرحی مشاعرہ کا بھی بندوبست کیا جاتا تھا۔ راقم الحروف بھی متعدد بار اُن مشاعروں میں بحیثیت شاعر شریک ہوتا رہا۔ غالباً ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک مشاعرے کی صدارت بہزاد لکھنوی نے کی تھی اور طرح مصرعہ مرزا غالب کی مشہور اور معرکۃ الآرا غزل کا تھا۔ ''اب وہ رعنائیِ خیال کہاں''

اسی مشاعرے میں پیر بقاء اللہ عثمانی شاگر حالی شامل تھے جو بقاؔ تخلص کرتے تھے اور فارسی، اردو ہر دو زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ ایک صوفی منش آدمی تھے جنہوں نے اپنی تمام عمر خواجہ سجاد حسین صاحب کی خدمت میں گزار دی تھی اُن کا ایک شعر جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تھا:

ے روکھی سوکھی پہ کیجیے گا گذر   اے بقاؔ اب وہ شیر مال کہاں

راقم الحروف کی شاعری کا وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ اشعار میں پختگی تھی نہ ہی فن سے خاطر خواہ واقفیت۔
تاہم اس مشاعرے میں غزل پڑھی جس کے چند اشعار قارئین کی تفریح طبع کے لیے پیش کرتا ہوں:

تابِ نظارۂ جمال کہاں   میں کہاں آپ کا وصال کہاں
لب کشائی کا احتمال کہاں   آپ سے تابِ عرضِ حال کہاں
بجھ گئی شمعِ زینتِ محفل   اب وہ رعنائی خیال کہاں

دورِ حاضر میں خواہش انصاف
حسبِ منشا ہو یہ سوال کہاں

راقم الحروف بھی عثمانیہ کلب کا باقاعدہ ممبر تھا لیکن ایک مرتبہ کلب مذکور کا جب الیکشن ہوا تو میں

سیکرٹری منتخب ہو گیا۔ مجھ سے پہلے طفیل احمد خاں چغتائی اس کلب کے پرانے سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ اس کا دفتر عبدالمقتدر عثمانی صاحب کی بیٹھک میں ہوا کرتا تھا جو ماسٹر عبدالرؤف صاحب کے عم زاد تھے اور مولانا حالی کی پڑپوتی جمیلہ خاتون اُن سے منسوب ہیں۔ عثمانیہ کلب پانی پت کا یہ رنگا رنگ پروگرام اس مقصدِ عظیم کی جانب ایک مثبت قدم تھا جس کی ابتدا مولانا حالی نے ڈالی تھی اور جس کی وجہ سے عوام میں ادبی شعور پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

جس مشاعرے کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے شاید یہ آخری مشاعرہ تھا جو لائبریری مذکور میں ہوا۔ اس کے بعد پھر کبھی عثمانی کلب کا کوئی ادبی اجلاس منعقد نہ ہوا اور نہ ہی کبھی کوئی مشاعرہ لائبریری میں ہوا۔ افسوس سے تحریر کرنا پڑتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد وہ تمام علمی مجالس اور ادبی محافل بالکل مفقود ہو گئیں۔ لائبریری کو بھی وکٹوریہ ہال سے ہٹا کر ایم۔ بی۔ مڈل سکول کے ایک بوسیدہ اور تنگ و تاریک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا اور لائبریری ہال مذکور کی عالی شان عمارت جو عرصہ دراز تک طالبانِ علم کے لیے ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتی تھی دوسری عالم گیر جنگ کی نذر ہو گئی اور اُس ہال کو بطورِ گودام استعمال کرنے کے لیے کمیٹی نے معمولی کرایہ پر محکمہ سپلائی کے ٹھیکے داران کے حوالہ کر دیا اور ما سوائے چند اہلِ قلم و اہلِ علم اور شعرا کے جو کچھ علمی ذوق و شوق رکھتے تھے کسی کو اس بد سلیقگی اور بد ذوقی کا احساس نہ تھا۔ گاہ بہ گاہ جب کبھی راقم الحروف کا اُس طرف گزر ہوتا تو ماسٹر عبدالستار خاں صاحب لائبریری کے واقعات اور حالات سناتے اور فہرست کتب دکھا کر اُس کا مرثیہ نہایت کرب کے ساتھ سناتے اور اہلِ شہر کی بد ذوقی کا رونا روتے۔

دربارِ حیدر آباد سے حالی کا تعلق

دربار حیدر آباد دکن سے ویسے تو مولانا کا تعلق ۱۸۸۷ء سے مسلسل چلا آ رہا تھا اور آخر دم تک رہا اور حضور نظام کی طرف سے بھی کسی موقع پر مولانا کے عزت و احترام میں کوئی کمی نہ ہوئی اور باوجود خرابی صحت و کمزوری بینائی، ۱۹۰۵ء میں آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام میر محبوب علی خان کے جشنِ چہل سالہ میں شریک ہوئے حالاں کہ ماہِ دسمبر کی سردیاں زوروں پر تھیں اور پانی پت سے حیدر آباد دکن تک کا پُر صعوبت سفر لیکن نہ صرف یہ کہ آپ نے جشن مذکور میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی بلکہ آپ نے سالگرہ مذکور کے تمام پروگرام خود مرتب کیا اور انتہائی انہماک سے اس تقریب میں کام سر انجام دیا۔

دائیں آنکھ میں موتیا کی شکایت

حیدر آباد سے واپسی پر جون ۱۹۰۶ء کے آغاز ہی میں نزلہ و بلغمی امراض کی زیادتی کی وجہ سے ”جو

اس خاندان کا موروثی مرض ہے"مولانا کی دائیں آنکھ میں موتیا اُتر آیا جس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے تمام کام اور علم و ادب کی خدمت سے مولانا قطعی طور پر معذور ہو گئے۔ پڑھنے لکھنے کا کام تو بالکل بند ہی کرنا پڑا۔ خواجہ محبّ علی جو رشتہ میں مولانا کے بھتیجے تھے اور ریاست پٹیالہ میں اُس وقت ملازم تھے اُن کے مشورے سے ۱۹۰۷ء میں آپ راجندر ہسپتال پٹیالہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ کی دائیں آنکھ کا آپریشن ڈاکٹر جیمس نے کیا جو اس زمانے کا مانا ہوا سرجن کہلاتا تھا لیکن خوبیٔ تقدیر کہ اس آپریشن سے مکمل آرام نہ ہوا اور بعد آپریشن بینائی میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔ صرف اتنا فائدہ ہوا کہ مولانا تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کے قابل ہو گئے لیکن دونوں آنکھوں پر زور زیادہ پڑنے لگا جس کے متعلق آپ ۱۰مئی ۱۹۰۷ء کو ایک خط میں اپنے صاحبزادے کو تحریر کرتے ہیں۔

> "آنکھ کی حالت بدستور وہی ہے۔ غالباً اگر ایک دو روز میں آنکھ کی روشنی میں ترقی نہ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب ایک مختصر آپریشن پھر کریں گے۔ ابھی تک حروف موٹے یا باریک بالکل نظر نہیں آتے۔"

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص:۳۹۸)

ابھی آنکھ کے آپریشن سے مولانا کو مکمل آرام بھی نہیں ہوا تھا اور آنکھ ابھی اس قابل بھی نہ ہوئی تھی کہ لکھنے پڑھنے یا دیگر روزمرہ کے کام انجام دے سکیں لیکن اس کے باوجود ایسی حالت میں آپ نے قومی کام کو ترجیح دی۔ باوجود موسم کی خرابی اور شدتِ سرما آپ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ آپ کی صحت ہرگز ہرگز اتنے دُور دراز کے سفر کی متحمل نہ تھی جس کا ذکر آپ ایک خط میں معذرت کے ساتھ کرتے ہیں جو ۲۵ر نومبر ۱۹۰۷ء کو خواجہ سجاد حسین صاحب کو تحریر کیا ہے۔

صدارت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی

> "لوکل کمیٹی کراچی اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علی گڑھ نے غلطی سے اجلاس میں مجھے پریذیڈنٹ بنانا تجویز کیا ہے۔ ہر چند عذرات کیے گئے مگر مجھے اس قدر مجبور کیا گیا کہ انکار کرنے کا محل باقی نہ رہا۔ اس لیے علی گڑھ جا کر چند روز وہاں قیام کرنا اور پریذیڈینشل ایڈریس تیار کرنا پڑے گا جو میرے لیے ایک بالکل نیا اور نہایت دشوار کام ہے۔"

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص:۴۱۰)

مولانا کانفرنس میں گئے اور ایک بلیغ خطبۂ صدارت بھی پڑھا جو اکثر اخبارات میں شائع بھی ہوا

اور کانفرنس کی رپورٹ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی شائع کیا گیا تھا۔

عمر کے آخری دور میں مولانا حالی کی مصروفیات

مولانا کی زندگی کے آخری دور میں گھریلو مصروفیات میں کافی اضافہ ہوتا گیا۔ زورِ ضعیفی اور پریشانیوں کی وجہ سے صحت بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ ۱۹۱۰ء کے شروع ہی میں آپ کی صحت بوجہ نزلہ و کھانسی اور تفکرات بہت خراب ہوگئی تھی۔ اعضائے رئیسہ میں کمزوری اور انحطاط شروع ہوگیا تھا۔ اُس وقت آپ کی عمر چوہتر (۷۴) سال تھی۔ رفتہ رفتہ جسمانی کمزوری اور امراض میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مرضِ وجع المفاصل کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ جوڑوں میں درد بڑھتا جارہا تھا۔ آپ اس ضعیفی کے زمانے میں ایک پُرسکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے متمنی تھے، تاکہ باقی ماندہ زندگی کے دنوں میں کوئی علمی و ادبی اور قومی خدمت ہی انجام دے سکیں۔ اکثر اسی مقصد کے لیے وطن چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر جانے کا خیال بھی آیا لیکن بعض امورِ خانگی اور دیگر ذمہ داریوں نے مولانا کو سکون اور چین نصیب نہ ہونے دیا۔

خواجہ عبدالولی کی مسلسل بیماری اور دماغی حادثہ

ضعیفی کا زمانہ امراض کی شدت اور دیگر مکروہات کے علاوہ آپ کے چھوٹے نواسے ''راقم الحروف کے والد'' خواجہ عبدالولی وؔلی مرحوم اُستاد کے غلط طریقہ سرزنش کی وجہ سے دماغی خرابی میں مبتلا ہوگئے۔ جب وہ ساتویں جماعت میں مدرسہ بالائے قلعہ ایم۔ بی مڈل سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس واقعہ کی راقم الحروف نے کافی شہادتوں اور چھان بین کے بعد معلومات حاصل کیں تو بہ زبانی خواجہ مظہر علی صاحب جو والد بزرگوار کے ہم جماعت بھی ہیں نے فرمایا کہ ''وہ استادِ مکرم جناب مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب تھے جو ابا مرحوم کے رشتے میں ماموں بھی ہوتے تھے۔ جن سے راقم الحروف نے بھی ساتویں جماعت میں فارسی کا درس حاصل کیا ہے۔'' اور اکثر مجھ پر بھی انھوں نے کئی بار کرم فرمائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے بھی فارسی کا مضمون چھوڑ دیا اور تنگ آکر ڈرائنگ میں داخلہ لے لیا تھا۔ ابا مرحوم اُس دماغی چوٹ سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور تا دمِ واپسیں اسی نامراد مرض میں مبتلا رہے اور کبھی کبھی اتنی شدت کے ساتھ دورہ پڑتا تھا کہ آپ اپنے ہوش و حواس تک کھو بیٹھتے تھے اور گھنٹوں نیم بے ہوشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ مولانا مرحوم کو اپنے اس معصوم اور بے سہارا نواسے سے انتہائی عشق تھا۔ آپ نے ہزارہا روپیہ یہاں ابو (خواجہ عبدالولی) کی بیماری پر خرچ کیا۔ روحانی علاج کے علاوہ متعدد مقامات پر جہاں بھی کسی نے کسی معالج کا پتہ بتایا مولانا خود بہ نفسِ نفیس بیمار نواسے کو اپنے ہمراہ لے کر گئے لیکن کوئی آرام نہ ہوا۔ راقم الحروف نے اپنے والد کو تقریباً آٹھ سال کی عمر سے اٹھارہ

انیس سال کی عمر تک نہایت صحت مند دیکھا اور مرحوم اکثر مسکرا کر گفتگو کیا کرتے تھے۔ جہاں تک دماغی بیماری کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بیماری یا مرض نہ تھا جس میں مرحوم مبتلا تھے بلکہ ہیمبرج کی قسم کا مرض یا تکلیف ہوگئی تھی جیسا کہ خواجہ منظر علی صاحب نے فرمایا کہ ''خواجہ غلام حسین صاحب نے کسی غلطی پر یا شرارت پر میاں عبدالولی کے سر کے بال سختی کے ساتھ پکڑے اور متعدد بار دیوارِ کمرہ کے ساتھ سر کو زور زور سے دے کر مارا جس کی وجہ سے وہ اُسی جگہ کلاس روم میں ہی بے ہوش ہو گئے اور مولانا موصوف نے اُن کو فرش پر سے اُٹھایا تک نہیں اور نہایت بے اعتنائی کے ساتھ کلاس روم سے باہر چلے گئے تو کلاس کے بچوں نے جس میں مَیں بھی تھا ہیڈ ماسٹر صاحب جناب ظفر علی خان کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے فوراً ہسپتال بھجوایا اور گھر پر اطلاع دی۔''

وفاتِ خواجہ عبدالولی دامادِ حالی

مولانا کو خواجہ عبدالولی (میاں ابو) جو ایک نہایت ذہین اور ہونہار ہونے کے علاوہ اچھی صحت کے حامل تھے، کے ذہنی مرض کا بہت صدمہ تھا اور آپ رات دن ان کے علاج معالجے کے لیے فکر مند رہتے تھے کہ اچانک خواجہ عبدالعلی جو میاں ابو کے والد تھے اور محکمہ پولیس سے انسپکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہو کر پانی پت آئے تھے کا انتقال ہوگیا۔ جس کے متعلق مولانا خان بہادر خواجہ تصدق حسین صاحب کو ایک خط جو مورخہ ۲۶/مارچ ۱۹۰۵ء کو لکھا گیا تحریر کرتے ہیں۔

> ''میں عبدالولی کو ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر مختار اللہ انصاری) کے ملاحظے کے لیے دہلی گیا تھا۔ وہاں سجاد حسین کا خط پیغام پہنچا کہ یہاں (پانی پت میں) عبدالعلی زیادہ بیمار ہیں فوراً وہاں سے چلا آیا۔ یہاں آ کر دفعتاً سنا کہ رات اُن کا انتقال ہوگیا۔''

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص ۷۷)

مولانا کے بڑے نواسے جناب خواجہ فرزند علی صاحب ''مالک و منیجر حالی پریس'' محکمہ اخبار میں اس وقت مدیر تھے جو اپنی ملازمت کی وجہ سے اپنے بھائی کی اچھی طرح دیکھ بھال اور کماحقۂ علاج معالجہ بھی نہ کرا سکتے تھے۔ کیونکہ ابا مرحوم کو بعض اوقات اتنی شدت سے دورے پڑتے تھے کہ سکتے کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور جب ذرا دورہ ختم ہوتا تو جنوں کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور کپڑے پھاڑنے لگتے تھے۔ تمام جسم میں اک نامعلوم کھجلی نمودار ہو جاتی اور منہ اور دانتوں سے خون بھی بہنے لگتا تھا۔ مولانا اپنے اس چہیتے پیارے نواسے کو اس کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتے تھے جب کہ وطن میں رہ کر بھی آپ کو چین نصیب نہ ہو سکا۔

مولانا حالی کے مکتوبات میں جہاں سینکڑوں خط احباب کے نام ہیں وہیں متعدد خطوط میاں

عبدالولی کی بیماری کے تذکروں پر مشتمل ہیں جن میں سے چند خطوط کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

ایک خط جو آپ نے مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۸۹۵ء کو ڈیرہ اسمٰعیل خان میں خان بہادر خواجہ تصدق حسین صاحب کے نام تحریر کیا ہے جب کہ وہ صوبہ پنجاب کے میر منشی تھے۔ جس میں خواجہ عبدالولی کی ذہانت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> ''پانی پت کی گلیوں کی آب وہوا بچوں کے حق میں سم قاتل ہے۔ میرے نزدیک تو عبدالولی بھی تمہارے پاس رہے تو بہت ہی بہتر ہے لیکن اول تو ابھی اُس کو تین سپارے قرآن مجید ختم کرنے میں باقی ہیں۔ اس کے بغیر اس کی ماں کہیں باہر بھیجنے کی روادار نہیں ہے۔''

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص ۲۰۶)

''یہ اوائل عمر کی بات ہے کہ جب میاں عبدالولی کا دماغی توازن بالکل درست تھا۔ افسوس کہ اساتذہ بعض اوقات سزا دینے میں اتنی شدت اور غصہ سے کام لیتے ہیں کہ معصوم بچوں کی زندگیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور پھر بھی اُن کے غصے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔''

اسی طرح ایک اور خط میں خان بہادر صاحب کو تحریر کرتے ہیں اور میاں ابو کے علاج سے متعلق مفصل حال تحریر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''میاں عبدالولی کا حال بدستور ہے۔ اس کو معہ اُس کی والدہ کے میرٹھ لے گیا تھا ڈاکٹر سلیم اللہ صاحب کا علاج ہوتا رہا۔ پھر وہاں سے دس بارہ دن کی دوا لے کر یہاں چلے آئے۔ یہاں آتے ہی مرض میں پھر شدت ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہ دوا چھوڑ دی گئی۔''

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص ۷۶)

خواجہ عبدالولی کے علاج کے لیے مولانا کی جدوجہد

خواجہ عبدالولی کی بیماری جس کا خاطر خواہ علاج کرانے کے باوجود کوئی فائدہ نہ ہوسکا اور ڈاکٹری ادویہ بھی کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں تو ناچار مولانا نے دیسی علاج کے لیے بھی متعدد حکما اور سنیاسیوں اور ویدوں سے رجوع کیا۔ مندرجہ بالا خط میں مزید درج کرتے ہیں کہ ''موضع بابو تحصیل کرنال میں ایک مسلمان رانگھڑ (راجپوت) کے پاس، جو ایک بوٹی سے علاج کرتا ہے، خود اُس کو لے کر گیا۔ تین دن ایک بوٹی کا عرق اس

نے ناک میں ڈالا پھر رخصت کر دیا۔ یہاں آ کر پھر وہی حالت ہو گئی۔'' مولانا نے اپنے نواسے کے علاج میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جہاں کہیں بھی آپ کو معلوم ہوتا کہ کوئی سیانا ڈاکٹر یا حکیم اور وید مرض صرع کا علاج کرتا ہے آپ فوراً وہاں جاتے۔ ہزار ہا روپیہ علاج پر صرف کیا۔ یہاں تک کہ آرام کو آرام اور دکھ کو دکھ نہ سمجھا۔ ایک اور خط میں خان بہادر صاحب کو لکھتے ہیں۔

> ''میرا نفس ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ عبدالولی کی ماں کو جسے بظاہر دنیا میں خدا کے بعد میرے سوا کسی کا سہارا نہیں ہے سخت مصائب میں مبتلا چھوڑ کر آپ آرام و آسائش کی زندگی بسر کروں۔ اس لیے اب جتنے انفاس باقی ہیں چاہتا ہوں کہ اس کی غمخواری و اعانت میں گذریں۔''

(مکتوباتِ حالی، حصہ دوم، ص: ۸۳)

☆☆☆☆

انور شعور

مرا یار مجھ سے جدا ہو گیا
یہ کیا کہہ رہے ہو، یہ کیا ہو گیا

ستارے کا کوئی بھروسا نہیں
کبھی گُم، کبھی رُونما ہو گیا

تم اک مرتبہ کیا دکھائی دیے
مرا کام ہی دیکھنا ہو گیا

فلک نے پلٹ کر نہ دیکھا کبھی
کوئی خوش ہوا یا خفا ہو گیا

سُنانے لگا آپ بیتی شعورؔ
غضب خیریت پوچھنا ہو گیا

☆☆☆☆

سلطان سکون

صحرا میں رہ کے خوش ہیں کہیں گلستاں سے ہم
رہتے ہیں بے نیاز بہار و خزاں سے ہم

اُن کی جفائیں اپنی وفائیں غمِ جہاں
افسانۂ حیات سنائیں کہاں سے ہم

سب کچھ لٹا دیا ہے محبت کی راہ میں
آزاد ہو گئے غمِ سُود و زیاں سے ہم

کیوں کر بڑھے گا آگے محبت کا سلسلہ
کچھ بدگماں سے آپ ہیں کچھ بدگماں سے ہم

وعدہ کیا جو آپ سے وہ تو نبھائیں گے
ہوں گے نہ منحرف کبھی اپنی زباں سے ہم

یہ سوچ کر ہمارا نہ بن جائے وہ رقیب
‘‘سب کچھ کیا مگر نہ کُھلے رازداں سے ہم’’

گو چند شعر اُس کی زمیں میں کہے سکون
بڑھ تو نہ پائے ‘‘حالیِ جادُو بیاں’’ سے ہم

☆☆☆☆

صابر ظفر

معمورۂ ازل کی رہی ہے خبر کہاں
مٹی کہاں ہے، چاک کہاں، کوزہ گر کہاں

دل کی طرف کا سارا علاقہ اُجاڑ ہے
جانے اِدھر کے لوگ گئے جا کے مر کہاں

مَیں سوچتا نہیں ہوں تو آتا ہے کیوں خیال
دیوار و در تو بن گئے، لیکن ہے گھر کہاں

آتی ہے اب بھی ایک صدا دشتِ نجد سے
عشق، آفریدگار مگر باروَر کہاں

آوارگی میں ہوش کسی کا نہیں رہا
منزل کہاں ہے اور ہے صابر ظفر کہاں

☆☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

بس کہ ___ از قِسمِ مُمکِنات نہیں   مسئلہ ذات ہے صفات نہیں
ایک دن بِالضرور چمکے گا   ایک دن جس کے بعد رات نہیں
اِسی زنداں میں ہے، وہ کُنجِ فراغ   جہاں ___ پابندیِ جہات نہیں
کب مرا دل نہیں ترے ہمراہ؟   کب تری یاد میرے سات نہیں؟
کون دن ___ بن سفر گزرتا ہے؟   کون شب ___ رقصِ حادثات نہیں؟
اپنی ہی واردات کہتا ہوں   مُردہ لوگوں کے تجربات نہیں
دوستو! پیار ہو ہی جاتا ہے   اس میں ایسی تو کوئی بات نہیں
اے خوشا ___ زندگی پہ مر جانا   یہ وہ بازی ہے جس میں مات نہیں
ہائے وہ دن ___ کہ ہم بھی زندہ تھے   اب بھی جیتے ہیں ___ پر وہ بات نہیں
کیا کُھلیں معنیِ حیات ___ جہاں   ایک بھی ___ صورتِ حیات نہیں
آنکھ میں پھر سَراب سے کیا ہیں؟   دل میں ___ گر خواہشِ فُرات نہیں
راستوں سے تو بھاگ نکلے تھے   منزلوں سے ___ رہِ نجات نہیں
خواہشو ___ خوب سوچ کر مرنا   موت کو بھی مگر ثبات نہیں
دفعتاً جانے کیا ہُوا ___ یعنی   وہ تعلق ___ وہ التفات نہیں
یا ہمیں ہو گئے کچھ اور حبیبؔ   یا وہ پہلی سی کائنات نہیں

☆☆☆☆

اعجاز گل (امریکہ)

جب کوئی شہرِ طلب حاصلِ رفتار نہیں
بیٹھنا تھک کے مجھے باعثِ آزار نہیں
کام سلنے کا، ادھڑنے کا نکل آتا ہے
عادتِ کار نے رکھا کبھی بے کار نہیں
حال احوال اشاروں سے پتا کرتے ہیں
اہلِ دنیا کو ذرا فرصتِ گفتار نہیں
دائیں بائیں سے یہ کترا کے گزر جاتا ہے
کل کہ اس وقت کو تھا، آج میں درکار نہیں
جنسِ نا جنس ہوں متروک دکاں کے اندر
جو کسی طور بھی اب حصۂ بازار نہیں
دھوپ سورج کی لیے پھرتی ہے اپنے ہمراہ
اندریں خشتِ نہاں سایۂ دیوار نہیں
ہوں طلب گار تو میں دھوپ، ہوا، پانی کا
میرے محتاج مگر ثابت و سیّار نہیں
آئنہ نقش دکھاتا بھی نہیں پہلے سے
عکسِ معدوم بھی کرتا، تہہِ زنگار نہیں

☆☆☆☆

ارشد جاوید

تھی مجھے مرغوب تنہائی بہت
راست کوئی مجھ کو راس آئی بہت

آج کھل کر ہنس لیا اچھا کیا
آنکھ کی جھیلوں میں تھی کائی بہت

کل کسی کے ساتھ دیکھا تھا تجھے
چبھ رہی ہے اپنی بینائی بہت

اس لیے ہنگامہ برپا ہے یہاں
بات کم ہے اور کویائی بہت

ہر کوئی پہچان لیتا ہے مجھے
میں نے شہرت کی سزا پائی بہت

☆☆☆☆

خالد خواجہ

ہم نے کھیتوں سے بے وفائی کی
جا کے شہروں سے آشنائی کی

ہم سے پوچھو کہ ہم کو ہے معلوم
کیا اذیت ہے نارسائی کی

ہم نے نفرت بھی ٹوٹ کر کی ہے
اور محبت بھی انتہائی کی

بولنے والے سارے قتل ہوئے
اب سزا ہوگی کم نوائی کی

ہم کو بدنامیوں کا خوف نہیں
اور رُت بھی ہے جگ ہنسائی کی

اب کے خالد جی اس ستم گر نے
حد ہی کر دی ہے کج ادائی کی

☆☆☆☆

اخلاق عاطف

تھی کبھی اس میں پذیرائی بہت   عشق ہے اب کارِ رسوائی بہت
دھوم تھی از حد کہ ہوگا معرکہ   تھا تماشا کم، تماشائی بہت
کام کی آتی ہے کم کم ہی صدا   ہے بہر سُو شورِ گویائی بہت
آج بھی کنعاں میں ہیں یہ تذکرے   ”دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت“
آخرش کو دل نے بازی ہار دی   اوّل اوّل برتری پائی بہت
ہو نہ پائے عشق میں جو سرخُرو   راس یہ دنیا اُنہیں آئی بہت
بحر و دریا سے ہی کیوں مشروط ہو   ڈوبنے کو چشمِ گہرائی بہت
توشۂ عبرت ہیں روز و شب مرے   وقت نے یہ بات دُہرائی بہت
منسلک ہے ذوقِ نظارا کے ساتھ   پتھروں میں بھی ہے رعنائی بہت
چاہنے والوں نے ہی اکثر کہا   چاہنے والوں میں ہرجائی بہت
کل جو کہتے تھے، نہ بچھڑیں گے کبھی   یاد اُن کی آج بھی آئی بہت
ہم نہ مانے، وہ بہت کہتے رہے   وہ نہ سمجھے، ہم نے سمجھائی بہت
تھا کبھی یہ شیوۂ فرزانگاں   اب ہے دیوانوں میں دانائی بہت
کُنجِ تنہائی میں بھی اہلِ نظر   دیکھتے ہیں بزم آرائی بہت
ہیں ہمیں عاطفؔ، فقط اِک شوخ کے   حُسن و نکہت، زیب و زیبائی بہت

☆☆☆☆

امتیاز الحق امتیاز

دل پر جو دل نے مُہر لگا دی تو ڈر کہاں
یہ فیصلے ہوئے ہیں کبھی سوچ کر کہاں
میں دستِ کوزہ گر سے کہیں دُور ہوں ابھی
آیا مرا وجود ابھی چاک پر کہاں
آوارۂ خیال ہوں مجھ کو خبر نہیں
ہوتی ہے میری شام کہاں اور سحر کہاں
ممکن ہے اس پڑاؤ پہ تا عُمر ہو قیام
تم چل پڑے ہو اُٹھ کے مرے ہم سفر کہاں
کون و مکاں کی حد سے بھی آگے نکل گئی
“اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں”
خالی پڑی ہوئی ہے مرے سامنے زمین
دیوار میں اٹھاتا ہوں دیوار پر کہاں
انسانیت کے ٹکڑے پڑے ہیں یہ امتیازؔ
بازو کہاں ہیں دھڑ ہے کہاں اور سر کہاں

☆☆☆☆

شہاب صفدر

دیکھتے ہم نہ کسی راہگذر کی صورت
پہلے خوابوں میں نہ بنتی جو سفر کی صورت

اس کی تصویر سے بدلا ہے کچھ ایسے ماحول
چمنستاں کی طرح کھل اٹھی گھر کی صورت

یوں ہتھیلی پہ ہیں قسمت کی لکیریں جیسے
سرِ دیوار ہو چسپاں کوئی در کی صورت

جانے کب ابھریں گی صبحیں کہ نظر آئے گی
لوحِ اخبار میں بس خیر خبر کی صورت

اب تو سوچی ہے وہ ترکیب کہ جائے گا کہاں
جب نہ پائے گا اگر اور مگر کی صورت

نہ وہ آتا ہے نہ ہم اس کی طرف جاتے ہیں
نظری فاصلہ ہے دشتِ خطر کی صورت

ساحلِ شوق شہاب اصل میں تھا چشم براہ
پیشوائی کو غم آئے تھے بھنور کی صورت

☆☆☆☆

شہزاد بیگ

اس عہدِ ناسپاس میں قدرِ ہنر کہاں
اِک شہرِ سنگ و خشت میں شیشے کا گھر کہاں

پھولوں کے ساتھ ہے ترا چہرہ کھلا ہوا
اب دیکھنا ہے ٹکتی ہے کس کی نظر کہاں

ہلکی سی ٹیس پر ترے آنسو چھلک پڑے
رکھا ہے تُو نے میرا بھرم چشمِ تر کہاں

اب انجمن میں پہلی سی رعنائیاں نہیں
اہلِ نظر کہاں گئے، اہلِ ہنر کہاں

ہم کو ممانعت تھی ترے ساتھ عشق کی
پھر تیری جستجو میں بھی کرتے بسر کہاں

شہزاد خاک چھانتے گزری تمام عمر
اُس کا پتہ کہاں، مجھے اپنی خبر کہاں

☆☆☆☆

خورشید ربانی

خامشی کو صدا کیا تو نے
عکس کو آئنہ کیا تو نے

رنگ و نکہت کو میں کیا یکجا
ان کو لیکن جدا کیا تو نے

میری پلکوں پہ جو چمکتا تھا
اس ستارے کا کیا کیا تو نے

وہ جو زندانیِ تمنا تھا
اس شرر کو رہا کیا تو نے

اس کے آنچل میں کھلتے پھولوں سے
باغ کو آشنا کیا تو نے

بے نیازی سے بھر گئے ہیں وہ
پتھروں کو خدا کیا تو نے

جب مجھے ڈھونڈتی پھری منزل
راہ کو رہنما کیا تو نے

☆☆☆☆

علی یاسر

آئینۂ تنہائی سرِ شام ہے درپیش
جاتا ہوں جدھر حسرتِ ناکام ہے درپیش

اٹھتا ہے قدم اور زمیں پر نہیں پڑتا
آغازِ سفر، ساتھ ہی انجام ہے درپیش

اک جہدِ تمنائے جنوں خیز ہوئی ختم
اک سلسلۂ عرصۂ آرام ہے درپیش

میں تیشے بغیر آج کروں گا اسے تسخیر
جو کوہِ گراں صورتِ آلام ہے درپیش

منزل پہ نظر آیا سرابوں کا سمندر
یعنی، ہے سزا یا کوئی انعام ہے درپیش

کب ہم نے کِھلایا ہے گُلِ حرفِ شکایت
جو تُو نے لکھا تھا وہی پیغام ہے درپیش

ہے نقشِ غزل یا کسی الجھن کا سراپا
چہرہ ہے ترا یا کوئی ابہام ہے درپیش

☆☆☆☆

سلطان فریدی

حیات اپنی اک دن گزر جائے گی
مگر دل کی خواہش کدھر جائے گی؟

جو دنیا سے ہو گی سُبک دوش وہ
تو اپنے وطن، اپنے گھر جائے گی

ہے فانی یہ دنیا، اَدھوری حیات
اَدھوری سہی کام کر جائے گی

رہے گا زمانہ یُونہی بے نوا
کہانی زمیں کی سنور جائے گی

چھپی اس کے دل میں ہے خالی اُمنگ
ہے اُمید سلطاں کو بھر جائے گی

☆☆☆☆

اسداعوان

یارانِ رفتگاں کی نشانی نہ پوچھیے
‘‘کیسے گزر رہی ہے جوانی نہ پوچھیے’’
الفاظ سوگوار ہیں اب تک ترے لیے
روٹھے ہوئے ہیں مجھ سے معانی نہ پوچھیے
سرمایۂ سخن کی لحد پہ ہیں اشکبار
اہلِ نظر کی مرثیہ خوانی نہ پوچھیے
میری نگارشات سے ڈھونڈو مجھے مگر
‘‘میری کہانی میری زبانی نہ پوچھیے’’
بہتا گیا ہے رَو میں زمانہ سخن شناس
شعروں میں اس قدر ہے روانی نہ پوچھیے
ارزاں ہوئی ہے جنسِ ہُنر اب چہارسُو
بازارِ نعرہ زن میں گرانی نہ پوچھیے
دیکھا نہ شاعری میں کہیں ہم نے ابتذال
اقلیمِ فکر و فن کی کہانی نہ پوچھیے
‘‘عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں’’
ساعت یہ وصل کی ہے سہانی نہ پوچھیے
پہلے بھی ایک بار کہا ہے کہیں اسدؔ
ان مفتیوں کی شعلہ بیانی نہ پوچھیے

☆☆☆☆

ثنااللہ ظہیر

یوں تو زمیں میں کتنے ہی آتش فشاں رہے
سطحِ زمیں پہ صرف گلوں کے نشاں رہے

ایسے رہا ہوں حلقۂ یاراں میں جس طرح
باتونیوں کے بیچ کوئی بے زباں رہے

فتح و شکست سے مجھے مطلب نہیں کوئی
کیا کم ہے میرے بعد مری داستاں رہے

موقع ملے تو ہم نئے لوگوں میں آکے بیٹھ
ہم چاہتے ہیں سوچ تری بھی جواں رہے

جینے کا انحصار خبر بیچنے پہ تھا
اور ہم کہ ایسے میں بھی ترے رازداں رہے

بیکار اپنے واسطے نفرت کشید کی
بیکار میں ہی آپ سے ہم بدگماں رہے

غالبؔ نے آج خواب میں مجھ سے کہا ظہیرؔ
حالیؔ سے اب ملے ہو! تم اب تک کہاں رہے

☆☆☆☆

تجمل جرال

تو سامنے بھی ہو تو وہ ذوقِ نظر کہاں!
اب آرزو کی شاخ پہ ویسا ثمر کہاں!

یہ زخم وہ ہے جس کا مداوا نہ ہو سکے
رکھا ہے دل پہ آس کا مرہم مگر کہاں!

کچی چھتوں کے سائے میں کیا کیا سکون ہے
شہزادگانِ قصر کو اتنی خبر کہاں!

قال الرّسول اِنّما الاعمال بالنیات
‘‘دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں’

دیوار و در پہ جن کے محبت کی چھاپ ہو
اب ایسی بستیاں کہاں، ایسے نگر کہاں!

اندھی عقیدتوں نے بصیرت بھی چھین لی
ان ظلمتوں میں آئے خدا بھی نظر کہاں!

ہم بھی مآلِ عشق سے کچھ بے خبر نہیں
صاحب یہ کام چھوڑ کے جائیں مگر کہاں!

☆☆☆☆

مسعود تنہا

میری نظر میں ایسا کوئی معتبر کہاں
''عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں''

اب تک بھٹک رہا ہوں مَیں صحرائے فکر میں
منزل شناس میرا کوئی ہم سفر کہاں

سیکھا ہے تجھ سے ایک زمانے نے یہ ہُنر
تجھ سا سخنوری میں کوئی راہ بر کہاں

آسائشِ زمانہ کہاں ہے نصیب میں
آسودہ علم و حلم میں شوریدہ سر کہاں

تفصیل کیا کروں گا تیرے فن کی مَیں بیان
مجھ کم سخن میں اتنی ہے عرضِ ہُنر کہاں

تنہاؔ تخّیلات کی وسعت میں کھو گئے
رستے سخنوری کے ہوئے مختصر کہاں

☆☆☆☆

ڈاکٹر فاخرہ نورین

آہِ رسا یہیں سے گئی تھی مگر کہاں
کیا جانیے دریچہ کہاں پر ہے در کہاں

ہر بار دل بسا ہے، مگر آنچ ہے وہی
اجڑیں تو پہلے جیسے بسے ہیں نگر کہاں

پتوار ناخدا نے ہی پانی میں پھینک دی
پھر کس طرف کو ناؤ گئی ہم سفر کہاں

یہ تارکول سے بنی سڑکیں تو خوب ہیں
ان کے کنارے سبز گھنیرے شجر کہاں

حالؔی تری زمین میں لکھا کروں غزل
مجھ کم سخن کے پاس ہے ایسا ہنر کہاں

☆☆☆☆

جبار واصف

ٹھیک ہے میں نے بے وفائی کی
کون سی تُو نے دِل رُبائی کی

تُو ہی اپنا تھا ساری دنیا میں
اور تُو نے ہی کج ادائی کی

میرے کاسے میں بھر گئی نفرت
میں نے جب پیار کی گدائی کی

جو پرندے رہا کیے تُو نے
اُن کو خواہش نہ تھی رہائی کی

مان جاؤں گا میں بکاؤ ہوں
شاعری نے اگر کمائی کی

قتل ہونا ہے خامشی سے مجھے
کیونکہ سازش ہے میرے بھائی کی

صبحِ غم پھر دہک اُٹھی واصفؔ
جل بُجھی رات پھر جدائی کی

☆☆☆☆

محمد لطیف سیف

صدقے جاؤں تری عطاؤں پر
بخش دیتا ہے تُو خطاؤں پر
ہے گذر جن کا کہکشاؤں پر
اپنا تکیہ ہے اُن ہواؤں پر
کن صداؤں سے مانگ لیتے ہیں
مجھ کو حیرت ہے ان گداؤں پر
کون کشتی کہاں ڈبوئے گا
آنکھ رکھتا ہوں ناخداؤں پر
لوگ مرتے ہیں حسن پر لیکن
جان دیتے ہیں ہم اداؤں پر
دیکھ لو لاکھ منتیں کر کے
اب نہ آئیں گے ہم وفاؤں پر
اٹھ کے پیروں میں گر گئے آخر
ایسے اُترے وہ التجاؤں پر
رفتہ رفتہ وہ آن پہنچے ہیں
بدعاؤں سے اب دعاؤں پر
لُوٹ لیتے ہیں راہ زن بن کر
کر بھروسا نہ رہنماؤں پر
آج پیرِ مغاں کو سمجھانا
چھوڑ دے سیف پارساؤں پر

☆☆☆☆

عبادت حسین

ہم جو صحرا میں گھر بنانے لگے
وہ بھی اس سمت آنے جانے لگے

دل کے آنگن میں کون آیا ہے
در و دیوار مسکرانے لگے

جانے کیا ہے پسِ غبارِ نظر
لوگ دنیا سے اٹھ کے جانے لگے

آ گئے ہیں اک ایسے موڑ پہ ہم
راستے بھی نظر چرانے لگے

وہ تو کب کا ہے منتظر اپنا
ہم کو جاتے ہوئے زمانے لگے

اس کو دیکھا تو میرے دل میں بھی
کیسے کیسے خیال آنے لگے

☆☆☆☆

انور شعور

نذرِ حالی

غمِ خستہ حاؔلی کئی دن سے تھا
مرا ہاتھ خالی کئی دن سے تھا

مجھے دے دیا آج اُس نے جواب
میں جس کا سوالی کئی دن سے تھا

اچانک نہیں آ گئی ہے خزاں
یہ امکان مالی! کئی دن سے تھا

مجسم ہوا دفعتاً خواب میں
جو پیکر خیالی کئی دن سے تھا

بہت آج حاؔلی یہ بولا شعوؔر
اُدھار اُس پہ حاؔلی کئی دن سے تھا

☆☆☆☆

رانا سعید دوشی

اپنے ماضی کا حالی

عہدِ مکتب سے سنتے چلے آ رہے ہیں،
”کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا“
یہ ماضی کا قصہ ہے تر و تازہ ایسا
کہ اب تک بھی ماضی کا حصہ نہیں لگ رہا
وقت نے، وقت سے پیش تر کہہ دیا،

اپنے باغِ سخن کا جو مالی ہے ۔۔ حالی ہے
بیتے زمانوں کا حالی ہے جو
اپنے فردا تلک جائے گا

پانی پت ایسے میدان کی خاک کا وہ گُلِ سرخ رُو
جس پہ غالب فضاؤں نے دم پھونک کر
طائرِ خوش نوا کر دیا
وہ سخن کے خیاباں میں اس خوش نوائی سے چہکا
کہ اُس کو زماں تا زماں ۔۔۔ دلربائی ملی
ساعتوں کے نئے خوش نوا طائروں کی سماعت نے بھی
اس کے آگے
تلمذ کی خواہش میں زانو کو تہہ کر لیا

وہ بلند اُن کے اقبال کرتا رہا
جو مقدمات اس کی عدالت سے فیصل ہوئے
روشنی بن گئے

اب خیاباں غزل کا ہو یا نظم کا گلستاں،
جتنے دریا
سخن کے ہمالہ کی چوٹی سے گرتے،
گزرتے ہیں
جھرنے بناتے،
اترتے ہیں وہ
سب مسدس کے پانی کے سینے پہ یوں
گھوم کر، جھوم کر، رقص کرتے ہیں
جیسے ---
غزل کی حسیناؤں کے کھلکھلاتے ہوئے
سرخ گالوں پہ ان سے
بھنور پڑ رہے ہوں

یہ ماضی کا قصہ
کہ اب تک بھی ماضی کا حصہ نہیں لگ رہا
وقت نے وقت سے پیش تر کہہ دیا
اپنے باغِ سخن کا جو مالی ہے --- حالی ہے --
بیتے زمانوں کا حالی ہے جو
اپنے فردا تلک جائے گا

☆☆☆☆

اویس الحسن

بیادِ حالؔی

خوابِ غفلت سے جگاتا یاد حالؔی آ گیا
غمِ محبت کے سناتا یاد حالؔی آ گیا

فطرتِ حالؔی میں ہرگز کچھ ریاکاری نہ تھی
عشقِ حالؔی میں تو ممکن ہی جفاکاری نہ تھی

تھا صداقت کا وہ پیکر، کذب کا خوگر نہ تھا
اور عادت میں وہ ہرگز رسمِ ملّاں پر نہ تھا

جب تلک زندہ رہا، دل کو بھی گرماتا رہا
آہِ سوزاں کی تپش کچھ اور بھڑکاتا رہا

چشمِ باطن پر کھلے اس کی حقیقت کے نشاں
یادِ ماضی کی کشش جو تھی نظر میں ضوفشاں

اِک فصاحت کا سمندر موجزن شعروں میں تھا
اور وہ شیریں سخن مشہور سب لوگوں میں تھا

☆☆☆☆

ڈاکٹر فیاض لطیف/ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

الطاف حسین حالی کے سندھی ادب پر اثرات

خواجہ الطاف حسین حالی اردو زبان کے نامور ادیب، شاعر، معلم، فعال کارکن اور منفرد نقاد تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اردو ادب کی ترقی اور ترویج کرتے ہوئے گزاری اور اردو کے فروغ کے لیے بنیادی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اردو کے عناصرِ خمسہ میں ہوتا ہے۔ اردو کے ایک شاعر، ادیب اور نقاد کے طور پر انھوں نے جو کام کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ بالخصوص ''مسدسِ حالی' 'اور ''مقدمۂ شعرو شاعری'' ان کے ایسے شاہکار ہیں، جن کا اثر نہ صرف آنے والے اردو ادب پر پڑا بلکہ سندھی اور دیگر پاکستانی زبانوں کا ادب بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قبل اس کے کہ ہم مولانا الطاف حسین حالی کے سندھی ادب پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیں، مناسب ہوگا کہ پہلے ان کی زندگی اور ادبی کارناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تاکہ ان کی تخلیقی جہات کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت کے رہنے والے تھے، ان کا جنم ۱۸۳۷ء میں ہوا۔ ان کا سلسلۂ نسب شیخ الاسلام خواجہ عبیداللہ انصاری (پیر ہرات) سے ہوتا ہوا صحابیِ رسول حضرت ابوایوب انصاری سے جاملتا ہے۔ حالی کی عمر ابھی نو سال ہی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ جس کی وجہ سے انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ جس کا قلق انھیں عمر بھر رہا۔ بعض خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے انھیں صرف سترہ سال کی عمر میں شادی کرنا پڑی اور شادی کے ایک سال بعد ہی، جب ان کی عمر صرف ۱۸ سال تھی، وہ گھر والوں کو بغیر اطلاع دیے دہلی چلے گئے جہاں ایک مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہ ان کی زندگی کا انتہائی مشکل دور تھا۔ لیکن انھوں نے بڑی ہمت اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا اور مفلسی اور غربت کے باوجود اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ کچھ عرصے بعد ڈپٹی کمشنر کے آفس میں انھیں ایک معمولی ملازمت مل گئی لیکن وہ اسے زیادہ عرصے جاری نہ رکھ سکے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے ملاقات کے بعد، آٹھ سال تک ان کے بچوں کے استاد رہے۔ حالی کی فکری قلب ماہیت اس وقت ہوئی جب وہ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوئے جہاں انھیں انگریزی سے ترجمہ شدہ کتب پر نظرثانی کے فرائض سونپے گئے۔ اس ملازمت سے حالی کو کوئی مالی فائدہ ہوا ہو یا نہ لیکن ایک فائدہ ضرور ہوا کہ انھیں انگریزی ادبیات سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہوگئی جس نے بعد میں ان کی ادبی زندگی پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے۔ حالی کچھ عرصہ دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں مدرس بھی رہے۔ ایک

شخص کے طور پر اگر دیکھا جائے تو خواجہ صاحب ایک انتہائی شریف النفس اور وضع دار انسان تھے۔ خوش اخلاقی، خوش مزاجی، صبر و تحمل، دردمندی، درگذر اور متحمل مزاجی ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہایت قانع، متشکر اور راضی بہ رضا رہنے والے شخص تھے۔ حیدر آباد دکن کے نظام میر عثمان علی خان آصف جاہ نے ان کی ادبی خدمات کے طور پر نہ صرف ان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کیا بلکہ انھیں ۱۹۰۴ء میں شمس العلما کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ حالی کی شاعری اور نثر دونوں پر ان کی انکساری اور دردمندی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ مردہ دلوں کو بیدار کرنے اور منجمد ذہنوں کو خیالات کی قوت سے متحرک کرنے کی انوکھی صلاحیت رکھنے والے قلم کار تھے۔

سر سید احمد خاں نے قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے جس طرح کے علم و ادب کا نظریہ پیش کیا تھا ان کی تکمیل حالی کی تحریروں سے ہی ہو سکتی تھی اور ان کی تخلیقی کاوشوں نے یہ کام بہت احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ جس کا واضح ثبوت "مسدس حالی" ہے، جو انھوں نے سر سید ہی کے کہنے پر کہی۔ یوں اردو کے پہلے ملی شاعر کہلائے۔

یوں تو حالی نے نظم و نثر میں کئی کتب یادگار چھوڑیں مثلاً یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی، دیوانِ حالی، مسدسِ حالی، حیاتِ جاوید وغیرہ۔ لیکن انجمن پنجاب کے مشاعروں کے لیے موضوعاتی نظمیں لکھ کر انھوں نے اردو میں فطرتی شاعری کی بھی بنیاد رکھی جس نے آگے چل کر اقبال جیسے عظیم شاعر کو بھی متاثر کیا۔ چوں کہ ہمارا موضوع سندھی زبان و ادب پر حالی کے اثرات ہے اس لیے ہم اس مختصر مضمون کو ان کی صرف دو کتب "مسدسِ حالی" اور "مقدمۂ شعر و شاعری" تک محدود رکھیں گے کیوں کہ ہماری رائے میں سندھی زبان و ادب پر سب سے زیادہ اثرات انھی دو کتابوں نے مرتب کیے۔

"مسدسِ حالی" مولانا الطاف حسین حالی کی بے مثال تصنیف ہے۔ جسے شروع ہی سے اردو ادب میں بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اردو میں قومی شاعری کا آغاز اسی بے مثال طویل نظم سے ہوا۔ سر سید احمد خاں کے بقول "مسدسِ حالی" سے نظم کی صنف میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حالی نے اپنے مسدس میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور موجودہ پستی کا نقشہ ایسے دل نشین پیرائے میں کھینچا کہ ایک پتھر دل انسان بھی موم ہو جاتا ہے۔ یہ مسدس اپنے موضوعات اور اظہار کی سادگی کے لحاظ سے نہایت ہی بلند اور اہم ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں یہ مسدس ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ ایک مخلص مسلمان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے، ایک حساس انسان کی آنکھوں سے نکلنے والا آنسو ہے، ایک مصلح کا پیغام اور رہنما کا نعرہ ہے۔ اس دور کے مسلمان جن مشکل حالات سے دوچار تھے مولانا حالی کو ان کا اچھی طرح احساس تھا اس لیے مسدس حالی ایک زوال پذیر قوم کی بربادی کا مرثیہ ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی نوعیت منفی یا تخریبی نہیں بلکہ

تعمیری اور مثبت ہے۔ اس میں تاریکی اور مایوسی کا منظر بھی ہے اور روشنی کی شعاعیں بھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حالی کے پیشِ نظر جہاں حال کی بدحالی ہے وہاں ایک شاندار مستقبل کی تصویر بھی ہے۔

مولانا حالی کے مسدس کا سندھی زبان کے مقبول شاعر محترم اللہ بخش ابوجھو نے گہرا اثر قبول کیا۔ انھوں نے نہ صرف مسدس حالی کا سندھی میں ترجمہ کیا بل کہ اس کے تتبع میں "مسدس ابوجھو" بھی لکھا۔ جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مسدس حالی کا سندھی ترجمہ ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کا طبع زاد تخلیقی مسدس ہے جس کا موضوع قوم کو بیدار کر کے اسے باعمل اور فعال بنانا ہے۔

اس مسدس میں مرحوم اللہ بخش ابوجھو نے سندھ میں موجود سماجی اور معاشرتی بحران کو موضوع بنایا اور ان اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے اس دور کے مسلمان پسماندگی کا شکار رہتے۔ ہم اپنے اردو قارئین کے لیے چند اشعار کا اردو نثری ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

اب جب کہ غربت نے گھروں کا گھیراؤ کر لیا ہے
تو اسلامیانِ سندھ بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں
انھیں اپنی عظمت کا احساس ہوا ہے
پانی کی پیاس نے انھیں پریشان کیا ہے
تب وہ کرتے ہیں فریاد پر فریاد
کہ ہے کوئی جو دے اس
ڈوبنے والے کو سہارا
کیونکہ بحران ہے بہت ہی گہرا
ہوئیں سندھ میں مشہور یہ خبریں
قبول ہو گئیں دعائیں
کہ ہند میں تعلیم کو پھیلائیں
اصلاح کے مضبوط قلعے بنائیں
ہوں گی اب کوششیں کامیاب

مرحوم ابوجھو نے اپنے اس مسدس میں، اس دور کے تمام حالات کو انتہائی خوبصورتی سے شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مسدس ابوجھو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک شاہکار نظم ہے جو مسدس حالی کا فکری اور نظریاتی تسلسل ہے۔ اس سلسلے میں محمد صدیق مسافر کی رائے کتنی حقیقت پسندانہ اور معنی خیز ہے:

"اس بات میں کوئی بھی مبالغہ نہیں کہ مضمون کے لحاظ سے مسدس ابوجھو سندھ کے مسلمانوں کے ماضی اور حال کی سچی تصویر اور مسلمانانِ سندھ کے لیے ایک قیمتی نصیحت نامہ ہے۔ جس طرح حالی کی مسدس میں اجتماعی قومی بے حسی، بے عملی اور فقط لفاظی، محبت کی کمی، منافرت اور بیگانگی کے احساسات ملتے ہیں۔

نہ قوموں میں عزت، نہ جلسوں میں وقعت
نہ اپنوں سی الفت، نہ غیروں سی ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت
خیالوں میں پستی، کمالوں میں نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض ہی تواضع غرض ہی مداوا

بالکل اسی طرح کے خیالات اور احساسات کی خوشبو، لہجہ اور انداز اللہ بخش ابوجھو کے مسدس میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

نہ صحبت نہ الفت محبت ہمیں
نہ کوئی باہمی مروت ہمیں
نہ کوئی یار کی غرض سنگت ہمیں
نہ کوئی اپنے پاؤں میں بنکت ہمیں
نہ کوئی دلوں میں خوف و الم
نہ کوئی کسی کے وعظ و نصیحت پہ چلتا
ہر کوئی راہ دل خواہ اپنی پہ چلتا
کرتا ہے وہ جو دل چاہتا ہے

ابوجھو نے سندھی شاعری اور ادب میں اس وقت قدم رکھا جب قاسم، گدا، بلبل اور سانگی جیسے شاعر اپنے عشقیہ احساسات سے لوگوں کو مست کر رہے تھے۔ اس دور میں شعرا کا زیادہ رجحان غزل کی طرف تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے ہمعصر شعرا کی طرح اپنی شاعری میں، حسن اور محبت کی باتیں کر کے مفرح القلوب شاعری کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کا دل قوم کے درد سے بھرا ہوا تھا اور وہ مسدسِ حالی سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ وہ بھی علامہ شبلی نعمانی کی طرح مسلمانوں کی

عظمتِ رفتہ کو سامنے رکھتے ہوئے روشن مستقبل کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ شاعری میں گل وبلبل کے بجائے ایسے موضوعات نظم کیے جائیں جو قوم کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ مسدس حالی کا ترجمہ انھوں نے ایسے تخلیقی وفور سے کیا ہے کہ اس پر ترجمے کے بجائے طبع زاد نظم کا گمان گزرتا ہے۔ پروفیسر لطف اللہ بدوی کے بقول:

> "مسدسِ حالی کے اس ترجمے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مرحوم اللہ بخش ابوجھو نے اس کی ترتیب اور مفہوم کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لہٰذا اسے سندھی کے بہترین ترجموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔" (تذکرہ لطفی ج ۳)

ذیل میں مسدسِ حالی کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں تا کہ اس کے ترجمے کا موزانہ کیا جا سکے۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کی شان میں صدیوں سے لکھا جا رہا ہے مگر مسدسِ حالی کے مندرجہ ذیل اشعار میں جس عقیدت، محبت اور صداقت کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایک منفرد اور من کو مسحور کرنے والا ہے۔

آئي اوچتو غيرت حق کي حرڪت	یکا یک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
وڌيو جانب بوقبيس ابررحمت	بڑھا جانب بوقبیس ابرِ رحمت
ڪئي خاڪ بطحا ادا سا امانت	ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت
ٿي ڏيندايي آيا جنهن جي شهادت	چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ٿي هو پهلوني آمنه کان هويدا	ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائي خليل ۽ نويد مسيحا	دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا
ٿيا محو عالم کان آثار ظلمت	ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت
جو اُڀريو اَچي ماهتاب سعادت	کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت
عرب ۾ چِٽي چانڊني بعد مدت	نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت
جهڙن ۾ هو، هو ماهتاب رسالت	کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت
وڌو لطف ۽ مهرباني خدا جي	یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
جو قسمت وري ڦيرين غار حرا جي	کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

انھوں نے پوری مسدس کو اسی طرح سلیس سندھی زبان میں عام فہم انداز میں منتقل کیا ہے لیکن اس کے ترنم، تازگی اور مفہوم کو بدرجہ کمال قائم رکھا ہے۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے یادگارِ حالی میں لکھا ہے کہ مسدسِ حالی میں کئی خیالات، احساسات اپنی جگہ اتنے ہی پراثر، دلکش اور صنفی اعتبار سے اتنے لاجواب ہیں کہ اردو ادب

کے لیے ہمیشہ قابلِ فخر رہیں گے۔ اسی طرح مرحوم اللہ بخش ابوجھو کا مسدس بھی سندھی ادب میں ہمیشہ اپنی سندرتا، معنی خیزی اور دلکشی کے حوالے سے سندھی ادب کے قارئین اور نقادوں کے لیے قابلِ قدر رہے گا۔

مقدمۂ شعروشاعری درحقیقت دیوانِ حالی کا مقدمہ ہے لیکن وہ اپنے فکروفن اور اسلوب میں اتنا جامع ہے کہ اردو میں اصولِ تنقید کا سنگ میل تصور کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں حالی نے شاعری کی مختلف صنفوں کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یونانی، روسی، انگریزی اور عربی نقادوں کے فن شاعری کے متعلق مختلف خیالات پیش کیے ہیں اور غزل کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے انھوں نے عشقیہ اور فلسفیانہ عنوانات سے لے کر قومی اور عوامی مسائل کو بھی شامل کیا ہے۔

علاوہ ازیں شاعری کی زبان، اس کی تاثیر، تازگی، ترنم، اثرانگیزی، ردیف، قافیہ اور الفاظ کے اندرونی ترنم پر مفصل بحث کی ہے۔ آلِ احمد سرور مقدمہ شعروشاعری کے متعلق لکھتے ہیں "ہماری شاعری دل والوں کی دنیا تھی حالی نے مقدمہ شعروشاعری لکھ کر اسے ذہن عطا کیا۔"

اردو ادب میں اس منفرد "دماغ" رکھنے والی کتاب کے سندھی شعروادب بالخصوص تنقیدی ادب پر بالواسطہ یا براہِ راست اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کی کتاب "ادب اور تنقید" کا اکثر مواد مولانا حالی کے مقدمہ شعروشاعری سے لیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سندھی ادب میں تنقیدی شعور ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ بر دست اس حوالے سے بنیادی نوعیت کا کام ہوا ہے جس میں سے زیادہ تر کام حالی کے تتبع ہی میں ہوا یا پھر اردو اور انگریزی ادب کے زیر اثر۔ محترم بدر ابڑو کی کتاب "تنقید نگاری کا ارتقائی جائزہ" ہو یا ڈاکٹر فہمیدہ حسین کی کتاب "ادبی تنقید، فن اور تاریخ" کوئی بھی کتاب اردو نقادوں، مولانا حالی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور دیگر اردو انگریزی کے علماء اور ناقدین کے اثرات سے خالی نہیں۔

(سندھی سے اردو ترجمہ: آغا نور محمد پٹھان)

امدادی کتب

۱۔ مسدسِ حالی، مولانا الطاف حسین حالی
۲۔ مقدمہ شعروشاعری، مولانا الطاف حسین حالی
۳۔ تنقید نگاری، احسان بدوی، ۱۹۵۹ء
۴۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید
۵۔ تذکرہ و تبصرہ، سراج الاسلام
۶۔ تذکرہ لطفی، پروفیسر لطف اللہ بدوی

ارشاد شاکر اعوان

الطاف حسین حالی کے ہندکو ادب پر اثرات

خواجہ الطاف حسین حالی نے شعر کی دل گدازی کو دلفریبی پر ترجیح دی اور اپنے نظریہ ادب کو سادگی، اصلیت اور جوش کی تکون میں ظاہر کیا۔ آزاد کی معیت میں حالؔی کی انجمن پنجاب لاہور کے ذریعے اصلاحی کوششوں میں، طرحی مصرعوں پر غزل کے خیالی حُسن و عشق کی واردات اور فرضی معاملہ بندی کی بجائے، موضوعاتی نظموں کو رواج دینا شامل ہے۔ (۱) جس سے اردو ادب کو زندگی کی حرکت و حرارت سے مملو زمینی زندگی کا ترجمان بنا دیا۔ اسی ادبی فضا نے اردو ادب کو احمد حسین خاں کی آب بقا اور محمد اقبال کی بانگ درا کا ابتدائی کلام دیا۔ اقبال کی نظم ”ہمالہ“ اسی ادبی فضا میں لکھی گئی جس پر فکر و فنِ اقبال کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔ یقیناً اردو کی طرح علاقائی زبانوں نے بھی یہ اثرات قبول کیے اور علاقائی بولی کے درجے سے اٹھ کر زبان کے مرتبے پر فائز ہوئیں۔ سب مذہبی غیرت، قومی حمیت، وطنی جذبہ، ملکی ہمدردی کے علاوہ باہمی انسانی ہمدردی کے جذبات کی ترجمان بن گئیں مگر افسوس ہندکو زبان چاربیتہ اور حرفی کے میدان سے باہر قدم نہ رکھ سکی۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے مختصر تاریخ زبان و ادب ہندکو ۲۰۱۰ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع کرائی مگر ان کا انتخاب بھی ڈُکھ مجھیالے سے واقف ہونے اور استفادہ کرنے کے باوجود اُس جدتِ سخن سے دُور رہا، خاطر غزنوی نے جس حوالے سے اس میں شامل کلام کو پہاڑوں سے اترنے والے سات پانیوں سے تشبیہ دی تھی۔ مولانا حالی، غیر قوموں کی ہر بات، ہر کام، اُن کا حسن و قبح معلوم کیے بغیر نہ اپنانے کے حامی تھے نہ اُن کے خلاف صف آرا ہونے کے طرف دار۔ وہ اسے جہالت سمجھتے تھے۔ حالؔی ان خوبیوں کو اپنی قوم اور قومی ادب میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

ہنر ہم میں جو ہیں وہ معلوم ہیں سب
علوم اور کمالات معدوم ہیں سب
چلن اور اطوار مذموم ہیں سب
فراغت سے دولت سے محروم ہیں سب

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر
تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر

اُنھیں شکایت ہے کہ جدید مغربی علوم پڑھ کر اُنھیں عملی زندگی میں اپنایا جا سکا نہ اپنے دین کی حقانیت کو دلائل کے ساتھ ثابت کرایا جا سکا۔

دلیلیں ہیں سب آج بیکار اُن کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار اُن کی

حالی نے قومی زندگی کے احوال تو جو تھے بیان کیے متداول علوم پر بھی حرف زنی کی۔

سَلف لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے
صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے (۲)

حالؔی کی وفات ۱۹۱۴ء سے اب تک ایک صدی گزر گئی مگر ہم یہ نہ جان سکے کہ شریعت علمائے کرام کی رائے اور مفتیانِ عظام کے قیاسات کا نام نہیں۔ شریعت قرآن وسنت کا نام ہے۔ یعنی شریعت ہر دور میں زندگی کے مسائل قرآن وسنت کے مطابق، ان آرا وقیاسات سے مدد لے کر حل کرنے کا نام ہے۔ پہلی اسلامی مملکت، ریاستِ مدینہ کے منتخب حکمران (اولی الامرِ منکم) لرسولِ آخرؐ نے وحی کی روشنی میں آئینِ مملکت (میثاقِ مدینہ) دیا اور اس کی خلاف ورزی کے مرتکب کو دنیا و آخرت میں عذاب کی وعید سنائی۔ بادشاہوں کی دبائی ہوئی اقوامِ عالم نے آئینی مملکتیں قائم کیں اور آئین کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں قانون سازی کے لیے رہنما بنایا اور امن وسکون سے ترقی کر رہے ہیں مگر ہمارا وطن جو بنا ہی اسلام کے نام پر مسلمانوں کے لیے تھا، اپنے مقاصد سے ہٹ گیا۔

حالؔی نے اپنے مسدس میں اسی رویے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ہندکو ادبی سنگت ایبٹ آباد نے ”دکھ سنجھیالے“ کی اشاعت سے جہاں ہندکو شاعری کو چار بیتے اور حرفی سے باہر جھانکنا سکھایا وہاں اسے کیا موضوعات ومضامین اور کیا ہیئت ہر اعتبار سے حالؔی کی تراشی ہوئی راہوں پر چل پڑنے کی ترغیب دی۔

کتاب ”دکھ سنجھیالے“ ہزارہ میں ہندکو شاعری میں ترقی کا پہلا زینہ اور بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ اس مجموعے میں جدید غزل، نعتِ رسولؐ کے نئے پیرائے، ملی نغمے، قومی المیے، جدید فکری زاویے اور معاشرتی زندگی کی تنقید کے نئے نویلے پیکر سجائے گئے اور ایسے کہ گویا دبستان کھُل گیا۔

آیئے ہندکو شاعری کی ان خصوصیات کا مشاہدہ کریں جو ”ادبیاتِ سرحد“ کے فاضل مرتب اور ترقی

پسند شاعر کو نظر آئے نہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کو۔ ورنہ وہ غزل اور چاربیتہ ہی نہیں جدید غزل اور آزاد نظموں کو بھی بطورِ نمونہ پیش کرتے۔ مولانا حالؔی مرحوم، فرقہ واریت، طبقاتیت اور علاقائیت کے خلاف اور وحدت و سانجھے کے داعی تھے۔ ہزارہ کے شعرا نے اس طرف خصوصی رغبت دکھائی ہے مثلاً پرواز تربیلوی، جتنا خوش گلو تھا اتنا ہی خوش گو، وہ کہتا ہے:

کنڈا کِکر دا بنڑ کے کیوں چُبھنئیں، وس پیپڑیا، پھلاں دا ہار بنڑ کے
اویں بولیاں مار کے خار دیئیں، میرے عیب توں دس ماہیہ یار بنڑ کے

توں سمجھ کہ میں دلدار ترا، توں دلوں میرا غم خوار بنڑ جا
کڈھ دلوں ایہہ بغض بخیلیاں توں آ لگ گلے مرا یار بنڑ جا

اُسّی دوئے پنچھی ہکی باغ دے آں، ساڈا اُڈڑاں بولڑاں وَکھرا نئیں
ساں دے سُکھ سانجھے کم غم سانجھے ساڈا بُھوڑاں کھولڑاں وَکھرا نئیں

جیہڑے سَروئے تے رہنا میں سکّیا، اُسّی سروئے تے آلھڑاں تیرا وی اے
کسے ہکی دا باغ نویکلا نئیں ایہہ تیرا وی اے تے ایہہ میرا وی اے

توں سمجھ ماہیہ آپڑاں یار سکّی، تداں میں دلدار تے سنگ سمجھاں
میری پُھکھ توں آپڑیں پُھکھ سمجھیں تیرا ننگ میں آپڑاں ننگ سمجھاں (۳)

اتحادِ قومی کا یہ اظہار ہندکو شاعری کا وہ رنگ ہے جو حالؔی و اقبالؔ کے ذریعے ہم تک پہنچا۔ پرواز تربیلوی نے اکابرینِ قوم، صوفیائے اسلام اور مذہبی رہنماؤں کی عظمت، رفعت اور خدمت کا بیان بھی ایسی ہی معنویت اور سلاست و سادگی کے ساتھ کیا ہے۔ پرواز تربیلوی کی غزل بھی حالؔی کی بنائی ہوئی فضا میں پورے تغزل کے ساتھ اپنی سادگی میں اثر اور جوش پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔

مُہوں بے ترس حیاتی میری چھک کے جس کڈھی روح
حیرانی نال تکدی رہ گئی موت سرہانڑیں کھلی کھلی
گوڑے دے پلیاں وچ یارو، سچ کدے وی چھپیا نئیں
کلی کلی اے پہانویں رہوے کنڈیاں دے سنگ رَلی رَلی (۴)

مسائلِ حیات کا یہ ستھرا نکھرا بیان جو آج کی ہندکو کا مان اور جان ہے حالیؔ مرحوم کے عطا کردہ فکر کا مظہر ہے۔ پروفیسر جعفر سید انگریزی کے استاد ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ’اوپرے گوشے“ فکر انگیز خیالات اور دلآویز اسلوب بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو دیس پر مکرر چھا جانے والے جبر اور آمریت کے اندھیروں کا پُراثر اور رمزیت سے مملو اظہار:

چھاڑی چھت فر تھم کے کرنے
پیار نہ رَہیا، غم کے کرنے
قیدی کیتی، سوچاں کھس کہن
پنجرے اندر، تھم کے کرنے (۵)

اقبال نے بارگاہِ ربانی میں اپنی کم مائیگی کا اظہار جس دعائیہ انداز میں کیا: ع

یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

اپنی اسی بے مائیگی کو جعفر سید نے یہ حمدیہ پیرایہ بخشا ہے:

تُوں ازل ابد تے پھیلے دا
میں قیدی جائی تے وَیلے دا (۶)

نعتِ رسولؐ کا یہ رنگ آہنگ، اویسی خیال اور بلالی اذان کا سنگ سنگ رہنا، جعفر سید کی پہچان ہے:

ایہہ عشقِ نبیؐ دا جذبہ اے، ایہہ حُب نبیؐ دا صدقہ اے
تدبیر خیال اویسؓ اے، تکبیر اذان بلالؓ اے
وَالّیل حوالہ زلفاں دا، والشمس نُہار جمالی اے
اُس رُوپ دا میں کے ذکر کراں ہر نقش کمال مثالی اے (۷)

ذرا حبِ وطن ملاحظہ ہو:

ایہہ دھرتی پاکستان دی اے
رکھوالی دین ایمان دی اے
تاریخ گواہ جہان دی اے
ہک نعمت رب رحمان دی اے (۸)

دین ایمان کی رکھوالی نے وطن پر دل و جان قربان کرنا سکھایا۔ اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں

یہ انگریزی پڑھنے والا جانتا ہے مگر کئی شریعت مدار اس حقیقت کی طرف سے غافل ہیں۔ محترمہ عصمت آرا گُل جہاں پاکستان اور بانیانِ پاکستان کے نام پر قربان ہوتی ہیں وہاں ہزارہ پھلاں دا کھارہ کو بھی محبوب رکھتی ہیں۔

سونہڑیں تھرتی دی ایہہ شان
دیکھو جنگل تے میدان
چنگے لگڑ زمی اَسمان
اُچی وطن مرے دی شان
سونہڑاں دیس مرا اے ہزارہ
مرا دیس پھلاں دا کھارہ (۹)

پروفیسر محمد فرید، طبیعات کے استاد ہیں۔ تصوف کے اَن دیکھے رنگوں میں فکر گھولتے اور موتی رولتے ہیں مگر یہ خیال یا غم بھی دامن گیر رکھتے ہیں۔

لوکاں پُجن تے تارے گاہے
ساڈیاں رہیاں چھڑیاں سوچاں (۱۰)

جیسے عرض کیا گیا محمد فرید کا اصل میدان متصوفانہ فکر ہے اور یہاں بھی اُن کا چلن اگلے پچھلے صوفیانہ ہندکو شاعروں سے بالکل الگ اور منفرد ہے۔ ان کی ایک نظم "بیت الحروف" کا بنیادی بند، ہندکو شاعری کے اوفق کا بھرپور منظر نامہ ہے:

الف لکھا ب بی لکھی پ تے گئے آں بدھے
ت تے ث آں دل نِچ رخ کے باقی حرف سدّے
م آں لکھ لکھ واری پچھاں تاں گُجھ حرے اُگھے
یار فریدا 'ہُو' بی تھاسی، ی تے پہنچیں کدے (۱۱)

آصف ثاقب، استادِ نباتات کی حیثیت میں جس عزت اور شہرت کے مالک رہے ہیں اُس سے بڑھ کر شعروسخن کی پرورش اور شاعروں کی تربیت میں پروفیسر صوفی عبدالرشید کی طرح ناموری کمائی۔ نظم اور غزل، اردو ہندکو دونوں زبانوں میں انفرادیت کی حامل ہے۔ اُن کا شعری مجموعہ 'اُدھلے خواب خیالاں' نظم کی مختلف ہیئتوں کے تجربے اور لوک گیتوں کو حسنِ جدید بخشنے میں آخری حدوں تک نکل گیا ہے۔ ہندکو شاعری کی یہ رنگارنگی اور بلند آہنگی، حالؔی کی ترقی پسند کوششوں کی عطا ہے۔ ان کی شاعری میں اُن کی ذات اور کائنات

ہم آمیز ہو جاتے ہیں۔ نظم ”سچی گل اے“ میں کس سادگی کے ساتھ جذبوں کو بیدار کرتے ہیں:

جو کُجھ منگو دل نال منگو
لفظ دُعا بی دل دے اندرو
پیار خلوص دے اتھرو سارے
موتی موتی چھڑوا رہسی
سُنڑنے والا سنڑ دا رہسی (۱۲)

ثاقب کی سوچ اس کے لفظوں کے پیراہن، رنگ، بُنت، سب اُس کے اپنے ہیں۔ ان کی نظم اور غزل، تازہ کاری کے عمدہ نمونے، نایاب اور بازیافت کی مثال نظم ”ساڑ جگر دی“ کو ہو بہو نقل کرنے کو جی چاہتا ہے مگر مجلّہ ادبیات کی تنگ دامانی روکتی ہے۔ آخری بند ملاحظہ ہو۔

ہاسے مُکّے اُتھرو سُکّے ہوٹھاں اُتے لالی
سارے کہر کوئی نہ وردی
لفظاں بیچ ہے ساڑ جگر دی
کالے لیکھر، مقدر اُلجھے
چِٹا مَتھا جانڑیں
کے لکھیا تے کے بجھایا
کالا تختہ جانڑیں (۱۳)

غزل کی چھب اور ڈھب دیکھنے دکھانے کو دو شعر ہی کافی ہیں:

لو نیندر وَیندا اُتھرو کوئی
رات انھیری، جگنو کوئی!
تیرے در تے اَنڑ کھلوتا
ڈارو گُمیا، آہو کوئی (۱۴)

افتخار ظفر جدون اردو ہندکو دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور خوب کہتے ہیں مگر انھوں نے ابھی غزل سے باہر کھلے میدانوں کا رُخ نہیں کیا۔ تاہم اس تنگنائی میں بھی وہ عہدِ جدید کی تازہ گوئی سے محروم نہیں ہیں۔ ان کی غزل بھی خیال عشق اور عاشق کی باتوں گھاتوں سے نکل کر زمین کے زندہ مسائل کے ادراک کا ثبوت

دیتی ہے اور عصرِ موجود کے دکھوں سے واقف ہے۔

سینہ تاڑ کے شملے بنھ کے جیہڑے ٹردے ویکھے
جدوں زور جوانی ٹرٹیا اُساں رُلدے ویکھے
پھل لگڑاں دی آس تے کیتی جد بوٹیاں دی راکھی
تتیاں چھنگاں چھلیاں تے فر بور وی سُکدے ویکھے (۱۵)

پروفیسر یحییٰ خالد ریاضی کے استاد ہیں مگر روزنامہ شمال میں ہندکو صفحہ کی ترتیب و تدوین کے علاوہ ہندکو بولی کی دیکھ بھال اور اشاعت و طباعت کی ساری ریاضتیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہزارے وال انھیں بابائے ہندکو کہتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے۔ ہندکو ادبی سنگت کے انتظام و انصرام میں چھپنے والی ہندکو نظم و نثر کی درجن بھر کتابیں اُن کی محنتوں ہی سے ظہور میں آئیں اور ہندکو کی پہچان ہوئیں۔ سیرتِ رسولؐ، پیار پہلیکھے اور دو افسانوں کے مجموعے مرتب کر چکے ہیں۔ ''''پیار پہلیکھے'' سے نمونۂ کلام:

یاداں دے جنگل وچ پھرناں
جنجو آہیا راہ ٹٹولے
دل دی بستی دا کے پچھنائیں
ڈہہ گئی اَن چھتاں رہ گئے کھولے (۱۶)

یحییٰ خالد کی ہندکو شاعری ہماری ثقافت اور تہذیبی حُسن کے عالم گیر اجالے بکھیرنے والی شاعری ہے۔ خالد اپنے بچپن اور جوانی، شہر گاؤں کی ہر کہانی شعری زبانی بیان کرتا ہے اور بھولی بسری یادوں کے خاکے تازہ کرتا اور اُن میں نئے پرانے رنگ اس طرح بھرتا ہے گویا کل کی بات ہے۔ غزل سے ہٹ کر اُن کی منظومات عجیب دھنک رنگ رکھتی ہیں۔ آس، آوارہ خیال، چھیکو چھائی، یاداں دی لُو ہری، پَیکا، خانہ بدوش اور ہتھاں دیاں ڈِتیاں، ہر نظم خالد کی شاعرانہ مصوّرای کا شاہکار ہے۔ خالد کے ان رنگوں میں انتخاب بڑی مشکل راہ ہے۔ بہرحال محولہ آخری نظم کا ایک بند:

آئیاں بہاراں کِھلی پھُل کیلی
اُٹھدی جوانی ٹہوڑے پئی بیلی
سنگ اُسان مِلیا
بیڑے پھُل کھلیا (۱۷)

لے کی یکسانی، لفظوں کی روانی، خیال کی ادائی، پڑھنے والے کو اُس ’’پھل‘‘ کی جستجو کشاں کشاں لیے جاتی ہے۔ خالد کی نظموں میں یہی افسانوی کیفیت بھری ہے۔ نظم ’وطن دے ناں‘ کے ہر شعر میں ’حبِ وطن‘ کی ایسی عکاسی کی ہے کہ روح رقص کرنے لگتی ہے:

جِسدے بیہڑے نچّن گاون ٹھنڈیاں شوخ ہواواں
اُس تھرتی دی مٹی چُم چُم میں اکھیاں نل لاواں
ہِک دی جھولی میں اَکھ کھولی، ہِک دا کھادا پیتا
سدا سلامت رہون، مولا! میریاں دوئے ماواں
تیرے نال آزادی میری، میریاں شوقاں سدھراں
تو سَت رنگی پینگ بڈھی دی، میں تیرا پرچھاواں (۱۸)

ٹھنڈیاں ہواواں، نقصان بھی دے سکتی ہیں اس کے ساتھ ’شوخ‘ لگا کر جو معنویت دی ہے اس کا اندازہ ہر سخن ور لگا سکتا ہے۔

کرنل فضل اکبر کمال، پُرگو شاعر تھے۔ مسلسل شعر کہتے رہنا نظمیں لکھنا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کی زندگی ان کی ہندکو شاعری کا موضوع بنی۔ ’ٹہل سیوا‘ اُن کی زندگی کی آخری تصنیف ثابت ہوئی۔ بچپن سے جوانی تک ملازمت، شادی، اولاد، احباب اور مجلسوں محفلوں کی رودادیں، یادداشتیں ’ٹہل سیوا‘ میں بند ہیں۔ یہ جدت، بھی حالی کے تصورِ فن، سادگی اور اصلیت کی جھلک ہے۔ جسے پڑھنے والا اپنی کہانی سمجھنے لگتا ہے۔ نظم ’’شوفقا دا مُل گئی نہ‘‘

جیہو جَیب موبائل بَجدے
گُڑی تنڈے گلاں کولوں نیہو رجدے
مولوی منبرا اُتے گجدے
کہ شوفقا دا مُل گئی نہ (۱۹)

’’ماواں ٹھنڈیاں چھاواں‘‘ کا ایک بند، کیا یہ آپ بیتی، جگ بیتی بھی نہیں ہے؟

روندے چینکدے ضِدّاں کردے
دُھد پی پیندے چک پی پھردے
جھولی ٹہونڈدے جدوں پی ڈردے
ماجی، ماجی، شور مچاواں
لوکو! ماواں ٹھنڈیاں چھاواں (۲۰)

یہ پورا مجموعہ ایسی آپ بیتی ہے جسے پڑھنے والا تھکتا نہیں۔

مرحوم قتیل شفائی، اردو کے ایسے مایہ ناز شاعر ہیں جن کی شاعری ترنم کی معجزہ کاری کا شاہکار ہے۔

''ماہیا'' ہندکو کی قدیمی صنفِ سخن ہے لیکن جدید شعری ڈھانچوں نے اس میں بھی تصرفات دکھائے ہیں۔

قتیل صاحب نے خاکِ پاک ہزارہ کے بیٹے ہونے کے ناتے ''ماہیا'' بھی کہا۔

پُھکھے دوہاں جہاناں دے
اَسی ہزارے آں، ملکاں تے خاناں دے
ساڈے وطنے دے راکھے
اُساں لانڑ جھکڑیاں، جیہڑا چورے آں چور آکھے
ساڈی حالت تے ویکھ آکے
ٹکڑا کھاندے آں، پتھڑیں نال لا لا کے (۲۱)

دوہے، ڈوہڑے، کافی، حرفی، گیت کہنے والے شاعرانِ ہزارہ کی تعداد سینکڑوں میں ہے لیکن ہماری توجہ کا مرکز وہ شاعری ہے جو خواجہ الطاف حسین حالی کی انجمن پنجاب کی پیروی میں ہوئی۔

اسماعیل مجبور، نواں شہر ایبٹ آباد میں شاعروں کی تربیت اور فکری تعلیم کے علاوہ درس وتدریس میں مہارت رکھنے والا نام ہے۔ اردو، ہندکو اور گوجری زبان میں شعر کہا اور عام کیے۔ اُن کی ایک نظم ''یارو سچ ننگی تلوار' اُن کے فکری ماحول کی بھرپور عکاسی ہے۔

عیش کردے سب امیر
جِندے ٹُکے کھاندے کھیر
دین اُن دی اے جاگیر
اتھے ہور کِہڑا حق دار
یارو! سچ ننگی تلوار (۲۲)

بشیر احمد سوز ہزارہ کے علمی ادبی سرمائے کی جمع آوری کے ساتھ ساتھ دبنگ اردو شاعر اور ہندکو زبان وادب کے رکھوالے ہیں۔ انھیں اُن کی ان خدمات کے عوض ملازمت کی تکمیل کے بعد شعبہ اردو کے ذیلی ادارے ہزارہ چیئر کی نظامت سونپی گئی۔ ہزارہ یونیورسٹی میں انھوں نے ہزارہ کے علم وادب کی بھرپور جمع آوری کی اور درجن بھر کتابیں مرتب ومدون کر کے شائع کروائیں۔ اُن کی ہندکو نظم ''جوانی دی اُگ'' اُن جدید

رجحانات کی عکاس ہے جو ہمارا موضوع ہے

کھل مُکھلی سادی چھلی ڈوگی ڈوگی دھوڑے
سر توں پچی اُڈدی جُلے، پَیراں چُبھن روڑے
پُہر جوانی لش لش کردی، چھلکے سارا پنڈا
اکھیاں پُہر پُہر ویکھے اُساں خاناں دا ہِک بنڈا

ربا توں ای اس دا راکھا، ایہہ کمیاں دی تہی اے
مولا! اس دی عزت رکھیں، ایہہ تے ہِک ای جی اے
بکری اُس دی نہا کے چڑھ گئی، ہتھ آئی بکروٹی
بچ نماشاں ہوئیاں اَج تے، قسمت اُس دی کھوٹی (۴۲)

نظم کا آخری مصرعہ کس ایمائیت کے ساتھ ہونے والی بپتا کا بیان کرتا ہے۔ بیس تیس برس میں جدید ہندکو شاعری کا تحریر میں آنا اور لٹریری زبان بننا کتنی جلدی اُس مقام کو قریب لے آیا ہے جو دوسری زبانیں کئی برسوں میں نہ پا سکیں۔

راقم الحروف ارشاد شاکر اعوان ستائیس کے قریب تحقیقی علمی کتابوں کا مصنف ہے۔ دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ چھ زیرِ ترتیب ہیں۔ ایک ہندکو شعری مجموعہ "سیک" (غزل، حمد و نعت، سلام) زیرِ ترتیب ہے۔ ایک ہندکو نظم جدید مطبوعہ دکھ سُجھیالے، باشتراک حاضر ہے۔

خوش تصویراں

مڑے رستے
سبزیاں دے پتیاں بچ لُکھدے
ساگ، اُنھاں بچ چُنڑ دیاں گُوریاں
رنگ برنگے چیڑے جُھلے
اُٹھن بیٹھن
جدراں شاخ گلاب دی جُھکے

اُڈدیاں چڑیاں پھیرے پاون
دَمراں پڑھ پڑھ آیت کرسی
چار چوفیری گھیرے پاون

خَلق دیاں ایہہ خوش تصویراں
ہر آفت تو دُورئی رہون
پکے رہون پاک اِنھاں دے
پہاویں لکھ مجبورئی رہون (۲۳)

’’سقوطِ ڈھاکہ‘‘، ’’حیاتی دنیا دی‘‘ اور ملی نغمات بھی حوالے کی نظمیں ہیں۔

جناب واحد سراج نے ہزارہ بھر میں علمی ادبی مجالس بہ پا کرنے میں نام پیدا کیا ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں اور اپنی ایک منفرد سوچ اور لہجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی نظم ’’مٹی دا قرض‘‘ خاصے کی شے ہے:

میری مٹی میرے پاک وطن دی مٹی
تیری تے گَل ہور ای گُجھ اے
تیری تہپ ہے پَنڑ دی چادر
تیری چھاں اے ماں دی جھولی
رُوح میری نچھڑیں لگدی اے
سُنھڑ کے تیرے پیار دی بولی
میری مٹی! میریاں سَڑدیاں بَلدیاں اکھیاں
سُکھ دی نیندر کونڑ سُلاسی
جیہڑے میرے سر تے چاہڑے اُن
اُتنے قرضے کونڑ مُکاسی (۲۴)

احمد حسین مجاہد شعر و ادب کا جتنا ستھرا ذوق رکھتے ہیں شاید و باید۔ اردو شاعری کے تین مجموعے اہلِ نقد و نظر سے تحسین پا چکے ہیں۔ بشیر سوز صاحب نے ان کی ایک نظم ’’پنڈ ڈُکھاں دی‘‘ کا اپنی تاریخ کے لیے انتخاب کیا ہے وہی پیشِ خدمت ہے:

اندروں دیمک باہروں آری
یاراں نال بی تھوکھا
فِر بھی قدم نہ اُٹھدے کِدہرے
فِر بی منہ آں تاوکا
سُنڑ مستانیا لوکا!
جائی والے بی ہرجائی
رشتے بی ہِک تھوکھا
اپڑیں بانھہ بی ہتھ ڈس چھوڑ دی
وِیلا ڈاھڈا اوکھا
سُنڑ مستانیا لوکا!
سُنڑ مستانیا لوکا! (۴۵)

شاعری کی اس روداد میں کئی نام اور بھی آنے کا حق رکھتے ہیں لیکن موضوع کے حوالے سے وہ اس محفل میں بار نہ پا سکے۔ یہ میری مجبوری ہے۔ اب بارے کچھ نثر کا بیاں ہو جائے۔

ہندکو زبان جو چاربیتہ، حرفی اور کافی تک محدود تھی پچھلے دس بیس سالوں میں قطعہ، آزاد نظم، رباعی، غزل، تر کے، چوبولے تک پہنچ گئی۔ مرثیہ اور قصیدہ بھی عام ہوا لیکن ہندکو نثر میں بھی آغاز وارتقا بڑی تیزی کے ساتھ ہوا۔ ہزارہ میں نشیمن ہفت روزہ، جمہور ہفت روزہ، قرطاس ہفت روزہ، جنوب ہفت روزہ،، روزنامہ شمال، روزنامہ آج، گورنمنٹ کالجز کے علمی مجلوں، کاغان، گہسار، قراقرم، برگ وبار، سربن نے ایک معقول حصہ، ہندکو زبان کے لیے مختص کیا۔ اس طرح ان صفحات میں چھپنے والے مضامین، لوک کہانیاں، افسانے، ڈرامے، مزاحیہ مضامین، تاریخی واقعات اوران پر تنقیدی تحریریں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہی نہیں یحیٰی خالد کی کتاب ''گلیاں تے دریڑے''، ڈاکٹر عبدالرشید کی سیرت رسول پر ''الہادی''، پروفیسر سید شجاعت علی گیلانی کی ''ہیں تو مسلماں''، ''ہندکو زبان وادب کی تاریخ'' پروفیسر ڈاکٹر ممتاز منگلوری اور ہزارہ میں ہندکو زبان و ادب کی تاریخ پروفیسر بشیر احمد سوز۔ سلطان سکون نے ہندکو لغت اور بجھارتیں جمع کر کے ہندکو زبان کے دامن کو وسعت دی۔ علاوہ ازیں یحیٰی خالد کی کتاب ''چوڑویں افسانے'' راقم الحروف کا ''قصہ گل بصوبر چہ کرد'' کا ہندکو ترجمہ اور کئی دوسری کتابیں جو ہزارہ بھر کے لکھاری مرتب کر رہے ہیں، اتنا بڑی نثری کام ہے جو الگ

مقالے کا تقاضا کرتا ہے۔ زندگی نے وفا کی تو وہ پھر کبھی۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ تاریخ نظم ونثر اردو، ص ۱۴۴، آغا محمد باقر، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۰
۲۔ مسدس حالی، ص ۵۸، ۶۰، ۶۱، مرتبہ مع فرہنگ، مولوی محمد عبداللہ، حاجی فرمان علی، لاہور، ۱۳۰۳ھ
۳۔ پھُل تے کنڈے، ص ۳۹، ہزار تربیلوی، ہندکو ادبی جرگہ، ایبٹ آباد، ۱۹۸۴ء
۴۔ ایضاً، ص ۲۲
۵۔ اوپرے گوشے، ص ۱۰۸، جعفر سید، ہندکو ادبی سنگت، ایبٹ آباد، ۱۹۹۸
۶۔ اوپرے گوشے، ص ۱۶، جعفر سید
۷۔ ایضاً، ص ۱۸
۸۔ ایضاً، ص ۷۸
۹۔ حال دلاں دے، ص ۵۸، عصمت آرا گُل، عثمانیہ ہائی سکول، ایبٹ آباد، ۱۹۹۹ء
۱۰۔ سنجھ سویل، محمد فرید، ص ۷۱، ہندکو ادبی سنگت، ۱۹۸۷ء
۱۱۔ پچھے نقطے، ص ۳۱، ہندکو ادبی سنگت، ۱۹۹۶ء
۱۲۔ اَوھلے خواب خیالاں، ص ۲۷، آصف ثاقب، ہندکو ادبی سنگت، ۱۹۸۵ء
۱۳۔ ایضاً، ص ۴۸، ہندکو ادبی سنگت،
۱۴۔ ڈُکھ سنبھیالے، ص ۵۰، مرتبہ: آصف ثاقب/یحیٰی خالد، ہندکو ادبی سنگت، ۱۹۸۳ء
۱۵۔ پیار پھلیکھے، یحیٰی خالد، ص ۵۹، ہندکو ادبی سنگت، ۱۹۸۶ء
۱۶۔ ایضاً، ص ۵۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۹
۱۸۔ ٹہل سیوا، فضل اکبر کمال، ص ۱۳، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۴۹
۲۰۔ ہزارہ میں ہندکو زبان وادب کی تاریخ، پروفیسر بشیر احمد سوز، ادبیات ہزارہ، ۲۰۰۹ء
۲۱۔ ایضاً، ص ۳۴۹
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۶۷
۲۳۔ ڈُکھ سنجھیالے، ص ۳۲، ہندکو ادبی سنگت، ۱۹۹۸ء
۲۴۔ ہزارہ میں ہندکو زبان وادب کی تاریخ، ص ۳۷۳
۲۵۔ ایضاً، ص ۳۷۲

☆☆☆☆

نور خان محمد حسنی

الطاف حسین حالی کے براہوی ادب پر اثرات

براہوئی زبان نے اپنے ابتدائی سفر میں جن موضوعات کو اپنایا ان میں زمین سے محبت، اپنے اردگرد موجود فطرت کے رنگوں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات اور اثرات کی پذیرائی شامل ہے۔ بنیادی طور پر ہماری زبان میں مذہبی اور عقیدت کے پہلوؤں سے پنپنے والے احساسات و جذبات صدیوں سے ہماری ثقافت اور تہذیبی روایت کا حصہ رہے ہیں۔ جدید نظم اور عقیدت کے کلام کے حوالے سے جہاں دیگر صوفیاء، مشاہیر اور شعراء نے براہوئی شاعری پر اپنے اثرات مرتب کیے ان میں الطاف حسین حالؔی ایک معتبر حوالہ قرار پاتے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ادبی اصناف خصوصاً شعری اصناف میں بدلتے رجحانات نے مختلف اصناف کی ہیئت کو ہی بدل ڈالا۔ جیسے کسی بوسیدہ، پھیکے رنگوں والی تصویر میں اچانک کچھ رنگوں کو تازہ رنگوں سے نمایاں کیا جائے تو تصویر کچھ اور ہی داستان بیان کرنے لگتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے ہم خشک زرد پتوں کو دیکھیں اور یک لخت وہ تمام پتے ہرے ہو کر خزاں سے بہار کا منظر پیش کرنے لگ جائیں۔ ایسے ہی ادب کے میدان میں سوکھے زرد پتوں جیسی روایات کو بدلنے میں مثبت کردار الطاف حسین حالؔی نے سرانجام دیا۔ حالؔی نے یہ محسوس کیا کہ ادب کی زندگی پر جو مردنی چھائی ہوئی ہے۔ جس میں زندگی کی حقیقت شامل نہیں اور وہ محض گل و گلزار۔ لب و رخسار تک محدود ہے اسے زندگی کے حقائق اور بنیادی مسائل سے ملایا جائے اور حالؔی کے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے کہ شاعری کے ذریعے جذبات میں ہیجان پیدا کیا جائے لیکن یہ جذبات منفی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ مثبت طریقے سے اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کریں۔

حالؔی شاعری کو معاشرے کا آئینہ دار کہتا ہے۔ شاعری کسی بھی ملک یا خطے میں کسی بھی زبان میں کی جائے وہ وہاں کے لوگوں کے رہن سہن ...... رسم و رواج ...... سوچ و فکر ...... مزاج و کردار کو ضرور بیان کرتی ہے۔ شاعری کے حواس پر معاشرہ چھایا رہتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پہلو سے شاعری کے تذکرے میں معاشرے کا نام ضرور آجاتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شاعری پورے معاشرے پر چھا جاتی ہے۔ اور معاشرے

کے مزاج میں تبدیلی کا مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ حالی کا ایک شعر ہے:

افسانہ تیرا رنگیں، روداد تیری دلکش
شعر و سخن کو تُو نے جادو بنا کے چھوڑا

شاعری اور خصوصاً نظم میں جدیدیت کا رنگ بھرنے والوں میں اولین معماروں میں نمایاں نام حالؔی کا ہے۔ حالؔی نے نظم کو نئے رنگ و آہنگ کا لباس اوڑھا کر اسکے نکھار میں مزید اضافہ کیا۔ اور خصوصاً موضوعات میں تنوع پیدا کر کے اس کو آفاقی موضوعات کے قابل بنایا اور اس تنوع کے باعث نہ صرف نظم بلکہ غزل کا دامن بھی وسیع ہوا۔

نظم ادب کے دریا کے محدود دائرے میں پھرنے والا ایک بھنور تھا۔ جس کو حالؔی نے سمندر اور اس کی پر جوش لہروں سے آشنا کر کے اس کی دنیا میں وسعت پیدا کی۔ وسعت اصل میں وسعت نظر، وسعت سوچ اور وسعت قلب کی بدولت آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم کے بقول:

> ”اردو ادب کی تاریخ میں حالی ایک غزل گو شاعر، جدید نظم کے بانی، جدید اردو تنقید کے پیشوا اور جدید سوانح نگاروں کے اولین معمار سمجھے جاتے ہیں۔ تحریک سرسید سے متاثر ہو کر انہوں نے زندگی کی نئی ضرورتوں پر زور دیا ہے اور مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی انحطاط نے انہیں اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر اختیار کرنے پر مائل کیا اور پامال موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کی بجائے انہوں نے غزل گوئی میں نئی روایات کی بنیاد ڈالی۔ وہ قدیم سرمایہ شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے اس رنگ پر اعتراضات بھی کیے اور اس کی اصلاح کی کوشش بھی۔ پھر بھی غزل کی روایت کو خود سے الگ نہ کر سکے“

حالی نے مسدس حالؔی لکھی تو اپنے ایک الگ اور منفرد انداز کی واضح جھلک اس میں دکھائی۔ مسدس حالؔی میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کی وجوہات کے علاوہ عالم انسانی کے مسائل کو بھی انتہائی واضح پیش کیا۔ حالؔی کی شاعری میں فنکارانہ چابک دستی اور فنی پختگی نظر آتی ہے لیکن یہ پختگی شعوری نہیں بلکہ اس میں ایک فطری مناسبت بھی نظر آتی ہے۔ جو کہ تاثیر سے بھرپور ہے۔ اور اس میں سادگی کا عنصر غالب ہے۔ نئے نئے مضامین باندھنے، اپنے اسلوب اور اظہار بیان میں جدت پیدا کرنا حالؔی کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔

حالؔی کے ذہن کی تبدیلی کا اصل محرک لاہور تھا۔ جہاں حالؔی ایک طرف تو ادبی مجالس میں شرکت

کرتے اور کروٹ لیتی دنیا کا اک رنگ انہیں وہاں مل جاتا۔ تو دوسری طرف سرسید کے ساتھ نشست میں ان کے جدید خیالات سے نہ صرف مستفید ہوتے بلکہ ان کی تخلیقات بھی اس جدت سے رنگین ہونے لگیں کیونکہ سرسید نے قوم اور بالخصوص قوم کے نوجوانوں کے ذوق عمل میں نئی روح پھونکنا اور ان کے جذبات کو عصر حاضر کے حالات کے مطابق ڈھالنے کی تحریک شروع کی۔ تو حالؔی بھی اس میں پیش پیش تھے۔

کئی نقادوں نے حالؔی کی شاعری کو ناصحانہ شاعری قرار دیا۔ اور اصلاحی شاعری کے رنگ کو پھیکا اور بیان میں دلکشی کی کمی کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلندی اور پرواز کو بھی سطحی قرار دیا اور اک محدود رجحان کا حامل قرار دیا۔ حالانکہ یہ محدود رجحان نہیں ہے۔ حالؔی کی شاعری کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو محض اصلاحی رنگ میں رنگی شاعری نظر نہیں آتی بلکہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر حالؔی کی فکر اور سوچ کے مختلف زاویے نظر آتے ہیں۔ حالؔی کی انفرادی سوچ نے ان کو باقی شعراء سے منفرد مقام دیا۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ

ان کی یہ شاعری نئی اور اجنبی راہوں اور نئی سوچ کی مرہون منت ہے۔ اور اس جدت پسندی کا رجحان اسے عروج پر لے گیا۔ جو کہ وسعت کا باعث بنا۔ حالی نے حقیقت و رجائیت کے ساتھ ساتھ فرحت و انبساط کے آئینے کی چکا چوند اور جگمگاہٹ سے ادب کا آکاش چمکا دیا۔

ہوگئے ہم ہی کچھ اور آج کل
یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل
اب سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں
ورنہ گر گر کے گئے لاکھوں سنبھل
کب تک آخر ٹھہر سکتا ہے وہ گھر
آگیا بنیاد میں جس کی خلل

حالؔی کی بے ساختگی اور سادگی ان کا ہنر کہلایا، انتہائی سہل زبان استعمال کرتے تھے۔ ان کی شاعری بھاری بھرکم صنائع و بدائع کے لوازم سے بھری ہوئی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اپنا وقت شعر کی لفظی آرائش و زیبائش پر خرچ کرتے تھے۔ انتہائی سہل زبان جس میں اک طرح کی فصاحت اور اصلاح کا پہلو نظر آتا تھا۔ وہ ان کے کلام کا خاصا تھا۔ بلاشبہ اک روشن زاویہ حالؔی کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

اس سے اتفاق کیا جائے گا کہ حالؔی کی شاعری میں اور ان کی نثر دیکھی جائے تو دونوں کے اسلوب میں حالؔی کی فطری انکساری و سادگی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ قلوب مردہ کو زندہ کرنے کا جو عہد خود سے کیا اس سعی کی کوششیں آخری دم تک کرتے رہے۔

جس زمانے میں مولانا الطاف حسین حالی نے ’مقدمہء شعر و شاعری‘‘ ضبط تحریر میں لانے کی سعی کی تھی اس وقت کے بارے میں کوئی تحریری مواد یا شاعری موجود نہیں کہ جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ اس دور میں بلوچستان کے خطے میں اردو شاعری کو پڑھنے اور اس سے متاثر ہونے والے کون سے شعراء کرام تھے۔ ان کی تعداد کتنی تھی یا وہ کس زبان میں شاعری کر رہے تھے...... البتہ یہ وہ دور ہے یا اس سے ذرا پیشتر کا دور...... جس میں ملا محمد حسن خارانی نے اردو شاعری میں طبع آزمائی کی ...... مولانا الطاف حسین حالی کی رحلت سن 1914ء میں ہوئی جبکہ ہمارے قومی و انقلابی شاعر گل خان نصیر 1914ء میں پیدا ہوئے۔ 1935ء کے کوئٹہ کے زلزلے میں اس جہان فانی سے کوچ کر جانے والوں میں بلوچستان کے نامور قوم پرست سپوت اور شاعر یوسف عزیز مگسی بھی شامل تھے۔ جن کے بارے میں مولانا ظفر علی خان نے کہا تھا۔

لفظ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 20ویں صدی کے پہلے پچاس سال میں بلوچستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ جس نے بلوچستان سے باہر تعلیم حاصل کی تھی۔ اور وہ اردو شاعری اور اس کے اساس سے واقف تھے۔ وہ غالبؔ، میرؔ اور سوداؔ کو پڑھ چکے تھے ...... علامہ اقبال کی شاعری سے متاثر تھے۔ وہ مولانا الطاف حسین حالؔی کی شاعری اور اس کے تحریر کردہ مضامین سے آگاہی رکھتے تھے۔

براہوئی تحریری ادب کا ابتدائی دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب ایک دینی مدرسہ ’’مکتبہ درخانی‘‘ کے علماء نے انگریزی عیسائی مشینری کی جانب سے مقامی لوگوں کو عیسائیت کی جانب راغب کرنے سے روکنے کے لیے اس مدرسے کے زیر اہتمام براہوئی اور بلوچی زبانوں میں تصانیف کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ان علماء میں مولانا عبدالمجید جتوئی، مولانا محمد فاضل درخانی، محمد عمر دین پوری، ملا نبو جان اور دیگر شامل تھے۔ جنہوں نے لوگوں کو اخلاقی درس دینے کے لیے دینی احکامات، اخلاقیات سے متعلق کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ انہوں نے شاعری کی اور اس کے علاوہ قرآن مجید کا براہوئی میں ترجمہ کیا۔

اس دور میں اردو سے زیادہ فارسی اور عربی میں تعلیم کا رواج تھا۔ اس لیے جدید ادب ، شاعری یا

غزل پر فارسی کے اثرات نظر آتے ہیں اور پھر اردو بھی فارسی سے متاثر ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں لگتا ہے کہ مقامی زبانوں کا ادب اردو سے متاثر ہے۔

جدید نظم میں دنیا کے ہر موضوع کو پرونے کی اجازت اور سہولت موجود ہے۔ اس لیے ان موضوعات میں مذہبی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ براہوئی اور بلوچی کے شعراء نے بھی جدید نظم اور غزل کے ان ثمرات سے استفادہ کیا ہے۔ غزل نے زلفِ یار کی پابندی سے نکل کر ایک نئی جہت پائی ہے۔ اس لیے پاکستان کی تمام زبانوں میں اس آزادیٔ اظہار سے خوب خوب فائدہ اٹھایا گیا۔

براہوئی ادب میں غزل کی ابتداء مکتبہ درخانی کے علماء کی مرہونِ منت ہے۔ مولوی عبدالمجید چتوئی نے غزل کی ابتدائی تشکیل کی۔ ان کی غزل میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ آہ و زاری عشق سے نامرادی، محبوب سے گلہ شکوہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ چتوئی کے غزل میں عشقِ حقیقی بھی نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ براہوئی غزل کی مزید ترقی میں علامہ محمد عمر دین پوری کا بھی کردار نظر آتا ہے۔

حمد و نعت پند و نصائح اور اعلیٰ انسانی اقدار کا فروغ۔ ایسے موضوعات ہیں۔ جو ہمارے یہاں مذہبی رجحانات کے زیرِ اثر ہماری شاعری کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس کے لیے کسی ایک مکتبِ فکر یا فرد کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چوں کہ براہوئی نے اس حوالے سے ابتداء میں فارسی سے رہنمائی لی ہے۔ اس لیے فارسی ہی کو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہاں جدید شاعری میں کسی حد تک مذہبی رجحانات کے فروغ کا سبب ہے۔

براہوئی ادب میں جدید نظم کو برتنے اور غزل گوئی میں نادر قمبرانی، ببرل زیبرانی، عبدالرحمٰن کرد، پیر محمد زبیرانی، حکیم خدائے رحیم۔ اسحاق سوزؔ، امیر الملک مینگل، جوہر براہوئی، عزیز راہیؔ، عادل قلندرانی، یٰسین بسمل، عبدالرزاق صابرؔ، حسن غمخوارؔ، رحیم ناز، جبار یارؔ، عبدالغفور، احسن خارانی، قیوم بیدارؔ، عارف ضیاء، وحید زہیرؔ، افضل مراد، نور خان محمد حسنی، عالم عجیب، شہزاد غنی، عزیز مینگل، منظور بلوچ، شمس ندیم، حنیف مزاج، قیوم سوسن، عابد سلام، عجب خان سائل، کفایت کردار اور دیگر کئی شعرا شامل ہیں۔

براہوئی ادب کا یہ دور سن 1947ء کے بعد کا ہے۔ جس میں سینئر ادبا اور شعراء کے علاوہ نئے شعرا نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ سید الطاف حسین حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری، جدید نظم کے رجحانات اور عقیدت کے کلام کو رواج دینے میں برصغیر کی تمام زبانوں کو وہ لافانی و لاثانی مواد اور راہیں دی ہیں جن کے اثرات براہوئی زبان میں آج بھی پوری توانائی اور تازگی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

زاہد حسن

الطاف حسین حالی کے پنجابی ادب اثرات

ستارھویں صدی کا نصف آخر اور اٹھارویں صدی پوری کی پوری خطۂ برصغیر کے لیے بے حد اہمیت کی حامل تھی۔ اس عہد میں خطہ پر سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی ہر حوالے سے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ جس کا اظہار ہر مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے اپنے فن میں کیا۔ اردو لکھنے والوں نے بالخصوص سرسید احمد خاں کی تحریک کے زیرِ اثر حالات کی نزاکت کو جلد ہی بھانپ لیا۔ یوں محمد حسین آزاد، شبلی اور الطاف حسین حالی نے فکری حوالے سے نئی تحریکوں کو استوار کیا۔ ان میں سے اردو شاعری خاص طور پر اردو نظم میں الطاف حسین حالی نے جن تجربات کو رواج دیا اُن میں بے حد جان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شعرا نے حالی کے اس تجربے کو قبول کرنے میں کسی قسم کا تذبذب نہیں کیا۔ پھر حالی کی یہ تحریک اردو زبان تک ہی محدود نہیں رہی بل کہ اس کے اثرات پنجابی زبان پر بھی گہرے طور پر مرتب ہوئے۔ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں پہلی وجہ اردو کی پنجابی کے ساتھ قربت تھی۔ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں زیادہ لکھنے والوں کا تعلق پنجاب سے تھا جن میں سے زیادہ تر دونوں زبانوں کو اپنے ذریعۂ اظہار بنائے ہوئے تھے اور یا پھر اردو ہی کو انھوں نے مقدم جانتے ہوئے اپنی مادری زبان سے راہِ فرار اختیار کی۔

اگرچہ متذکرہ بالا فکر سے تعلق رکھنے والے شعرا و ادبا کو ''نیچری'' لوگوں کا خطاب دیا گیا تاہم بعد ازاں الطاف حسین حالی نے مقصدی شاعری کو اپنا ماٹو بنایا اور یہاں کے لوگ جس غلامی کی دلدل میں پھنس چکے تھے ان کو اس سے نکالنے کے لیے ایسی نظموں کو ترویج دینے کے لیے خاطر خواہ اقدامات کیے۔ یہاں تک کہ اسی دوران انھوں نے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' جیسی بلند پایہ کتاب بھی تصنیف کی جس میں شاعری کے لیے ایک نظام استوار کیا اور اعلیٰ اور کم معیار کی حامل شاعری کی بالتفصیل شرع کی۔ بعد ازاں انھوں نے ''مسدسِ حالی''، ''مناجاتِ بیوہ'' اور اس جیسی شاہکار نظمیں تخلیق کیں، جن کا نہ صرف اس عہد کی شعری و فکری تحریکوں پر گہرا اثر مرتب ہوا بل کہ آگے جا کر پنجابی شاعری نے بھی خاطرہ خواہ اثرات حاصل کیے۔ پنجابی کے ایک اہم دانشور، نقاد اور حامی سر شہاب الدین نے ''مسدسِ حالی'' کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا جس نے پنجابی شاعری میں

موضوعاتی اور مقصدی شاعری کو راہ دی اور اس عہد کے اہم اور بڑے لکھنے والوں نے اس سے براہِ راست اثر لیا اور تحریکِ پاکستان سے منسلک شعرا نے اسی سانچے میں نظمیں لکھیں جو حالی نے مرتب کیا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، پیر فضل گجراتی، ڈاکٹر رشید انور، نواز، عشق لہر، اللہ دتہ صابر جیسے شعرائے کرام نے اس رویے اور رجحان کو مثبت طریقے سے پنجابی شاعری کے منظرنامے میں پروان چڑھایا جو تحریکِ پاکستان کی کامیابی کے بعد تشکیلِ پاکستان اور پاکستان کی وحدت کو برقرار رکھنے کے ساتھ یہاں کے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مزاج اور شناختیں رکھنے کے باوجود ایک اجتماعی پاکستانی شناخت کو تشکیل دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ اسی تحریک نے آگے چل کر پاکستان کی نئی نسل کو روشنی کے اس مینارہ تک پہنچنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے اور آج ہم واضح طور پر ایسی شاعری اور نثر کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو پاکستان کو درپیش بحرانوں سے نکلنے اور ایک بلند مقام کے حصول اور ترقی یافتہ قوم کی شکل اختیار کرنے میں اس کی راہنمائی کر رہی ہے اور جس کا ابتدائی زینہ ظاہر ہے اس مقصدی ادب اور شاعری سے جا ملتا ہے جس کا آغاز اردو میں الطاف حسین حالی نے کیا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ الطاف حسین حالی، اپنی ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصہ لاہور میں قیام پذیر رہے۔ لاہور جو ایک طویل عرصے سے پنجابی زبان و ادب کا گہوارہ چلا آ رہا ہے لہٰذا لامحالہ طور پر اُن کا یہاں کے لکھنے والوں سے میل جول اور مکالمہ رہتا ہوگا جس میں یہ بات بھی زیرِ بحث آتی ہوگی کہ ادب، خاص طور پر شاعری کو مقصدی ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں کہ جب ہندوستان میں تخت اور راج مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور زمانے بھر کے رنج و ستم مسلمانوں کے دامن گیر تھے اس عہد میں تو اس طرح کے مقصدی ادب کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسی لہر اور تحریک کے زیرِ اثر بہت سے پنجابی لکھنے والوں نے ایسے موضوعات کی جانب رجوع کیا جو قوم کے اندر شعور کی بیداری، نئے عزم و ولولے اور عملی طور پر مقاصد کے حصول میں کارفرما ہوں۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے دو اور ساتھیوں حکیم موسیٰ امرتسری اور فدا حسین فدا کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ فدا حسین فدا جو ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے ۱۹۳۸ء سے پنجابی ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ کئی ایک رسائل و جرائد میں تخلیقی و تحقیقی نوعیت کے امور سر انجام دیے۔ وہ پنجابی، اردو اور فارسی تینوں زبانیں جانتے تھے اور تینوں میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کرتے تھے۔

اسی طرح ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے یہاں تو اس طرح کے خیالات وافر مقدار میں میسر آتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اُن معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے عملی اور تخلیقی ہر دو حوالوں سے

بیش بہا کام سرانجام دیا۔ وہ ایک تحریکی اور ادَبی آدمی تھے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے طور پر بہت زیادہ کام کیا بلکہ اپنے رسالے اور ادارے کے ذریعے دوسرے پنجابی لکھنے والوں کے کام کو بھی سامنے لائے پھر خود اس قدر تواتر اور بھرپور طریقے سے کام کیا کہ بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر کثیر تعداد میں کام فقیر محمد فقیر نے کیا۔ دراصل ایسے لوگوں کے من میں تبدیلی لانے اور انقلاب برپا کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس عزم کا اظہار اُن کی ایک پنجابی کافی سے ہو رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

جاگ سویرے جاگ مسافر۔ آوَندے جاندے دم دے پھیرے
دیسن تینوں دھک اگیرے۔ دنیا وین کرے پئی تیرے
توں سمجھیں پیا راگ مسافر۔ جاگ سویرے جاگ مسافر

ترجمہ: صبح دم بیدار ہو جا، اے مسافر، زندگی آتے جاتے سانسوں کی کہانی ہے جو تجھے آگے اور آگے لیے چلی جائے گی، دنیا تجھ پر رو رہی ہے، دراصل جسے تُو راگ سمجھ رہا ہے۔ صبح دم بیدار جا، اے مسافر۔

محمد جنید اکرم اپنے ایک مضمون ”فقیرِ کامل“ میں لکھتے ہیں: ”حضرت بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ۵ جون ۱۹۰۰ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور گیارہ ستمبر ۱۹۷۴ء کو گوجرانوالہ ہی میں وفات پائی۔ یہاں کے معروف صوفی بزرگ حضرت مبارک شاہ کے مزار کے احاطے میں سپردِ خاک ہوئے۔ آپ نے عہدِ جوانی میں ہی عشق کے اُس سفر کا آغاز کر دیا تھا جس پر پہنچ کر آپ نے فقیرِ کامل کا مقام پایا۔“ متعلقہ موضوع کے حوالے سے بات کرتے ہوئے آگے جا کر وہ لکھتے ہیں۔ ”انھوں نے اردو زبان کے اساتذہ کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی اور علامہ محمد اقبالؒ جیسے شہرہ آفاق شعرا کی زمینوں میں اپنی زبان میں اپنے فکر و فن کے محلات تعمیر کیے۔ علامہ اقبالؒ کے ہاں خودی کا جو تصور دیا گیا ہے، وہ خودداری ہے خود پسندی نہیں۔ افکارِ فقیر میں بھی اسی بات کو آگے بڑھایا گیا ہے:

ہے لیندا کوئی نذر یا نیاز میں کیہ کراں
جگ سفلے دا کیہ اے رواج میں کیہ کراں
میرے تے سر دی ایہہ ٹوپی ہی آبرو اے میری
کسے دے سر تے فقیر ہے جے تاج میں کیہ کراں؟

ترجمہ: اگر کوئی نذر، نیاز لیتا ہے تو مجھے اس سے کیا۔ اس گھٹیا دنیا کا رسم و رواج کیا ہے میں کیا جانوں۔ میرے تو سر پر جو یہ ٹوپی ہے یہی میری آبرو ہے۔ اے فقیر، اگر کسی کے سر پر تاج ہے تو مجھے اس سے کیا غرض؟

حقیقت یہ ہے کہ شبلی نعمانی، سرسید احمد خاں اور الطاف حسین حالی نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے پیشِ نظر مقصدی ادب کی تخلیق کا جو بیڑا اُٹھایا اُسے آگے لے کر علامہ محمد اقبالؒ بڑھے اور انھوں نے اس پیغام کی اشاعت کچھ اِس موثر اور جامع انداز سے کی، جس کا شہرہ چار دانگِ عالم میں پھیل گیا اور جس کے اثرات پنجابی زبان اور ادب پر بھی گہرے طور پر پڑے۔ ان اثرات کی جھلک ہمیں جن پنجابی شعرا اور ادبا پر دکھائی دیتی ہے اُن میں ملک لال دین قیصر، استاد کرم امرتسری، محمد دین میر، چراغ دین عشق لہر، ظہیر نیاز بیگی، مولانا محمد بخش مسلم، امام دین مجاہد، سید فضل حسین، مدنی شہباز، دائم اقبال دائم، ملک عبدالقادر خوشتہ، طالب جالندھری، صحرائی گورداسپوری، ملک عطاء اللہ عزت، ملک ضیا اللہ ضیا، محمد رفیع اختر لاہوری، اسیر سوہلوی، حافظ امرتسری، حکیم شیر محمد ناصر، چراغ دین جوینکے والے، میراں بخش واقف، غلام احمد کاتب نوشاہی، عبدالغفور اظہر، محمد حنیف قدر، اللہ دتہ ناظر، حافظ عبدالرحمٰن عرف بابا کمالا، اظہر نظامی، سید موسیٰ امرتسری، فضل کریم مجاہد جہلمی، اسماعیل متوالا، خان مستانہ، ساحل فارانی، آغا امداد علی خان طالب اور کئی دوسرے نام جنھوں نے مقصدی ادب کے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی ایک نظم کے یہ چند اشعار قابلِ مطالعہ ہیں:

اج باقی نیں پنجابی اج پنجاب باقی اے
اجب باقی نیں تلواراں ایناں دی آب باقی اے
ایہہ سٹن دین توں سمجھ وار کے دولت جہاناں دی
کرن پرواہ نہ اولادں، نہ مالاں دی، نہ جاناں دی
ایہہ وحدت دے محلات وچ بن فانوس جگ دے نیں

الطاف حسین حالی اور ان کے ہم خیال مفکرین، شعرا اور دانشوروں کی تحریک دراصل روشن خیالی، وسیع المشربی اور ترقی پسندانہ خیالات کی حامل تحریک تھی، جس کی بنیادی وجہ ۱۹ویں صدی کے وسط میں، ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی، سماجی اور معاشرتی حوالوں سے زبوں حالی تھی۔ ایک طرح سے مسلمانوں کو نئے عزم وفنون، سائنسی اقدار اور معاصر دنیا سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ یہی تحریک آگے بڑھ کر ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں سرایت کر گئی اور جس کے اثرات دیگر قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ پنجابی پر بھی پڑے۔ اس تحریک کا مقصد، مسلمان اشرافیہ کی اقدار، رسم و رواج، قرونِ وسطیٰ کی قدیم روایات سے لپٹی تہذیب کے چنگل سے انھیں باہر نکالنا تھا۔ لہٰذا ان کے پیشِ نظر جدید انگریزی تعلیم اور جدید سائنس کے دروازے ان پر وا

کرتا تھے۔ اپنی اس تحریک کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کے ایک حصے کو قائل کر لیا یوں علی گڑھ اینگلو محمڈن کالج کی بنیاد پڑی جس کے ذریعے جدید تعلیم کے دروازے مسلمانوں پر وا ہو گئے۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں پر روشن خیالی کا ایک نیا باب کھولا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں پرانی ادبی روایات کی ہیئت اور موضوعات کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا۔ دراصل اس تحریک کو ہم اصلاحِ احوال کی تحریک کہہ سکتے ہیں جس کے بعد ازاں ہماری پنجابی شاعری اور زبان پر بھی دیرپا اور مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

پنجابی شاعری کا ایک درخشاں، روشن اور وسیع باب ملی جذبے کی حامل اسی شاعری کا ہے۔ ایسے شعرا کے ماضی پر نظر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان شعرا کی نسل میں سے اکثریت نے جب ہوش سنبھالا تو ایسے میں مسلم تشخص کو ابھارنے کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مولانا الطاف حسین حالی اور بعد ازاں علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے بہت سے شعرا نے جن کے نام شروع میں دیے گئے شاعری کے لیے اسی راستے کو اپنایا۔ ان شعرا میں سے اکثر نے انجمن حمایتِ اسلام اور دیگر انجمنوں کے جلسوں میں زوردار نظمیں پڑھیں۔ جن میں مسلمانوں کو ان کے عظیم ماضی اور عظمتِ رفتہ کا احساس دلایا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی کتاب ''موانے'' کے دیباچے میں مولانا ظفر علی خاں نے اُن کے بارے میں لکھا:

> ''مولانا الطاف حسین حالی، نے جو کام اپنی مشہور تصنیف ''مسدس مدوجذر اسلام'' سے لیا ہے، وہی کام فقیر محمد فقیر نے اپنی کتاب ''موانے'' سے لیا ہے۔''

اور یہ محض فقیر محمد فقیر تک ہی موقوف نہیں تھا کہ انھوں نے تحریکِ پاکستان کے ضمن میں اور بعد ازاں اُن کو ترقی کے زینے پر چلنے کے لیے راستہ دکھایا بلکہ اس عہد کے شعرا اس وقت چھپنے والے پنجابی کے رسائل وجرائد اور اس زمانے میں برپا ہونے والی محفلوں اور مجلسوں میں بھی یہ باتیں، زبانِ زدِ عام ہو چکی تھیں کہ مسلمانوں کو مسلسل محنت کے ذریعے ایک جاری انقلاب کے مرحلے سے گزرنا ہے۔ اس کے لیے انھیں اپنے عہد کے تقاضوں پر پورا اترنا ہوگا۔ اس سلسلے میں بعض دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ عشق لہر کا کلام ایک طرف جہاں انسانوں میں جذبۂ حب الوطنی کو ابھارتا ہے وہاں پر ہی جدوجہد، آگے بڑھنے اور مستقبل کو سنوارنے اور سنگھارنے کا درس دیتا ہے۔ اسی طرح مسلم تشخص کو ابھارنے کے حوالے سے چلنے والی تحریکوں سے جن شعرا کی شاعری کی مثالیں دی جا سکتی ہیں اُن میں امام دین مجاہد کا نام نمایاں اور سرفہرست نظر آتا ہے۔ امام دین مجاہد ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں آزادی کے لیے مشترکہ تحریک

چل رہی تھی ۔ اس لیے اُن کے دل میں آزادی کے جذبے اُبھرے۔ ۱۹۱۹ء میں چلنے والی تحریکِ خلافت میں انھوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔ انھوں نے دیگر شعرا کی طرح قیامِ پاکستان کے لیے تن، من، دھن کے ساتھ جدوجہد کی ۔ انھوں نے ایک سیاسی جماعت ''مساوات پارٹی'' بھی بنائی ۔ اُن کے بیان کے مطابق جس کے ہزاروں ممبر تھے ۔ اُن کی ایک نظم کے کچھ مصرعے دیکھیے:

اٹھو جاگو کر لیے چارہ   جاگ پیا اے عالم سارا
مسلم لیگ دا سُن کے نعرہ   جان ویری دی جاوے گی

اسی طرح کے ایک اور شاعر سید فضل حسین مدنی شہباز جو اپنے کلام کو جلسوں، جلوسوں میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ پیش کرتے تھے ۔ ان پر بھی مسلمانوں کے اندر مثبت اور ترقی کی حامل تبدیلی لانے کی خواہشات بدرجہ اُتم دکھائی دیتی ہیں ۔ اُن کی نظم کے کچھ مصرعے اسی طرح سے ہیں:

چھڈ غفلتاں بھائیاں نال اک ہو کے
ایس ویلڑے نوں ذرا سمجھ جائیں
تیری قوم دے سر تے کیہ بن گئی
ذرا سوچ ہاں، تیرا دھیان کتھے؟

یہ وہ نظریہ ہے جو سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی کے افکار و خیالات کے ذریعے پنجابی ادب میں در آیا۔ پنجابی ادب اور شاعری پر مزید بات کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اُن خیالات کا مطالعہ کر لیا جائے جن کے اثرات ہماری شاعری پر گہرے طور پر مرتب ہوئے ۔ حال ہی میں کتاب سرائے، لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی تصنیف ''تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظامِ نقد'' میں ڈاکٹر شاداب عالم رقم طراز ہیں:

> ''محمد حسین آزاد کی ساری تصانیف کو سامنے رکھ کر اگر تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو ان کے لیکچر ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کو تنقیدی اعتبار سے زمانی تقدم حاصل ہے جو ۱۸۵۷ء میں انجمن پنجاب کے مشاعرے میں دیا گیا تھا۔ یہ لیکچر ایک معنی میں نظمِ جدید کی تحریک کا منشور اور پیش خیمہ بھی ہے۔۔۔ آخر میں اس لیکچر سے اقتباس دیتے ہیں:
>
> > ''کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام موزوں و مقفٰی لکھے ہیں لیکن درحقیقت چاہیے کہ وہ کلام موثر بھی ہو ۔ ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے اگر کوئی کلام

> منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو ایسا کھانا ہے جس میں کوئی مزا نہیں، نہ کھٹا نہ میٹھا۔ ''

اسی کتاب کے صفحہ ۳۸ پر وہ لکھتے ہیں:

> '' حالی جس ماحول میں زندگی گذار رہے تھے۔ اس میں شاعری اپنے مقصد اور اپنی روح سے الگ ہو چکی تھی اور صرف تفریح یا قافیہ پیمائی کا ذریعہ رہ گئی تھی۔ اس بنا پر حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں ان چیزوں کا جائزہ لینا چاہا جن کا شاعری میں بہت زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ حالی نے اردو شاعری کے اہم اصناف کا جائزہ لیا اور ان کی خوبیاں اور خرابیاں لوگوں کو بتائیں تا کہ اردو ادب کے شیدائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ دوسرے حصے کی طرف جب مولانا حالی آئے تو جوش میں وہ بہت زیادہ لکھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ مقدمہ اتنا مبسوط ہو گیا کہ اپنی جگہ پر الگ ایک کتاب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ادبیات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا تو محمد حسین آزاد نے '' آبِ حیات '' میں شاعری کی سماجی اہمیت تسلیم کی اور زندگی اور معاشرت کے مختلف اثرات کا اثر شعر پر ظاہر کیا۔ لیکن نفسِ شعر پر اظہارِ خیال شاید ان کے دائرہ اثر سے بھی باہر تھا۔ اس لیے تفصیل سے پہلی دفعہ اس کا ذکر حالی کے مقدمے میں ملتا ہے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں نے حالی کے مقدمے کو اردو تنقید کی پہلی کتاب کہا ہے۔ یعنی یہ ایسی کتاب ہے جس میں نفسِ شعر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر واضح طور پر بحث کی گئی ہے اور شاعری کی سماجی اہمیت کو ابھارا گیا ہے۔ ''

وہ مزید لکھتے ہیں:

> '' حالی ایک ترقی پسند نقاد تھے۔ ان کا ادبی اور تنقیدی شعور ترقی پسندانہ افکار و تصورات پر مبنی تھا۔ کیوں کہ حالی کا سماجی و اجتماعی احساس بیدار تھا۔ وہ اپنے زمانے کی تاریخی قوتوں اور بنیادی حقوق سے بخوبی واقف تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ زندگی ایک تاریخی دور سے نکل کر دوسرے تاریخی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ ''

یہی وہ بنیادی نوعیت کے نظریات اور تصورات ہیں جن کے اثرات ہمیں مقامی زبانوں کے ادب، شاعری نثر اور دانش پر نظر آتے ہیں۔ جہاں تک پنجابی شعر و ادب کا تعلق ہے اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا

جا سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پنجابی ادب اور شاعری ان ادوار سے گذرتی آج جس نہج پر پہنچ چکی ہے، وہاں بھی اسے مقصدی اور باعمل خیالات کی حامل شاعری کرنے والے شعرا کا اعتماد حاصل ہے۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں ”پنجابی مجلس، لاہور“ کی جانب سے پنجابی نظم کے انتخاب ”سجرے پھُل“ کے شروع میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

> ترجمہ: ”سجرے پھُل“ کے لیے نظموں کا انتخاب کرتے ہوئے میرے سامنے پچھلے تیرہ، چودہ برس کی نظمیں تھیں۔ جن کو میں نے تین حصوں میں بانٹا ہے اور فارم کے اعتبار سے اس کی تقسیم کی ہے کہ ہمارے پاس کم از کم پنجابی نظم کا ترتیب وار انتخاب ہو۔ جس سے ہم پنجابی نظم کے رجحانات کا اندازہ لگا سکیں۔ پہلے دور کی نظم میں تصوف، عشق، سیاست اور دیگر موضوعات مل جاتے ہیں لیکن اظہار اور سوچ کا طریقہ بالکل روایتی ہے۔“

یہاں وہ صفدر میر کی نظم کے حوالے سے انفرادی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”محمد صفدر نے اگرچہ پنجابی میں زیادہ نہیں لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا ہے وہ انھیں پنجابی کا ایک بڑا شاعر بنانے کے لیے بہت ہے اور وہ ہمیں زندگی کے آفاقی دُکھ اور ازلی مجبوری کا احساس بڑے گہرے طریقے سے دلاتا ہے۔ اُن کی نظموں میں خوب صورت تشبیہات اور تراکیب کا خالی برتاؤ نہیں بل کہ اُن کی مدد سے وہ گہرے احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ صفدر کی شاعری میں سوچ ہے اور باقی شعرا میں اس کی کمی ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ باقی کی سوچ میں کوالٹی کا فرق ہے بل کہ یہ جذبے کا فرق ہے۔“

صفدر میر کی ایک نظم کے مصرع دیکھیے:

”رووَن والے جھلّے!

اوئے ایہہ دُکھدے دِلاں دی دُنیا
کون کسے دی وات پُچھے
تے کون کسی دے اتھرو پونجھے
کس نوں اینی فرصت!“

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے پنجابی کے مقصدی شعرا میں استاد عشق لہر کا نام نمایاں ترین ہے۔ اُن

کے انتخاب کے دیباچے میں پنجابی کے شاعر سلطان محمود آشفتہ لکھتے ہیں:

> ”روایتی رومانی اور عشقیہ شاعری کے علاوہ اُستاد عشق لہر نے اپنی شاعری سے قوم کی اصلاح کی اور قوم کو جگانے کا ذریعہ بھی بنایا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی میں مسلمانانِ ہند کی حالت زیادہ خراب اور کمزور ہو گئی اور اُن پر ہندوؤں اور دوسری اقوام کا غلبہ ہوتا گیا ۔۔۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تجارت بھی نہ رہی اور وہ تعلیم کے میدان میں بھی بہت پیچھے رہ گئے۔ ایسے میں عشق لہر نے قوم کے نوجوانوں کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے سیکڑوں اشعار کہے اور اُنھیں بیدار کرنے کے لیے اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ یوں عشق لہر نے وہ کردار ادا کیا جو سر سید، حالی اور علامہ اقبالؒ نے ادا کیا۔ مولانا محمد بخش مسلم نے اُن کی ایک برسی کے موقع پر عشق لہر کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ عشق لہر پنجابی کے علامہ اقبال تھے۔“

یوں کہنا چاہیے کہ پنجابی شاعری کے موضوعات اس کی ابتدا ہی سے مقصدی نوعیت کے رہے ہیں۔ صوفیائے کرام نے انسان کو زندگی کا مقصد مان کرا سے کائنات کا منبع و محور قرار دیا اور اس کے مثبت اور پاکیزہ اعمال کو حاصلِ زندگی قرار دیا۔ یہ مقصدی رنگ ہمیں پنجابی شعر و ادب کے پورے سفر میں واضح اور بھرپُور طریقے سے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم پنجابی شاعری پر الطاف حسین حالی اور علامہ اقبالؒ جیسے شعرا کے اثرات اس وقت مرتب ہوئے جب برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا دورِ زوال شروع ہوا۔ اس دوران کچھ تو اس شعری تحریک کے زیرِ اثر اور کچھ اس عہد کے پنجابی شعرا کے بذاتِ خود ایسے حالات کا جائزہ لینے پر شاعری تخلیق ہونا شروع ہوئی، جس کے اثرات ہمیں آج کی نظم پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی ایک ہی خطہ میں رہنے والی اقوام کے جذبات و احساسات ملتے جلتے ہی ہوتے ہیں۔ اُسی طرح اُس عہد کے سوچنے والوں کے اذہان بھی ایک ہی نہج اور ایک ہی خط پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی بھی عہد میں سانس لے رہا شاعر، ادیب اور دانشور بہتر سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اُس عہد، ریاست، لوگوں اور ماحول کو کس نوعیت کے انقلاب اور تبدیلی کی ضرورت ہے ۔۔۔ یوں پچھلے ڈیڑھ دو سو سال سے پنجابی میں رقم ہونے والے ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں در آنے والے افکار و خیالات نئے انسان کی ضروریات کے آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کے جذبات و احساسات کے ترجمان بھی ہیں۔

☆☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

الطاف حسین حالی کے سندھی ادب پر اثرات

ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ مغل تہذیب وتمدن کا دامن تار تار کیا گیا تھا۔ لال قلعہ کے در و دیوار بے گناہوں کے خون سے رنگین تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا غالب کی طرح یہ سارے جگر خراش مناظر اور زہرہ گداز واقعات اپنی خونابہ فشاں آنکھوں سے دیکھے تھے۔ عظمتِ رفتہ کی یادگاروں کو زمیں بوس ہوتے دیکھ کر ان کے اندر کا حساس اور غیور شاعر کب سکون سے بیٹھ سکتا تھا۔ ایسے میں سرسید کی تحریک نے تازیانہ کا کام کیا۔ اس نے ملتِ اسلامیہ کی گذشتہ عظمت وجلال کا نقشہ ایسی صداقت اور خلوص سے پیش کیا کہ جس نے مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ ایسے میں سرسید کے دیگر رفقا سے زیادہ حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے دانش مندی اور خلوص وصداقت کے ساتھ اپنی قوم کے لیے تعلیم اور ادب میں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کیا اور وہ ان کے ساتھ شریک کار ہو گئے۔

سندھی میں سرسید کی تحریک کے گہرے اثرات مرتب ہوئے کہ اہلِ سندھ کے لسانی سطح پر پورے برصغیر کی اہم زبانوں سے رابطے صدیوں سے قائم تھے اور قائم ہیں۔ خصوصاً عربی، فارسی اور اردو، وادیٔ مہران میں اردو زبان کے اثرات کا سلسلہ کلہوڑوں کے دور سے ہے اور عہدِ حاضر میں بھی سندھی میں بہت سے ایسے ادیب وشاعر ہیں جو اردو اور سندھی میں یکساں عبور رکھتے ہیں۔ (سندھی کے نامور شاعر شیخ ایاز نے تو شاعری کا آغاز ہی اردو سے کیا۔ اسی طرح امر جلیل بھی سندھی اردو میں لکھتے ہیں۔ بخشل باغی نے بھی شاعری کا آغاز اردو سے کیا۔

ارغونوں اور ترخونوں کے عہد میں سندھ کا رابطہ مستقل بنیادوں پر ہندوستان سے قائم ہونے لگا اور مغلوں کے دورِ حکومت کے آغاز ہی سے سندھ میں نئی زبان کی پذیرائی ہونے لگی اور ایسے افراد ابھر کر سامنے آ گئے جو عربی، فارسی اور سندھی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ تاریخ معصومی کے مؤلف میر معصوم بکھری کے بھائی میر فاضل کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی فرماتے ہیں کہ:

"جلیل القدر ادیب و عالم وشاعر سید عبدالجلیل بلگرامی اور میر غلام علی آزاد بلگرامی

> وقائع نویسی کے سلسلے میں ۱۱۱۶ھ سے ۱۱۴۰ھ تک سندھی میں رہے۔ یہ بزرگ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں ریختہ میں شعر کہنے کا نیا ذوق پیدا ہوا تھا۔ آبرو، ناجی، مضمون، مظہر جانِ جاناں اور ولی گجراتی نے بھی اسی دور میں فروغ حاصل کیا۔"(۱)

سندھی میں یہ دور ریختہ گوئی کا پہلا دور ہے۔ مغل دورِ حکومت میں ہندوستانی شعرا کی سندھ آمد سے سندھی شعرا میں بھی اردو شاعری کی تحریک پیدا ہوئی اور پورے سندھ میں پھیل گئی۔ عرضِ مدعا یہ ہے کہ سندھی کے اردو زبان سے روابط کئی صدیوں پر محیط ہیں اور اسی لیے اردو ادب کی ہر تحریک کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ سندھی ادب پر بھی مرتب ہوئے۔

برطانوی سامراجی عہد ہندوستان اور سندھ دونوں پر برے اثرات مرتسم کر رہا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے "میانی اور دوآبہ" کی جنگوں میں تالپر حکومت کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد سندھ کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے، ان کے حقوق کو پامال کرنے کا سلسلہ عرصہ دراز تک قائم رہا۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید کی کوششوں سے "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا جس میں سندھی دانشوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حسن علی آفندی کی کوششوں سے سندھ مدرسۃ الاسلام اور "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا جس میں مولوی اللہ بخش ابوجھو نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ مولوی اللہ بخش ابوجھو سندھ مدرسہ کراچی میں فارسی کے استاد تھے۔ سندھی شعر و ادب سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ وہ تعلیمی جریدے کے مدیر بھی تھے جس کے مضامین تہذیب الاخلاق جیسے مضامین پر مشتمل تھے۔ انھوں نے ایک مسدس بطرزِ حالی لکھی جو 'مسدسِ ابوجھو' کے نام سے مشہور ہے۔ آفاق صدیقی کے مطابق:

> "مسدس ابوجھو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مسدس حالی کا منظوم ترجمہ ہے اور دوسرا حصہ طبع زاد، جس میں انھوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام کی تحریک کے اغراض و مقاصد کا احاطہ کیا ہے۔ منظوم ترجمے میں انھوں نے وہی سادگی، روانی اور حقیقت نگاری برقرار رکھی ہے جو مسدس حالی میں نمایاں ہے۔ دوسرے حصے میں اپنے طور پر جن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہ بھی مسدس حالی کے اندازِ بیان سے بہت ملتے جلتے ہیں۔"(۲)

سرسید کی تحریک کے اثرات سندھی ادب کی تمام اصناف پر مرتب ہوئے۔ خصوصاً قومی و ملی جذبہ

کے حوالے سے شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی کی تنقید اور شاعری کے زیرِ اثر سندھی زبان و ادب میں بھی نیا لب ولہجہ فروغ پانے لگا۔ زندگی کو دیکھنے کے نئے نئے زاویہ ہائے نظر سے لکھا جانے لگا اور سندھی ادب میں نئی اصناف ظہور پذیر ہونے لگیں۔ آزادی سے پہلے بعد کے عشرے میں سندھی ادبا و شعرا کی ایک بڑی تعداد قومی و ملی جذبے، وطن کی، دھرتی کی محبت سے سرشار ہو کر اُٹھی۔ وطن پرستی اور حب الوطنی ابتدا ہی سے سندھی شاعری کا موضوع رہے ہیں مگر سندھ سے محبت سندھی ادب کی اعلیٰ شناخت ہے جس میں شاہ لطیف اور سچل سے لے کر شیخ ایاز تک ہر ایک یوں ڈوبا ہوا ہے کہ سندھ کی دھرتی اس کے لیے محبوب کا درجہ اختیار کر گئی۔ نظم غزل وائی سے لے کر جدید شاعری کی تمام اصناف میں دھرتی سے محبت کی ایسی عمدہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا ذخیرہ کسی اور زبان کی شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے اور یہ درس انہیں شاہ لطیف کی شاعری سے بھی ملا ہے اور برصغیر کے مخصوص حالات سے بھی۔ شاہ لطیف کی شاعری اور سرسید اور ان کے رفقا خصوصاً حالی نے برصغیر کی ہر زبان و ادب پر خصوصاً سندھی ادب پر اور اہلِ سندھ پر نمایاں اثرات چھوڑے۔ حسن علی آفندی نے تعلیم اور صحافت، مرزا قلیچ بیگ نے ادب اور مضمون نویسی کو فروغ دیا۔ مرزا قلیچ بیگ نے چار سو سے زائد کتب لکھیں ان میں تراجم بھی شامل تھے اور تحقیقی، تاریخی، تخلیقی اور نصابی کتب بھی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے دور میں سندھی ادیبوں نے حریت اور سرفروشی کے نشاں ہر اس شخص کی شجاعت و جواں مردی کو سلام پیش کیا جس نے آبروئے وطن کی خاطر جان کی قربانی پیش کی۔ شعرا نے غاصب انگریزوں اور ان کے حواریوں سے نفرت و حقارت کے جذبات کا اظہار کیا اور ہم وطنوں کی خوشیوں کی خاطر تن من دھن کی قربانی پیش کرنے والوں کے احترام میں گیت لکھے۔ ان کی داستانوں کو ڈرامے، ناول، افسانوں، کہانیوں اور شاعری کے ذریعے اہلِ سندھ کی نذر کیا۔

شیخ عبدالرزاق راز، شیخ ایاز، ایاز قادری، ہر دلگیر، عبدالحلیم شرر، محمد عثمان ڈیپلائی، حیدر بخش جتوئی، عبدالواحد سندھی، محمد ابراہیم جویو، مولانا دین محمد وفائی، لطف اللہ بدوی، امید علی سرائی، پیر حسام الدین راشدی اور دیگر نے ادب کو حالی کے نظریات کی روشنی، مقصدیت اور عام فہم (روزمرہ) کے دائرے میں لا کر سندھی ادب کی کایا پلٹ دی۔ پروفیسر ڈاکٹر حیدر سندھی فرماتے ہیں کہ:

> ”یہی وہ باشعور محقق، قلمکار ہیں جن کی تحریروں میں منطق اور مقصد ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یا مزاج کے لحاظ سے، جن کی تحریروں میں وطن پرستی، حب الوطنی، حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد، ناانصافی کے خلاف، بے باکی، جرأت، ہمت، عالمی

> مسائل پر خیال آرائی، عالمی سطح پر مظلوم عوام سے اظہارِ یکجہتی اور اپنے ثقافتی، تاریخی، سیاسی، سماجی اور علمی اور ادبی وجود کے خلاف (جس زبان و ادب میں) مزاحمت موجود نہیں ہوتی اسے پڑھنے والے نہیں ملتے۔"(۳)

شیخ محمد ابراہیم خلیل بھی اردو اور سندھی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ آپ کے حوالے سے ڈاکٹر شاہدہ بیگم لکھتی ہیں کہ:

> "ایک پیشہ ور ڈاکٹر اور ادبی مشاغل چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن اور مرادف ہیں مگر ڈاکٹر خلیل نے اپنی ذات سے اسے سچ کر دکھایا۔ آپ سندھی اور اردو دونوں زبانوں کے نثار بھی ہیں اور شاعر بھی اور اردو کی کئی کتابوں کی مصنف ہیں۔"(۴)

آپ کے کلام پر حالی کے واضح اثرات ہیں۔ ایک شعر دیکھیے:

کعبے گئے تو ذوقِ تجسس نے یہ کہا
منزل یہاں سے آگے ہے اک اور بھی ابھی (خلیل)
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ایک اور شاعر مولانا دین محمد ادیب کا اردو کلام سراسر حالی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے کہ:

یا رب کلام میرا حقیقت نما بنے
خاصوں کے سینے سے ملے نورِ نظر مجھے

سندھی غزل ہو یا نظم اس پر فارسی اور اردو کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ ایاز قادری فرماتے ہیں کہ:

> "غزل نے جہاں دیگر خارجی اثرات قبول کیے وہیں اس نے اپنے سماج اور ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ ملک میں جو بھی معاشی، مادی، ذہنی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان سے ایک حساس شاعر کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ زمین کو جنتِ ثانی بنانے کی خواہش اپنے چاراطراف بکھری گندگی سے نفرت اور دھرتی کے دوزخ میں انقلاب لانے کی آرزو۔۔۔۔ ایسے اصول ہیں جو غزل، خصوصی طور پر اس دور کی غزل کی زیب و زینت ہیں۔ نئے شعرا بھی اس سمت

متوجہ ہوئے ہیں۔"(۵)

سندھی شاعری میں مسدس کی ہیت میں لکھنے کا رواج پہلے سے تھا۔ اردو مرثیہ نگاری کی طرح سندھی کے معروف مرثیہ نگار سید ثابت علی شاہ اس ہیت میں مرثیہ لکھ رہے تھے مگر مسدس اللہ بخش ابوجھو سے مسدس حالی سے ملتی جلتی قومی اور ملی حوالے سے نظم لکھنے کو فروغ حاصل ہوا۔ آفاق صدیقی، ڈاکٹر تنویر عباسی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> "مولی اللہ بخش کی "مسدس ابوجھو" سندھی مسلمانوں کے لیے وہی پیغام لیے ہوئے تھی جو مسدس حالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے۔۔۔۔ مسدس میں پہلے مسلمانوں کی ترقی اور اوج کا ذکر ہے اور بعد میں تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے ابوجھو نے مسلمانوں کو سماجی اور اخلاقی برائیوں سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔"(۶)

مولانا الطاف حسین حالی نے نہایت غور و فکر، تدبر و تحمل کے ساتھ پہلے برصغیر کے معاملات کو پرکھا اور پھر تنقید اور شاعری میں بنیادی تبدیلیوں کے لیے سرگرم ہوئے اور انھوں نے غزل، مسدس اور دیگر اصناف شعری میں روایتی انداز سے ہٹ کر طبع آزمائی کی اور قومی و ملی مقاصد کو اولیت دی اور اس کے اثرات دیگر زبانوں سے زیادہ سندھی شاعری پر اس لیے بھی مرتب ہوئے کہ سندھی میں شاہ لطیف پہلے ہی قومی شاعری کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ حالی کی تحریک سے وہ جذبہ، جوش اور احساس شدت سے سندھی شاعری میں متحرک ہوا جو آج تک جاری ہے۔

اللہ بخش ابوجھو کے بعد سندھی قومی شاعری میں شمس الدین بلبل کا نام نمایاں ہے۔ جنھوں نے اکبرالہٰ آبادی جیسے ظریفانہ کلام سے شہرت پائی۔ مگر ان کے سنجیدہ کلام میں حالی کے اثرات نمایاں ہیں۔ اسی طرح حکیم فتح محمد سہوانی کی نظموں میں بھی جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر حالی کی نظم "حب وطن" اور "مسدس حالی" کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ:

وطن آھي منھجو وڏي شان وارو
وطن منھجو داتا سدا دان وارو

ان کے علاوہ اس عہد میں مرزا قلیچ بیگ، آغا غلام نبی صوفی محمد بخش واصف، حاجی محمود خادم، لطف اللہ بدوی، ڈاکٹر ابراہیم خلیل، حافظ محمد احسن اور ان کے معاصر شعرا نے قومی و ملی رجحانات و میلانات کے حوالے سے شاعری کی۔ ان کی ہیئتوں اور نفسِ مضمون پر کسی نہ کسی حوالے سے مولانا حالی کے شعری اسلوب

اور تنقید کے اثرات ضرور پائے جاتے ہیں۔

مولانا حالی نے مسدس کے ذریعے مسلمانوں کو موجودہ پستی اور ماضی میں شاندار ترقی دونوں کا احساس دلایا۔ یہ نظم صرف تاریخی یا اصلاحی نہیں تھی بل کہ اس کا ایک مکمل سیاسی پس منظر بھی تھا۔ اس نے برصغیر کے عام و خاص دونوں طبقوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ ان میں غیرت وحمیت پیدا کی۔ انہیں غفلت سے بیدار کیا، اپنی پستی و بے بسی کا احساس دلایا۔ حالی اور سرسید کی تحریک اور تحریر کے یہ اثرات سندھی ادب پر بھی مرتب ہوئے۔

سندھ کی نئی نسل کے شعرا میں عبدالرزاق راز، عطا محمد حامی، فیض بخشاپوری، رشید احمد لاشاری، شیخ ایاز، بشیر احمد سوریانی، یوسف شاہین، نقش نایاب منگی، شیخ امداد علی امداد اور دیگر کی شاعری میں وطن پرستی، حب الوطنی، جواں مردی، حریت کے افکار، خیالات اور مقصدیت سے لبریز شاعری کی لہریں اُمڈ اُمڈ کر حالی کے اثرات کی تائید کرتی ہیں۔

سندھی تنقید اور دیگر نثری تخلیقات خصوصاً افسانے اور ناول میں بھی قوم پرستی اور حب الوطنی کی لہر قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں پوری قوت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ خصوصاً ون یونٹ کے عہد میں یہ رویہ اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس عہد کے افسانے، ناول اور شاعری میں سندھ اور سندھی قوم کی نئی شاندار شناخت مرتب ہوتی ہے۔

سندھی ادیبوں کی تعداد حب الوطنی کے حوالے سے بہت زیادہ ہے۔ سب کا تذکرہ تو ناممکن ہے البتہ اس حوالے سے شیخ ایاز، شیخ عبدالرزاق راز، رشید احمد لاشاری، لطف اللہ بدوی، تنویر عباسی، نسیم کھرل، ایاز قادری، پیر حسام الدین راشدی، قاضی علی اکبر درازی، محمد عثمان ڈیپلائی، عبدالواحد سندھی، غلام علی الانہ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، کریم بخش خالد، سراج الحق میمن، آغا سلیم، نیاز ہمایونی، ڈاکٹر عبدالمجید میمن، امر جلیل، عبدالعلیم جوش، علی بابا، نجم عباس، کریم بخش نظامانی، امداد حسینی، تاج بلوچ اور دیگر نے حب الوطنی کے فروغ کے حوالے سے تخلیقات پیش کیں۔ اکبر لغاری نجم عباسی کے باب میں فرماتے ہیں کہ:

> ”ڈاکٹر صاحب ایک خاص مقصد کے لیے لکھتے ہیں اور وہ مقصد ہے ”شخصی اور قومی آزادی۔“ وہ جبر اور مذہبی جنون کے خلاف لکھتے ہیں۔ وہ بولی کی ترقی اور بقا کے لیے لکھتے ہیں۔ وہ غیر طبقاتی سماج کے لیے لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا بنیادی محور سماجی، سیاسی اور معاشی انقلاب ہے۔“(۷)

قوم پرستی اور وطن پرستی کے رجحان میں ون یونٹ کے دور میں شدت آ گئی۔ جس دور میں سندھ کی لوک روایات، ثقافت اور سندھی زبان کی ترقی وارتقا کے کئی ادوار سمٹ گئے اس دور میں سراج، امر جلیل، عبدالحق عالمانی، نسیم کھرل، نجم عباسی، علی بابا، رسول بخش پلیجو، عبدالقادر جونیجو، شوکت حسین شورو، تنویر عباسی، تاج جویو خصوصاً ابراہیم جویو اور شیخ ایاز کے نام اپنے تخلیقی کام اور جذبۂ حب الوطنی کی بنیاد پر نمایاں ہوئے۔ اس کے بعد سندھی ادیبوں کا ایک نیا گروہ سامنے آیا جو سندھی ادب میں نئے موضوعات اور نئے اسلوب کی بنیاد پر جدید سندھی ادب کا سرخیل بنا۔ اردو افسانے کے زیر اثر مختصر افسانے کی تکنیک کو اپنایا گیا جس میں سماجی، سیاسی، معاشی اور طبقاتی کشمکش کو نہایت خلاقانہ طور پر پیش کیا گیا۔ جاگیردارانہ استبداد اور معاشرتی برائیوں اور بدعنوانیوں کو جرأت مندی سے پیش کیا گیا۔ برطانوی سامراج اور مقامی آمروں کے خلاف نہایت بے باک اور نڈر ہو کر لکھا گیا۔

سندھی ادب پر حالی کے اثرات اس لیے بھی زیادہ تھے کہ اہلِ سندھ اسلام اور اپنے وطن سے شدت کے ساتھ محبت کرتے تھے اور کرتے ہیں اور حالی کے اثرات دو بنیادی نکات بھی یہی ہیں کہ مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ حالی کے اس مشن کو اردو میں بعد ازاں اقبال نے آگے بڑھایا اور سندھی میں شیخ ایاز نے جن کے گیت سندھ کے چپے چپے میں کل بھی گونجتے تھے اور آج بھی ان گیتوں کی حرارت سے سندھ اور اہلِ سندھ کے دلوں میں حرارت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اعجاز الحق قدوسی مولانا، تاریخِ سندھ (حصہ دوم)، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۳۸۰
۲۔ آفاق صدیقی، سندھی ادب پر سرسید کی تحریک کے اثرات، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق (سندھی ادب وثقافت نمبر)، بھگوان اسٹریٹ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۶۔۳۷
۳۔ حیدر سندھی پروفیسر ڈاکٹر، سندھی زبان وادب کی تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۰
۴۔ شاہدہ بیگم ڈاکٹر، سندھ میں اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، جون ۱۹۸۰ء، ص ۳۰۷
۵۔ ایاز قادری، سندھی غزل جی اوسر، انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی، جامشورو، جون ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۔۱۵
۶۔ آفاق صدیقی، حالی نمبر (مجلّہ)، علامہ اقبال گورنمنٹ کالج، کراچی، س ن، ص ۲۳۴۔۲۳۵
۷۔ اکبر لغاری، سندھی ادب جو مختصر جائزو، نیو فیلڈس، حیدرآباد، ۱۹۹۳ء، ص ۸۲

☆☆☆☆

ڈاکٹر گل عباس اعوان

الطاف حسین حالی کے سرائیکی ادب پر اثرات

ادب میں چند لوگ ہی رجحان ساز ہوا کرتے ہیں۔ مولانا حالؔی کا شمار بھی، اُن چند رجحان ساز، دانشوروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے نہ صرف اردو ادب کا مزاج بدل دیا ہے، بلکہ اُن کے نظریات نے خطے کی تمام زبانوں کے شعروادب کو، اب تک متاثر کرنے کے عمل کو جاری رکھا ہوا ہے۔ اِتنے بڑے رجحان ساز دانشور، یوں ہی پیدا نہیں ہو جاتے۔ اُن کی دانش کے پس منظر میں، صدیوں کی لوک دانش اور صدیوں کے دُکھ پنہاں ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے سال نے یہاں کے مسلمانوں اور خصوصاً، اُن کے حکمرانوں کو، اُن کی بے عملی کی سزا دی۔ طویل عرصے کی بے عملی، سُستی، کاہلی اور درباری سازشوں نے، یک جہتی اور اعتماد کی فضا کو یکسر، ختم کر دیا تھا۔ فرقہ ورانہ نفرت پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ دِلی بار بار اُجڑ رہی تھی اور لوگ بے عملی کی تصویر بنے، محض نوحہ کناں تھے۔

> ”ان نوحوں میں، سب سے زیادہ ماتم، اس تہذیب و معاشرت کے مٹنے کا تھا جس کی
> عمر ایک ہزار سال بتائی گئی ہے۔“(۱)

جنگ آزادی ہوئی تو وہ سب کچھ ہوا، جو، چشمِ تخیل نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ مسلمان شاہ، سے گدا ہو گئے، سب کچھ بدل گیا، مگر اتنا بڑا سانحہ بھی، اردو ادب کے مزاج کو نہ بدل سکا۔ اس کی بنیادی وجہ، یہاں کا بے عمل، بے حس، ٹھہراؤ اور جمود زدہ ماحول تھا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تبدیلی کی خواہش کہیں نہ کہیں ضرور موجود تھی۔

> ”قدیم مسلکِ شعری (یا دہلی و لکھنو کی روایات) پر چلنے والوں کے لیے یہ جگہیں
> سازگار تھیں۔ البتہ لاہور، جہاں انگریزی عملداری مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی،
> اس مقصد کے لیے بڑا، موزوں مرکز ثابت ہوا۔“(۲)

یہ تبدیلی فطری عمل تھا۔ اس تبدیلی کے پس منظر میں برصغیر کے وہ حالات تھے جس میں چند بوریہ نشین نئے ماحول میں مسلمانوں سے نئے کردار کا تقاضا کر رہے تھے۔ چونکہ یہاں ہر کوئی اپنی مستی میں مست

تھا،لہٰذا نئی آنے والی تبدیلی کو مسلمان اشرافیہ و متقدر طبقہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی بے عملی کا یہی منطقی نتیجہ نکلنا تھا۔ جس کا بالآخر ہر ایک کو سامنا کرنا پڑا۔ یہ اُس کھیل کا آخری سین تھا جو ایک عرصے سے کھیلا جا رہا تھا۔

> ”خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کا غبار چھٹ گیا۔ لال قلعے کی شکل میں، بظاہر جو ایک بھرم سا نظر آ رہا تھا، وہ کھل گیا اور لوگوں کو تلخ حقیقت کا کڑوا گھونٹ حلق سے نیچے اُتارنا ہی پڑا۔“(۳)

اِن حالات میں برِصغیر کی علمی دانش کو، جن حضرات نے، نئی روشن راہیں دکھائیں، اُن میں سر سید احمد خان اور اُن کے رُفقاء، ہراول دستے کا کام کر رہے تھے۔ اردو ادب کے عناصرِ خمسہ نے، اپنے عہد کی نسل کو وہ راستہ دکھایا، جس پر چل کر، بعد ازاں ان کے سیاسی و ادبی مقاصد پورے ہوئے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کا ادبی کام، اعلیٰ اور متنوع ہے۔ اُنہوں نے آنیوالے ہر ادبی دور کو متاثر کیا۔ مولانا حالؔی کے معاشی مسائل، اُنہیں پانی پت سے، برِصغیر کے مختلف شہروں میں لے گئے۔ اور یہی معاشی مسائل، اُنہیں لاہور بھی لے آئے۔ جہاں اُنہیں ڈاکٹر لائٹنر (پرنسپل گورنمنٹ اورینٹیل کالج لاہور)، کرنل ہالرائیڈ اور مولانا محمد حسین آزادؔ، جیسے نابغہ، کی صحبت میسر آئی۔ سچ تو یہ کہ انہی حضرات کے طفیل، اردو شاعری کو، نیا جنم نصیب ہوا۔ لاہور میں ۸ مئی ۱۸۷۴ء کے دن موضوعاتی مشاعرہ ہوا۔ ”یہ پہلا دن تھا کہ جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔“(۴) یہاں پر موجود اکابرین کا کہنا تھا کہ وہ نیچرل شاعری متعارف کرا رہے ہیں۔ نیچرل شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری تھی، جس کی زبان صاف اور سیدھی ہو، مبالغہ سے پاک ہو۔ یہ شاعری خیالی مضامین کی بجائے، فرد اور فرد کے مسائل سے متعلق ہو۔ اکابرین ادب کی یہ خواہش تھی کہ لوگوں میں اجتماعی زندگی کا احساس پیدا کیا جائے۔

مولانا حالؔی نے اِس پلیٹ فارم سے چار نظمیں، برکھا رُت، نشاطِ اُمید، حُبِ وطن اور مناظرہء رحم و انصاف، پڑھیں۔ بقول گارساں دتاسی: ”اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء، کا وہ دن کہ جب لاہور میں، نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ ہوا۔ ہمیشہ یادگار رہے گا۔“(۵)

اسی خیال کے پیشِ نظر، مولانا حالؔی نے اپنے دیوان میں ”مقدمہ شعر و شاعری“ شامل کیا۔ یہ مقدمہ حالؔی کے دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس مقدمہ میں اُنہوں نے اپنا یہ مدعا بیان کیا کہ وہ موجودہ حالات میں کس طرح کی شاعری کی خواہش رکھتے ہیں۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر قوم میں سیاسی و معاشی

بدحالی کا شکار ہو جائیں، تو، اُنہیں دوبارہ کھڑا کرنے کے لیے، اس قوم کے شعر و ادب کو بھی اپنا کردار کرنا چاہیے۔ حالیؔ کے مطابق، کنگھی چوٹی، عشق و عاشقی کی رنگین مزاجی، بازاری خیالات سے پرہیز کرتے ہوئے، قومی و وطنی جذبات اور تصوف کو شاعری میں جگہ دی جائے۔ ”شاعری سچے جذبات کی آئینہ دار ہو۔ تا کہ زبان و بیان کی سطح بلند ہو۔“(۲)

کچھ یہی پس منظر، سرائیکی شعر و ادب کے حصے میں آیا۔ وفاقی و صوبائی حکومتوں کے مراکز سے دور ہونے کے سبب، یہاں وہ ترقی نہ ہو سکی، لوگ جس کے متمنی تھے۔ اپنوں کی بے حسی اور بے عملی، دوسرا اور اہم سبب تھا۔ مستزاد یہ کہ سرائیکی شعر و ادب کے اب بھی وہی موضوعات تھے جو مولانا حالیؔ کے عہد میں اردو شعر و ادب کے تھے۔ جب ہم سرائیکی شعر و ادب پر مولانا حالیؔ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے مولانا حالیؔ کی ادبی جہتوں کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ یوں تو مولانا حالیؔ کی بہت سی جہتیں ملتی ہیں مگر سرائیکی شعر و ادب پر اُن کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے لیے میں اِن میں سے چند جہتوں کو زیرِ بحث لا رہا ہوں:

۱۔ مولانا حالیؔ بطور جدید شاعر
۲۔ مولانا حالیؔ بطور نقاد
۳۔ مولانا حالیؔ بطور مضمون نویس
۴۔ مولانا حالیؔ بطور سوانح نگار
۵۔ مولانا حالیؔ بطور محقق

مولانا حالیؔ نے لاہور میں انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام جلسوں میں تو صرف چار نظمیں پڑھیں مگر ان کے ان موضوعات پر تسلسل سے لکھنے نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کے ہاں یہ رُجحان وقتی نہیں تھا بلکہ ان جدید نظریات کی ترویج، ان کے لاشعور میں موجود تھی۔ اُنہوں نے ۱۸۷۹ء سے ۱۹۰۵ء تک کئی نظمیں اور بے شمار غزلیں تخلیق کیں۔ اُن کی نظموں میں موضوعات کا تنوع، ان کے رُجحانات کا واضح اظہار کر رہا ہے۔ اُنہوں نے درج ذیل موضوعات پر نظمیں لکھیں:

مسدس مدوجزر اسلام
کلمۃ الحق
مناجاتِ بیوہ
مدرسۃ العلوم
مناظرہ واعظ و شاعر
چُپ کی داد
تعصب و انصاف
شکوہِ ہند

اب جب ہم جدید سرائیکی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ۱۹۷۰ء کی دہائی جدید سرائیکی

شاعری کا نقطۂ آغاز نظر آتی ہے۔ جدیدیت کے اِس رُجحان کے پس منظر میں ہمیں سرائیکی خطے میں موجود درج ذیل رُجحانات واضح طور پر نظر آتے ہیں:

۱۔ سماجی اقدار کی بے حُرمتی
۲۔ فرد کی روحانی تنہائی اور بے چینی
۳۔ سیاسی و سماجی نظام سے مایوسی
۴۔ فرسودہ عقائد اور بوسیدہ نظام سے انحراف کی خواہش
۵۔ روایتی تصورات اور خود ساختہ اخلاقی نظام پر تنقید
۶۔ مروجہ مذہبی خیالات کا جائزہ
۷۔ خطے کی اصل تاریخ کی بازیافت
۸۔ اپنی ثقافت اور اسطوری فکر کی تلاش (۷)

چونکہ مولانا حاؔلی کے افکار، اس خطہ میں کم و بیش ایک صدی سے موجود تھے، لہٰذا پڑھے لکھے لوگ مولانا حاؔلی کا نہایت سنجیدگی سے مطالعہ کر رہے تھے۔ افکارِ حاؔلی کی ترویج کا ایک بڑا سبب، اردو ادب کے نصاب میں شامل ہونا بھی ہے۔ میٹرک سے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے والا ہر طالبِ علم، افکارِ حاؔلی سے ضرور مستفید ہوتا ہے۔ یوں مولانا حاؔلی کبھی کبھار نصاب سے نکل کر عام ادبی نشستوں میں موضوعِ بحث بھی بن جاتے ہیں اور ایسا کئی مرتبہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصؔر، سرائیکی خطے کے ایک روشن فکر شاعر اور دانشور ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے ہیں۔ وہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں شعبہ سرائیکی کے چیئرمین بھی رہے ہیں۔ انہوں نے سرائیکی شاعری کے ارتقاء پر پی ایچ۔ ڈی کی ہے۔ سرائیکی شاعری میں جدیدیت کی بنیاد انہوں نے رکھی۔ انہوں نے آزاد نظم کو خطے میں اس وقت متعارف کرایا جب قافیہ/ردیف کے اس تکراری طلسم کو توڑنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے سرائیکی ادب میں جدید افکار متعارف کرائے۔ چولستان کی پیاس بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نصر اللہ کہتے ہیں کہ:

سرائیکی	اردو
پر، اِت واری	اب کی بار تو
سکدیاں اکھیں سک لتھیاں ہن	ترستی آنکھیں، ترستی رہ گئیں

ساون دیاں اے کنواریں کھجیاں	ساون میں بھی کھجور کے کنوارے درخت
اپنے زیور، تریور، پا۔ تے	زیور کپڑے پہنے
تانگھ تنگھدیاں رہ گئیں	ساون کا انتظار کرتے رہ گئے

اقبال سوکڑی نے بھی ہر بڑے شاعر کی طرح سرائیکی دھرتی کو اپنا موضوع بنایا۔ انہوں نے زندگی بھر، ایک مدرس کی اعلی خدمات سرانجام دیں۔ تعلیمی ماحول نے اُنہیں ہمیشہ کتابوں کے قریب رکھا۔ دھرتی کی دُکھ بیان کرنے لیے، انہوں نے ہر صنفِ سخن کو، اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

سرائیکی	**اردو**
کیویں نَج کجاوے پاؤں	دُلہن کو کیسے کجاوے بٹھاؤں
گڈیاں کیوں پرناؤں	گُڑیا کی شادی کیوں کروں
اُدھڑ گئیں رنگین پڑوٹیاں	سرکنڈے پر کھجور کے پتوں سے بنائی گئی ٹوکری ٹوٹ گئی ہے
نہ باٹن نہ باٹن وچ کچور	اُبٹن اور اُبٹن کے مالیدے سے
خوشبو تھی گئی دور	خوشبو روٹھ گئی ہے

سرائیکی غزل میں شائستگی اور شگفتگی کا مزاج، اگرچہ اس وسیب کی اپنی قدروں سے جنم لے رہا ہے، مگر سرائیکی غزل میں مقصدیت کا پہلو، کہیں نہ کہیں مولانا حالؔی کے ان نظریات سے قریب ہے جو اُنہوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں بیان کیے۔ سرائیکی غزل کا ایک معتبر نام، ممتاز حیدر ڈاہر ہے۔ اُن کا انداز ملاحظہ فرمائیں:

چندر چندر چہرے ہُن، رات رات پہرے ہُن
تیئں جو، اوکوں مِلنا ہا، ہجھ دے نال آویں ہا

ترجمہ: چاند جیسے چہرے تھے، رات بھر کے پہرے تھے
گر ملن کی خواہش تھی، ساتھ آفتاب آتے

راقم کا ایک شعر دیکھیں:

میں ایں بھاہ نال جگ روشن کریساں
میکوں علمی انگارے راس آ گئین

ترجمہ: اس آگ سے میں دنیا روشن کروں گا
مجھے علمی انگارے راس آ گئے ہیں

سرائیکی غزل نے، نہ صرف اپنی اقدار اور لوک دانش کو سنبھالا ہوا ہے، بلکہ انہیں اپنی غزل میں برت کر، ان کی ترویج بھی کر رہی ہے۔ سرور کربلائی، اس وسیب کے نامور شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے:

جے وفاداری تعصب ہے تاں ایں مذہب کوں وَل
ساری دُنیا تے پیمبر، بن تے پھیلایا وَنج

ترجمہ: گر، وفاداری تعصب ہے تو، پھر اس دین کو
اِک پیمبر کی طرح، جگ میں اسے پھیلاؤ، سب

سرائیکی غزل وارداتِ قلبی سے خالی نہیں۔ مگر، حالؔی کے مطابق، اگر خیال اور الفاظ، اپنے پیرائے میں آئے ہیں، تو یہ مقتضائے حال ہونگے اور یہ نیچرل شاعری ہوگی۔ مولانا حالؔی کی، اس بات کو، شاکر تونسوی کی شاعری میں تلاش کرتے ہیں۔

محبت وِچ قدم رکھنا، کُئی آسان نئیں ہوندا
اُڈوں پتھر وی آ لگدن، جِڈوں امکان نئیں ہوندا

ترجمہ: محبت میں قدم رکھنا، کوئی آساں نہیں جاناں
وہیں سے سنگ آتا ہے جہاں امکاں نہیں جاناں

اس خطے کے مسائل کا ادراک کم و بیش تمام دانشور رکھتے ہیں۔ یہ مسائل کسی نہ کسی صورت یہاں موضوع بحث رہتے ہیں۔ ممتاز عاصم کا کہنا ہے کہ:

تس نئیں لیکھ نصیب ساڈا، بُرا، زور ڈڈھپ ہے
ڈاڈھا کوئی پیتی ویندے، روہی، تھل دا پانی (۹)

ترجمہ: پیاس ہمارا لیکھ نہیں ہے، محض زور و جبر ہے
زور آور، کوئی پی گیا ہے، روہی تھل کا پانی

نثر نگاری میں مولانا حالؔی کے تین بڑے مضبوط حوالے ہمارے سامنے آتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا حالؔی بطور مضمون نگار
۲۔ مولانا حالؔی بطور سوانح نگار
۳۔ مولانا حالی بطور محقق

> ”حالؔی کی نثر کا ایک نمایاں وصف، ان کی تحریر کا مناظرانہ انداز ہے۔ مناظرہ ان کا موضوعِ خاص ہے۔ اس موضوع نے ان کی نثر کو سادگی، سلاست اور دلیل کے قریب کر دیا۔ حالؔی کے یہاں ابتداء ہی سے اندازِ بیان کی وضاحت اور صفائی کی طرف رجحان ملتا ہے۔ ان کا یہی طرزِ تحریر، ملکی اور تمدنی ضرورتوں کے پیشِ نظر اور زیادہ واضح اور صاف ہوتا گیا۔“(۱۰)

حالؔی کی تحریر کردہ تین سوانح عمریوں کے علاوہ، ان کی تحریریں تریاقِ مسموم، اصولِ فارسی، مبادیِ علمِ جیولوجی ”تاریخ محمدی“ پر منصفانہ رائے، تذکرہ رحمانیہ، شواہد الالہام اور مجالس النساء وغیرہ کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ۱۹۳۵ میں حالؔی کے مقالہ جات کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ انہیں ہم علمی، ادبی اور سوانحی، موضوعات میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن ان کا مرکزی خیال قومی اور اخلاقی مسائل کی نشاندہی اور ان کا حل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالؔی کی نثر نے ہماری علمی ضرورتوں کا راستہ ہموار کیا اور ہمیں مدلل نثر سے روشناس کرایا۔ سرائیکی نثر نے بھی حالؔی کی ہی سادگی، سلاست اور دلیل کو چراغِ راہ کا درجہ دیا۔ سرائیکی نثر میں بھی یہ تینوں خوبیاں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ سرائیکی افسانے کے سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم اسلم رسولپوری لکھتے ہیں:

> ”سرائیکی ناول، افسانے اور ڈرامہ کے لکھاریوں کا تعلق چونکہ، سرائیکی وسیب سے ہے، اس لیے ہر لکھاری نہ صرف یہاں کے زمینی حقائق سے واقف ہے، بلکہ ان کا اور ان کے خاندان کا بھی، انہیں مسائل سے تعلق جڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کے زیادہ تر موضوعات اور ان کے کردار، اسی وسیب سے ہیں۔“(۱۱)

مختصر یہ کہ، سرائیکی ادب اور مولانا حالؔی کی تخلیقات کے تقابلی مطالعہ سے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگرچہ تمام سرائیکی شعروادب، براہِ راست، مولانا حالؔی سے متاثر نہیں ہے، مگر مولانا حالؔی کے مطالعہ نے اگر ایک عہد کے دانشوروں کو متاثر کیا ہے، تو اس نسبت سے مولانا حالؔی کے اثرات بالواسطہ طور پر، سرائیکی ادب میں ہمیں ضرور نظر آتے ہیں۔ اور مولانا حالی کی تحریروں کی مقصدیت اور مدلل پن، کسی نہ کسی صورت میں، سرائیکی ادب میں، آج بھی رواں دواں نظر آتا ہے اور اپنا جادو جگا رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ دہلی مرحوم کا مرثیہ۔ مضمون مشمولہ ”لیل ونہار“ مئی ۱۹۵۷، ص ۵۷،

۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۸، ص ۳۳۲

۳۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر۔ ص۔ ۳۳۷
۴۔ عبدالسلام ندوی۔ شعرالہند۔ جلد اول۔ اعظم گڑھ، ص ۳۸۶
۵۔ گارساں دتاسی۔ مقالات حصہ دوم، مقالہ ۱۸۷۴۔ کراچی ۱۹۷۵، ص۔ 35
۶۔ حالیؔ الطاف حسین۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ کراچی، ۱۹۶۸، ص ۱۹۴
۷۔ ڈاکٹر گل عباس اعوان۔ جدید سرائیکی شاعری (تنقید تے تحقیق)۔ جھوک پبلشرز ملتان، ۲۰۱۴، ص ۳۹
۸۔ ڈاکٹر گل عباس اعوان۔ سوجھل خواب۔ جھوک پبلشرز ملتان، ۲۰۰۹
۹۔ ڈاکٹر حمید الفت ملغانی۔ لکھت تے لکھاری۔ سرائیکی ادبی بورڈ ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲
۱۰۔ سید فیاض محمود (گروپ کیپٹن، ناشر) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند۔ جلد نہم طبع اول ۱۹۷۲، ص ۱۱۷
۱۱۔ اسلم رسولپوری، سرائیکی ادب وچ معنی دا پندھ، سرائیکی پبلی کیشنز، رسول پور (ضلع راج پور) ۲۰۱۴، ص ۳۷۷

☆☆☆☆

محمد پناہ بلوچ

الطاف حسین حالی کے بلوچی ادب پر اثرات

بلوچی زبان میں قدیم حوالوں سے لوک ادب اور کلاسیکی ادب میں انسانی عظمت، بہادری، نیکی اور رواداری کے موضوعات کو اولیت دی جاتی رہی ہے۔ خاص طور پر اُن رجحانات کو برتنے میں فنکارانہ حُسن نمایاں دکھائی دیتا ہے جن میں ملی جذبہ مذہبی اعتبار سے احترامِ آدمیت اور محبت کے مقام کو مجازی سے حقیقی کے سفر تک لے جانے کا رجحان نمایاں دکھائی دیتا رہا ہے۔ بیسویں صدی میں جہاں زندگی میں نئے پہلوؤں کی آمد آمد ہوئی، وہیں اس رویے کو انگریزی اور اردو سے لے کر ہماری ثقافتی، تہذیبی اور ادبی دُنیا نے بھی اپنایا۔ بلوچی ادب کے شعروسخن کے متوالوں نے ملی، مذہبی اور نئی دنیا کے رجحانات سے منسلک ادب کو زمین سے محبت، صوفیانہ حوالوں سے ایک خدا کی عقیدت اور تابع داری سے مشروط زندگی اور اضافے کے اعتبار سے تبدیل ہونے والی زندگی کے اثرات سے مزین خیالات، احساسات وجذبات، تجربوں اور مشاہدات کی دنیا کو قاری تک مؤثر انداز میں سامنے لانے کی تگ ودو کی۔

الطاف حسین حالی غالباً پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے شعوری طور پر اردو شاعری میں مقصدیت کو فروغ دیا اور اس کے عملی نمونے بھی خود مہیا کیے۔ چوں کہ ہمارے ہاں کے بلوچی شاعر بھی کسی نہ کسی حد تک اردو ادب سے شغف رکھتے تھے اس لیے ان کی مقصدیت کے اثرات لامحالہ طور پر بلوچی ادب پر بھی پڑنے تھے۔ دیگر وجوہات کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ حالی سے پہلے بھی بلوچی زبان میں حریت پسندی اور حب الوطنی کی لہریں موجود تھیں۔ گویا مقصدیت کا بیج ایک ایسی کھیتی کو میسر آ گیا تھا جو پہلے ہی اس حوالے سے زرخیز تھی۔

مولانا الطاف حسین حالی، بلوچی زبان میں اپنے موضوعات لیے سب سے زیادہ یوسف عزیز مگسی کی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں۔ یوسف عزیز مگسی نے مولانا حالی کے زیرِ اثر بلوچی شاعری کو موضوعات کے حوالے سے بہت تنوع بخشا۔ اس کے علاوہ محمد حسین عنقا، مٹھا خان مری، بیر محمد زبیرانی اور غوث بخش صابر کی

تحریروں پر بھی مولانا الطاف حسین حالی واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

الطاف حسین حالی کے بلوچی زبان و ادب پر اگر اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ ان کی مقصدیت کے اثرات کہیں کہیں ظفر علی خان اور علامہ محمد اقبال کی وساطت سے بھی پڑے۔

قدیم بلوچی ادب میں بھی بلوچی ادب میں موضوعات کا بے حد تنوع موجود ہے۔ اس میں اگر ایک طرف تلواروں کی جھنکار ہے دوسری طرف مہر و محبت سے لبریز دلوں کی پکار بھی موجود ہے۔ کامیابی کی فتح کا جشن بھی ہے اور ناکامی و مایوسی کی آہ اور موسم بہار کی چاہ بھی ہے۔ یہ ادب پہاڑوں، وادیوں، دشت و صحرا میں ہزار ہا سال سے آباد بلوچوں کی طرز زندگی، تہذیبی سفر، طرز معاشرت، ارد گرد و بود و باش رکھنے والے چرند پرند کے علاوہ موسمی تغیرات، بادل، کہر، بارش، بجلی کی چمک، گھنگھور گھٹاؤں کی کڑک، تند و تیز آندھی، طوفان، بپھرے ہوئے پہاڑی ندی و نالوں کا شور، میدانوں میں سراب کی کیفیت، موسم بہار کے پر کیف نظاروں، سبز گھاس، جنگلی جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں کی دلکش مہک، پھلوں و میوہ جات کی چاشنی، موسم گرما کی شعلہ برساتی ہوئی لو، سردیوں کے موسم میں شمال کی جانب سے سرد ہوا گورپچ جو ہڈیوں کے گودے تک جما دیتی ہے۔ قدرت کے وہ تمام مناظر، سماجی، سیاسی، معاشی عدم توازن، قبائلی دشمنیاں اور ان کے اثرات، طبقاتی ظلم و جبر، غیروں کے زور آوریاں، اپنوں کی چیرہ دستیاں، طالع آزماؤں اور دور اندازیوں کے منظر اپنے سامنے دیکھتے ہوئے اس صورت حال کو اپنی تشبیہوں، استعاروں، خیالات، نظریات کے پیکر میں ڈھال کر نہایت خوبصورتی سے سامنے لاتا ہے۔

انگریزوں کی برصغیر میں آمد، پھر بلوچستان میں مداخلت، یہاں پر قبائلی و چند دیگر علاقوں کو اجارہ پر لے کر ایجنسی بلوچستان کے نام سے انتظامی ڈھانچے کے قیام کے بعد ۱۸۷۷ء میں اپنے ہندوستانی اہلکاروں کی آسانی کے لیے اردو کو دفتری خط و کتابت کی زبان قرار دینے کے بعد یہاں فارسی کی جگہ اردو کے استعمال۔ اسی طرح انگریزوں کے خلاف خان محراب خان شہید، میر بجار خان ڈومکی، خان نصیر خان دوئم، سردار نورنگ خان بزدار، میر آزاد خان نوشیروانی، میر غلام حسین مسوری بگٹی، میر بلوچ خان نوشیروانی، سردار جلیل خان گمشادزئی، سردار نورالدین مینگل، سردار خیر بخش تمنداری مری (اول)، میر خداداد خان بجارانی شہید وغیرہ کی بلوچستان کے مختلف علاقوں میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت، جن میں بہت سے اکابرین کی شہادت جیسے واقعات نے یہاں پر ملی جذبات کو فروغ دیا۔ برصغیر میں انگریزوں کے خلاف جاری لہر نے ان علاقوں میں

اس جدوجہد میں شریک تمام تحریکوں کے درمیان فطری اتحاد کی فضا قائم کی۔ ایسے میں الطاف حسین حالی کی بامقصد ادب کی تحریک نے اس حریت پسندی اور حب الوطنی کی شدت میں مزید اضافہ کیا اور یوں بلوچی ادب کو مالا مال کیا۔ لہٰذا یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ بلوچی ادب میں خودداری، انانیت، وطن دوستی، حب الوطنی کا جو عنصر نظر آتا ہے اس میں حالی کے اثرات پورے جوبن پر ہیں۔

بعد کے ادوار میں برصغیر کے سیاسی، علمی، ادبی اور صحافتی روابط بڑھنے لگے۔ ان روابط کی وجہ سے نزدیکیاں پیدا ہونے لگیں۔ بلوچستان کی ایک نامور شخصیت میر عبدالعزیز کرد کے ایک مضمون کے مطالعہ کرنے کے بعد دریافت کیا گیا کہ: ”کیا کسی کو معلوم ہے کہ میر عبدالعزیز کس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں“۔ یہ معلوم ہونے پر کہ وہ بلوچستان کے ہی ایک پرائمری پاس شخص ہیں تو پنڈت نہرو نے کہا ”انہیں یہ سن کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے (میر عبدالعزیز) تجربات، اور مشاہدت سے جو کچھ سیکھا ہے وہ دنیا کی کوئی یونیورسٹی انہیں نہیں سکھا سکتی۔“ اس طرح بلوچوں میں جدید سیاست کے محرک نوجوان رہنما میر یوسف عزیز مگسی کی حریت پسندانہ جدوجہد کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے یوں فرمایا:

تم کو خفی عزیز ہے ہم جو جلی عزیز
عارض کا گل تمھیں، ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظِ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

بلوچستان کے اہل قلم کی برصغیر کے اہل سخن کے ساتھ فکری ہم آہنگی اور نزدیکیوں نے ایک دوسرے پر بہت سے اثرات مرتب کئے ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی بے عمل اور جامد علماء کی دھجیاں بکھیرتے، جھوٹے پیروں، مشائخ کی برائیاں عیاں کرتے، عیش پرست اور نکمے امیروں کا خاکہ اڑاتے، جھوٹے خوشامدی، شاعروں کی ہجوگیری کرتے، قوم کی غیرتی رگ کو حرکت میں لانے، ہر طبقے کے عیوب اور کمزوریوں کے راز فاش کرتے، تاریخی واقعات کا بیان کرتے، زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ بلوچی ادب کے حوالے سے جب انگریز دور پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اس دور میں میلان تصوف، اخلاقیات کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اس دور میں وہ روحانیت اور تصوف میں قلبی سکون حاصل کرنے لگتا ہے۔ اخلاقیات کا سبق سکھانے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے اس دور میں

شاعری میں زیادہ مذہبی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ نعتوں، معجزوں، اور مدحتوں کا منظوم ذخیرہ ملتا ہے۔

تاہم انگریز کی آمد کے ابتدائی خوف سے نکلنے اور یہاں کے متعدد علاقوں میں ان کے ساتھ مزاحمتی لڑائیاں بلوچی ادب میں ایک حریت پسند، رزمیہ اور مزاحمتی شاعری کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں اکثر شعرا نامعلوم نظر آتے ہیں۔ تاہم اسی دور میں رحم علی مری کھل کر مریوں کی جانب سے انگریز کے خلاف رزمیہ شاعری کے ذریعے قومی جذبات ابھارتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ملا محمد حسن لاٹ کی بگٹی کے واقعہ کو شعری قالب میں ڈھال کر انمول دستاویز مرتب کر دیتا ہے۔ اسی دور میں بلوچ معاشرے میں صدیوں سے قائم جمہوری طریقہ، سردار کو منتخب کرنے کے مہذب طریقہ کار کو تبدیل کر کے سرداروں، نوابوں اور میروں (یعنی اپنے بہی خواہوں) کو خطابات سے نوازنے اور جدی پشتی سردار بنانے کے حوالے سے انگریز اپنی سی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یوں صدیوں سے قائم بلوچ معاشرتی آداب، رسوم و رواج، رہن وسہن اور اخلاقیات کے نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس صورت حال سے بلوچی زبان کا ادیب متاثر ہوتا نظر آتا ہے اور میرے خیال میں اس میں بھی کسی نہ کسی سطح پر جا کر حالی کے اثرات کی کارفرمائی شامل ہے۔

☆☆☆☆

اسداللہ اسد

الطاف حسین حالی کے پشتو ادب پر اثرات

زبانیں بھی انسان کی طرح ہر دہائی میں اپنے اندر کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور دیکھتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ زبانوں پر دوسری زبانوں کے اثرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ایک بڑا لکھاری کسی ایک زبان کا نہیں بلکہ ہر زبان کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم شیکسپیئر، افلاطون، ارسطو اور ٹالسٹائی کے ناموں سے ایسے واقف ہیں جیسے مغربی دنیا اقبال، غالب، فیض یا کسی بھی بڑے اردو شاعر کے نام اور کام سے آشنا ہے۔

پاکستان کی تمام زبانوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ لیا۔ سب علاقائی زبانوں میں ایسے لکھاری پیدا ہوتے رہے جن کی تخلیق ہر زبان اور ہر قوم کے لیے ضروری قرار پائی اور وہ ترجمہ ہوتے گئے۔

اردو چوں کہ سب کی زبان ہے، اس لیے ہر علاقائی زبان نے اس سے رابطہ استوار رکھا۔ اگرچہ ایک بہت بڑے طبقے کو اردو میں لکھے گئے کلام کے ترجمے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن دیہی علاقوں میں رہنے والوں کو اپنی زبان میں زیادہ مٹھاس اور اثر محسوس ہوتا ہے۔

پشتو میں شاعری تو بہت پہلے شروع ہوئی اور تقریباً ۱۲۰۰ سال پہلے امیر کروڑ کا دیوان شائع ہو چکا تھا۔ پشتو کی ابتدائی شاعری سے لے کر انیسویں صدی تک فارسی کا اثر غالب رہا۔ وہ تو شاید اردو پر بھی تھا۔ پشتو کے تقریباً تمام کلاسیکی شعرا نے فارسی میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ مگر انیسویں صدی کے اواخر میں اردو شاعری جب بامِ عروج پر پہنچی تو پشتو زبان و ادب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ اردو لینے لگی اور بیسویں صدی میں پشتو پر اردو کا اثر کسی بھی دوسری زبان سے زیادہ ہو گیا۔ اردو کے تمام بڑے شعرا کے ترجمے پشتو میں ہونے لگے اور انہیں پسند بھی کیا جانے لگا۔

مولانا الطاف حسین حالی دو وجوہات کی بنا پر پشتونوں میں مقبول ہیں۔ ایک تو جس قسم کی شاعری انھوں نے کی ہے، وہ پشتو شاعری کا لہجہ رہا ہے۔ یعنی مقصدیت اور اسلام پسندی اور دوسرا ان کا مسدس۔

پشتون علاقے میں اب بھی بزرگوں کے پاس دینی کتابیں اور اسلامی تاریخ کے کچھ نسخے پڑے ہوتے ہیں اور مسدسِ حالی کی ایک خاص اہمیت یہاں کے مدارس اور دوسری دینی درسگاہوں میں آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔

الطاف حسین حالی کا اثر پشتو پر اتنا نمایاں اس لیے محسوس نہیں ہوتا کہ پشتو شاعری کا یہ مزاج بہت پہلے سے رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حالی کا اگر ترجمہ ہوا بھی تو وہ اس زبان کے عین مطابق تھا

حالی پشتو میں ۱۸۹۳ء میں آئے۔ غلام محمد پوپلزئی نے مسدس کا منظوم ترجمہ کیا۔ پوپلزئی صاحب الطاف حسین حالی کے دوست تھے اور ان کے کہنے پر ہی یہ ترجمہ کیا گیا۔ اگرچہ وہ کتاب صرف ایک دفعہ ہی چھاپی گئی اور اس وقت سوائے ایک دو لائبریریوں کے کہیں بھی دستیاب نہیں مگر اس کے کچھ اشعار مختلف ریسرچ پیپرز اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

الطاف حسین حالی نے خود وہ کتاب افغانستان بھیجی اور ساتھ ہی اس وقت کے حکمران کو ایک خط بھی بھیجا تھا۔ غلام محمد پوپلزئی چوں کہ حالی کے قریب رہے تھے، اس لیے انھوں نے ترجمے کا حق خوب ادا کیا۔ ابتدا کے کچھ بند تو بہت ہی سلیقے سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

پشتو میں تخلیقی کام تو بہت ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن تنقیدی اور تحقیقی کام اس معیار کا نہیں جو اس زبان کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیبر پختونخواہ میں شاعری پر لکھی گئی کتابوں میں سب سے زیادہ اہمیت ''مقدمۂ شعرو شاعری'' کو دی جاتی ہے اور سب سے مستند مانی جاتی ہے۔

سید رسول رساؔ نے پشتو شاعری کے اصولوں اور قواعد پر بہت کام کیا۔ ان کی مشہور کتاب ''ادبی تنقید'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مقدمۂ شعرو شاعری سے کتنے متاثر تھے۔ اس کتاب میں رساؔ صاحب کا لہجہ اور انداز وہی رہا ہے جو الطاف حسین حالی کا مقدمۂ شعرو شاعری میں ہے۔

ٹپہ پشتو کی ایک ایسی صنف ہے جو مقبولِ خاص و عام ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو شاعر نہیں ہیں لیکن انھوں نے ٹپہ لکھا ہے۔ حالاں کہ ٹپہ ایک خاص وزن میں لکھا جاتا ہے۔

پشتو میں بے شمار ٹپے لکھے گئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ٹپوں کے شاعروں کا پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ بہت کم شعرا ٹپہ کو اپنی کتاب میں جگہ دیتے ہیں۔ دو ٹپے میں نے ایسے سُنے جو الطاف حسین حالی کے شعروں کے ہو بہو ترجمے ہیں:

په سپین سحر می سلام وایه
دخوانی شپو ته الوداع وایه بوډا شوم
ترجمہ: اے بیاضِ صبحِ پیری السلام
اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

اور دوسرا:

څکه دعا می نه قبلیږی
چی زړه می نه غواړی او مینه هیرومه
ترجمہ: ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

موجودہ پشتو شعرا میں اردو کلاسیکی شعرا پر سب سے زیادہ کام سلطان **فریدی** نے کیا۔ غالب، اقبال اور حالی پر اُن کا کام کافی زیادہ ہے۔ لیکن الطاف حسین حالی کا ترجمہ انھوں نے "**دروغ رجتیا** " کے نام سے شائع کیا جس میں ۲۵ غزلیں اور کئی نظمیں موجود ہیں۔ جس میں "**شعر کی طرف خطاب**" بھائی امداد حسین کا مرثیہ کافی مشہور بھی ہوئیں۔ سلطان **فریدی** چوں کہ اردو اور پشتو دونوں زبانوں پر ایک جیسی مہارت رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے ترجمے کا پورا حق ادا کیا۔ اور یہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا کہ اگر حالی یہی اشعار پشتو میں کہتے تو یوں ہوتے:

ملامت په بل وئیل څو مره اسان دی
لټول دخپلو عیبو دومره ګران دی

سلطان **فریدی** کے اس ترجمے پر پروفیسر داور خان داؤد نے ریڈیو پر ادبی پروگرام بھی کیا تھا اور اس کوشش کو کافی سراہا گیا تھا۔ حالی کی غزل "**اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے**" کا ترجمہ بہت ہی نفاست سے کیا گیا ہے اور **فریدی** صاحب نے مضمون کو روح سمیت منتقل کیا ہے۔

حالی اپنے موضوعات کے اعتبار سے پشتو شاعری کے کافی قریب ہیں۔ خاص طور پر پشتو کی ابتدائی شاعری میں وہی مقصدیت پائی جاتی ہے جو حالی کے ہاں ہے۔

مولانا ابراہیم فانی جو پشتو، اردو، فارسی اور عربی کے عمدہ شاعر اور محقق تھے، الطاف حسین حالی سے

کافی متاثر تھے۔ ان کی اردو اور پشتو کی لغت میں کافی جگہ حالی کا اثر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی پشتو غزلوں کے بعض مصرع بھی ایسے ہیں جہاں پر حالی کا رنگ نظر آتا ہے۔ حالی کی پسندیدہ غزلوں میں ایک الطاف حسین حالی کا ''الوداع اے زندگانی الوداع'' بھی ہے۔

یہ غزل بعض دوسری جگہوں پر بھی نظر آتی ہے اور اسی ردیف میں پشتو کی ایک اور غزل موجود ہے۔

دزړه سره الوداع

همسفره الوداع

دحالي وينا منم

زم په بره الوداع

یہاں شاعر نے حالی کے ذکر کے ساتھ اس کی تعریف بھی کی ہے۔ ایک دوسری جگہ شاعر نے حالی اور مسدس کے تعریف یوں کی ہے کہ:

که حالي پرې مسلس ليکلے نه ولے

نو تاريخ دمسلمان به اسان نه وه

ترجمہ: اگر حالی مسدس نہیں لکھتا تو اسلام کی تاریخ بہت سے لوگوں کے لیے آسان نہیں ہوتی۔

☆☆☆☆

الطاف حسین حالیؔ

بیانِ حالی

”میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بہ مقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی۔ اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تختِ دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام، جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابوایوب انصاریؓ تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے محمود شاہ انجو ملقب آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراقِ عجم کا فرماں رواں تھا، پہنچتا ہے۔ چوں کہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد، علماء و شعراء و دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا، اس لیے اکثر اہلِ علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چناں چہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سوادِ قصبۂ پانی پت میں بطورِ مددِ معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے اُن کو عنایت کی اور منصبِ قضاء و صدارت و تشخیصِ نرخ بازار اور تولیت مزاراتِ آئمہ جو سوادِ پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین اُن سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جواب تک ایک محلّہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی، جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور رہیں، بیٹی تھیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے سنِ کہولت میں انتقال کیا۔ جب کہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ

تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ وطب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اُن کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انھی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ اُن سے صرف ونحو پڑھی مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بہ منزلہ والدین سمجھتا تھا، تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں، مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔ اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو ونما پائی تھی، وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء ’بہلے‘ کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب وروز رہنا پڑا، وہاں کے مدرس اور طلبا، کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے (اس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے، جیسے مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح مسلم، ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار وناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن ۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عمل داری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بیکاری کی حالت میں گزرے۔ اس

عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا، مولوی عبدالرحمان، مولوی محبت اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا، اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسداللہ خان غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر اُن کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے، ان کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ”اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔“ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خان مرحوم، رئیسِ دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر، سے جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے، شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بہ طور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے، اس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بہ مراتب بلندتر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھی کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و صلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا، منتہائے

کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعے سے بہ خوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا، انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا:

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے، اُن کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس تک میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایماء سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں، ایک ‘برسات’ پر دوسری ‘امید’ پر تیسری ‘رحم و انصاف’ پر اور چوتھی ‘حب وطن’ پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کے مدرس پر بدل آیا۔ یہاں آکر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اس طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی، لکھی۔ پھر سر سید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی۔ چنانچہ میں نے اول مسدس مدوجزرِ اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھیں ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب ‘تریاق مسموم’ ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا، لکھی تھی جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی (علم طبقات الارض) میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی۔ اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائیٹ (حقِ تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چناں چہ

ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں موسوم بہ ’مجالس النساء‘ لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروگ کے ہاتھ سے چار سو روپے نقد انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارسِ نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام ”حیاتِ سعدی“ ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط ایسے (Esssay) لکھ کر بہ طور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں اُن کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے، ”یادگارِ غالب“ کے نام سے لکھ کر شائع کی اور اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ ”حیات جاوید“ جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے، لکھی ہے جو اُمید ہے کہ مارچ اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس، مضمون بھی مختلف عنوانات پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم، میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان سے کم ہونے لگا ہے، اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ میں جب کہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظے کے لیے سر سید احمد خان کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بہ صیغۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ، تعدادی ۷۵ روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ میں سر سید مرحوم کے ہمراہ بہ شمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ، حیدر آباد گیا تھا، اس وظیفے میں ۲۵ روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکہ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بہ ماہ سرکارِ عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک سکول کا قطع تعلق کر لیا ہے۔

الطاف حسین حالی

دیوانِ حافظ کی فالیں

خواجہ حافظ کے دیوان میں فال دیکھنے کا رواج اور اُس کی فالوں کے سچا ہونے کا اعتماد جیسا کہ ہندوستان یا ایران کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے، ایسا ہی کم وبیش اُن تمام ممالکِ اسلامیہ میں سنا گیا ہے جہاں فارسی زبان بولی یا پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔

خواجہ حافظ کی عموماً یہ ایک کرامت سمجھی جاتی ہے کہ اُن کے دیوان کو بند کر کے جب ایک خاص طریقے سے کھولا جاتا ہے تو جو شعر صفحے کے سرے پر نکلتا ہے وہ صراحتاً یا کنایتاً اس امر کے متعلق، جس میں تردد ہے، صاف خبر دیتا ہے کہ وہ امر واقع ہوگا یا نہیں، یا اس کا نتیجہ خواہش کے موافق ہوگا یا مخالف، یا فال دیکھنے والے کا خیال اُس کی نسبت صحیح ہے یا غلط؟ چناں چہ اسی بنا پر دیوان مذکورہ کو لسان الغیب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

دیوان حافظ کی بعض فالیں جو سچی نکلیں:

صدہا واقعات کی نسبت مشہور ہے کہ دیوان مذکور میں فال دیکھی گئی اور اُس کے مطابق ظہور میں آیا۔

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ جلال الدین اکبر اور سکندر لودھی کی لڑائی سے پہلے دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا؟ اُس میں یہ شعر نکلا:

سکندر را نمے بخشند آبے
بہ زور و زر میسر نیست ایں کار

چناں چہ سکندر کو شکست ہوئی اور اکبر فتح یاب ہوا۔

ایک تعجب انگیز واقعہ مشہور ہے کہ کوئی قیمتی جواہر یا زیور گم ہوگیا تھا، رات کے وقت اُس کو چراغ کی روشنی میں تلاش کر رہے تھے کہ دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی تو سر صفحہ یہ بیت برآمد ہوئی:

بفروغ چہرہ زلفش رہ دیں زندہ ہمہ شب
چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

چناں چہ جس خادم کے ہاتھ میں چراغ تھا اُس کے پاس سے وہ گم شدہ جواہر برآمد ہوا۔

اسی قسم کے بعض واقعات ہم نے ایسے معزز ذریعوں سے سنے ہیں جن میں بناوٹ کا مطلق احتمال نہیں ہوسکتا۔

میرے بڑے بھائی کو جب کہ وہ پولیس میں ملازم تھے، اکثر بیمار رہنے کے سبب سروس (ملازمت) کے پورا ہونے سے پہلے پنشن لینے اور ڈاکٹر کا معائنہ کرانے پر مجبور کیا گیا تھا، مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ جب سروس پوری ہو جائے اُس وقت خود درخواست کر کے پنشن لی جائے۔ چناں چہ ڈاکٹری معائنے کی تاریخِ معین سے ایک دن پہلے انھوں نے دیوانِ مذکور میں فال دیکھی تو صفحے کے سرے پر یہ بیت نکلی:

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ روے خوب تو دیدم جواں شدم

انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈاکٹر میری خواہش کے مطابق رائے دے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

بعض فالیں ایسی بھی سنی گئی ہیں جن سے اگرچہ زمانۂ مستقبل کی نسبت کوئی پیشین گوئی مفہوم نہیں ہوتی مگر فال دیکھنے والے کی سرگزشت اور زمانۂ ماضی کے برتاؤ کی طرف ایک لطیف اشارہ مستنبط ہوتا ہے۔

ایک نہایت باخدا اور صاحبِ نسبت امیر نے اپنی سرگزشت خود مجھ سے بیان کی کہ عنفوانِ شباب کی غفلت و بدمستی کے زمانے میں کبھی کبھی اپنی حالت پر سخت افسوس اور انفعال ہوتا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی غفلت کا پردہ پڑ جاتا تھا۔ ایک روز ساری رات لہو و لعب میں گزری، جب صبح ہوئی تو سخت ندامت و انفعال دامن گیر ہوا اور یہ خیال دل میں گزرا کہ آخر کبھی اس سے نجات بھی ہوگی یا نہیں؟ اس بے چینی میں دیوان حافظ کو کھول کر دیکھا تو اس میں پہلا شعر یہ نکلا:

وظیفۂ شب دوشیں گر زیادت رفت
کہ بامداد بطرز دگر بر آمدہ

سب سے زیادہ عجیب وہ فال ہے جو شیخ علی حزین کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ غزل میں اپنے نزدیک خواجہ حافظ کا تتبع کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک دن اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مجھے اس تتبع میں

کہاں تک کامیابی ہوئی ہے؟ اُس نے دیوان حافظ میں فال دیکھی، اُس میں چھوٹتے ہی یہ بیت نکلی:

کے شعرِ تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد
یک نکتہ ازیں دفتر گفتیم و ہمیں باشد

یہ اور اسی قسم کی بے شمار فالیں مشہور ہیں جو خواجہ حافظ کی کرامت سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ہم اُن لوگوں کے اعتقاد پر جو خواجہ حافظ کی اس کرامت کے قائل ہیں، اعتراض کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی اس موقع پر ہمارا یہ مقصد ہے کہ نفس کرامت کے امکان یا امتناع پر بحث کریں، بلکہ صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ جن اسباب سے خواجہ حافظ کے کلام کو یہ درجہ حاصل ہوا ہے، اُن میں کوئی غیر معمولی کرشمہ نہیں ہے۔

خواجہ حافظ کی غزلیات میں اعلیٰ درجے کے حسنِ بیان کے علاوہ سب سے بڑی چیز جس نے اُن کو مقبولِ خاص و عام بنا دیا ہے، وہ عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے پیرائے میں ادا کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر ملک میں شائع ہوئیں تو باوجود یہ کہ اشاعت کے ذریعے اُس وقت نہایت محدود تھے، تاہم تمام ملک میں گھر گھر اُس کے نسخے پھیل گئے اور ہر طبقے نے اُس کو اپنا حرزِ جاں بنا لیا۔ جس طرح آزاد طبع نوجوان قہوہ خانوں اور تفریح کے جلسوں میں اس سے صحبتیں گرم کرتے تھے، اسی طرح مشائخ اور اہل اللہ حال و قال کی مجلسوں میں اس پر وجد کرتے تھے۔ جس طرح وہ درویشوں کا مونس و ہم دم تھا اسی طرح بادشاہوں اور امیروں کا تعویذ بازو تھا۔

ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت میں آیندہ کا حال قبل از وقت دریافت کرنے کی طرف قدرتی میلان ہے اور اس قدرتی میلان کا نتیجہ ہے کہ اُس نے نجوم و رمل و جفر اور فال اور شگون اور بعض دیگر وسائل مستقبل کا حال دریافت کرنے کے لیے بہم پہنچائے ہیں۔

اسی کے ساتھ اُس کی فطرت میں دوسری خاصیت یہ ہے کہ جس چیز یا جس شخص کے ساتھ اس کو عقیدت ہوتی ہے اُس سے خود بخود دل میں غیر معمولی کرشمے ظاہر ہونے کی توقع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اُس سے جو کچھ عادت مستمرہ کے موافق ظہور میں آتا ہے، اُس کو بھی اکثر فوق العادت کرشموں پر محمول کر لیتا ہے۔

خواجہ حافظ کا دیوان چوں کہ متصوفانہ کلام پر مشتمل ہے اس لیے اس میں مذہبی عقیدت کا ایک زبردست پہلو موجود تھا اور ہر طبقے کے لوگ اُس کو ایک عارف کا کلام سمجھ کر متبرک خیال کرتے تھے، اس لیے ضرور کسی نہ کسی وقت دنیا داروں کے گروہ میں جو ہر وقت اپنی گوناگوں خواہشوں کے پورا ہونے کی دُھن میں

رہتے ہیں، خواجہ حافظ کے کلام سے تفاول کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوگا اور حسنِ اتفاق سے ایک دو بار جو کچھ فال میں نکلا اُس کے مطابق ظہور میں آیا ہو گا۔ لیکن یہاں تک کوئی بات ایسی نہ تھی جس کو ایک غیر معمولی کرشمہ ماننے کی ضرورت ہو گر چوں کہ انسان بالطبع عجائب پسند ہے اس لیے وہ ہمیشہ ایسے اتفاقات کو غیر معمولی کرشموں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ دیوان مذکور میں فال دیکھنے کی بنیاد اسی طرح پڑی ہے مگر اس کے بعد خود اُس کی شاعری اور طرزِ بیان نے اس خیال کو بہت کچھ مدد پہنچائی۔ وہ عام شعرا کی طرح ان مستثنٰی حالتوں سے کبھی تعرض نہیں کرتا جو دنیا میں نادر الوقوع ہیں بلکہ ہمیشہ نیچرل جذبات اور معمولی خواہشوں اور امیدوں اور عام معاملات اور واقعات کی تصویر کھینچتا ہے اور اُس کے الفاظ ایسے حاوی اور لچک دار ہوتے ہیں کہ ہر ایک شعر میں متعدد پہلو نکل سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

مومن کے سوانحی حالات

ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نام دار خاں شہر کے شرفا میں سے تھے (جن کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی) اول حکیم نام دار خاں اور حکیم کام دار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں (دہلی) آ کر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلامہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی۔ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے اُن کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن وراثتاً حکیم نام دار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ اس میں سے ایک چوتھائی اُن کے والد کو اور ان کے بعد اس میں سے ان کا حصہ ان کو ملتا رہا۔

ان کی ولادت ۱۲۱۵ہجری میں واقع ہوئی۔ بزرگ جب دلی میں آئے تو جیلوں کے کوچے میں رہے تھے۔ وہیں خاندان کی سکونت رہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا۔ ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آ کر کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو پسند نہ کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے نام پایا۔

بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے، فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہٖ اسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھی کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔

نیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر جمنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کیے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اس کو اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے، پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھیں۔ جب کوئی سوال پیش کرتا، نہ زائچہ کھینچتے، نہ تقویم دیکھتے، پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو، جو میں کہتا جاؤں، اس کا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔

ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ ان کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اُس وقت موجود تھے۔ خاں صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟ اس نے کہا “صاحب میں لٹ گیا” کہا “خاموش رہو۔ جو میں کہوں، اسے سنتے جاؤ۔ جو غلط بات ہو اس کا انکار کر دینا” پھر پوچھا “کیا زیور کی قسم سے تھا؟” “صاحب ہاں وہی عمر بھر کی کمائی تھی۔” کہا “تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے، کوئی غیر چرانے نہیں آیا۔” اس نے کہا “میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا، ہم کیوں چراتے۔” ہنس کر فرمایا “کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر نہیں گیا۔” اس نے کہا “صاحب! سارا گھر ڈھونڈ مارا، کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔” فرمایا “پھر دیکھو۔” گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آ کر کہا “صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے، ایک ایک کونا دیکھ لیا، کہیں پتا نہیں لگتا۔” خاں صاحب نے کہا “اسی گھر میں ہے، تم غلط کہتے ہو۔” کہا “آپ چل کر تلاشی لے لیجیے، میں تو ڈھونڈ چکا۔” فرمایا “میں یہیں سے بتاتا ہوں۔” یہ کہہ کر اس کے سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔ وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا “اس گھر میں جنوب کے رخ ایک کوٹھڑی ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے۔ اس کے اوپر مال موجود ہے، جا کر لے لو۔” اس نے کہا “مچان کو تین دفعہ چھان مارا، وہاں نہیں ملا۔” فرمایا “اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔” غرض وہ گیا اور جب روشنی کر کے دیکھا تو ڈبا اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا۔

ایک صاحب کا مراسلا اسی تحریر کے ساتھ مسلسل پہنچا ہے جس میں یہ اور اسی قسم کے کئی اسرار نجومی، ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ آزاد ان کے درج کرنے سے قاصر ہے۔ معاف فرمائیں، زمانہ ایک طرح کا نہیں ہے، لوگ کہیں گے کہ تذکرۂ شعرا لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا

تذکرہ لکھنے لگا۔

خاں صاحب نے اپنی نجوم دانی کو ایک غزل کے شعر میں نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے:

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

شعر وسخن سے بھی انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا، مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا۔

ان کے نامی شاگرد:

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ صاحب تذکرہ "گلشن بے خار" خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خان مظفر جنگ بہادر رئیس پلول اور ان کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں کہ ہ برس ہوئے راولپنڈی میں دنیا سے انتقال کیا۔ میر حسین تسکین کہ نہایت ذکی الطبع شاعر تھے۔ سید غلام علی خاں وحشت، غلام ضامن کرم، نواب اصغر علی خاں کہ پہلے اصغر تخلص کرتے تھے، پھر نسیم تخلص اختیار کیا اور مرزا خدا بخش قیصر شہزادے وغیرہ اشخاص تھے۔

رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ، سر پہ لمبے لمبے گھونگروالے بال اور ہر وقت انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا، ڈھیلے ڈھالے پائنچے، اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ ایسی دردناک آواز سے، دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں۔ باوجود اس کے نیک خیالوں سے بھی ان کا دل خالی نہ تھا۔ نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسماعیل صاحب کے پیر تھے۔ خاں صاحب انہی کے عقائد کے قائل رہے۔

انھوں نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ ہاں راجا چیت سنگھ برادر راجا کرم سنگ رئیس پٹیالہ،

جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں، وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سرِ راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے، خاں صاحب کا اُدھر سے گزر ا ہوا۔ لوگوں نے کہا "مومن خاں شاعر یہی ہیں۔" راجا صاحب نے آدمی بھیج کر بلوایا، عزت و تعظیم سے بٹھایا (کچھ نجوم، کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں) اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ۔ ہتھنی حاضر ہوئی، وہ خاں صاحب کو عنایت کی۔ انھوں نے کہا کہ مہاراج! میں غریب آدمی ہوں، اسے کہاں سے کھلاؤں گا اور کیوں کر رکھوں گا۔ کہا کہ سو روپیہ اور دو۔ خاں صاحب اسی پر سوار ہو کر گھر آئے اور پہلے اس سے کہ ہتھنی روپے کھائے، اُسے بیچ کر فیصلہ کیا (اسی موقع پر اوج نے کہا تھا۔ دیکھو صفحہ ۵۱۶) پھر خاں صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ شکریے میں کہہ کر راجا صاحب کو دیا جس کا مطلع ہے:

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

سوا اس قصیدے کے اور کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی۔ وہ اس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

راجا کپور تھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپیہ مہینہ کر کے بلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا۔ وہ بھی تیار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ کہا کہ جہاں میری اور ایک گویے کی برابر تنخواہ ہو، میں نہیں جاتا۔

جس طرح شاعری کے ذریعے سے اُنھوں نے روپیہ نہیں پیدا کیا، اسی طرح نجوم، رمل اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں کیا۔ جس طرح شطرنج ان کی ایک دل لگی کی چیز تھی، اسی طرح نجوم، رمل اور شاعری کو بھی ایک بہلاوا دل کا سمجھتے تھے۔

خاں صاحب پانچ چار دفعہ دلی سے باہر گئے۔ اول رام پور اور وہاں جا کر کہا:

دلی سے رام پور میں ہے لایا جنوں کا شوق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں، ویرانہ تر میں ہم

دوسری دفعہ سہسوان گئے، وہاں فرماتے ہیں:

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ کئی دفعہ گئے۔ ایک دفعہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارن پور گئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دلی میں جو میسر تھا، اسی پر قانع تھے، درست ہے۔ تصدیق اس کی دیکھو، غالب مرحوم کے حال میں۔

اُن کی تیزیِ ذہن اور ذکاوتِ طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہم عصر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ ایک مولوی اسماعیل صاحب، دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب کہ ان کے پیر وا ور خواجہ میر درد صاحب کے نواسے تھے۔

اسی سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا۔ ان کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ اس کے مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی۔ مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق، مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگردِ رشید دیوانِ نظیری پڑھتے تھے۔ انھوں نے ایسے نازک معنی اور نادر مطلب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ "مولوی صاحب نے جو معنے بتائے ہیں، وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے۔" لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے نہ کسی صاحب کے معنے لکھے ہیں۔ ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا ہے، شفیق مکرم معاف فرماویں۔

لطیفہ:

ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کی فصاحت یا بلاغت کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ یہ قول اُن کا مشہور تھا کہ گلستانِ سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں، اس میں ہے کیا؟ "گفت گفت، گفتہ اند گفتہ اندر" کہتا چلا جاتا ہے۔ اگر ان لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ ان کے کسی شاگرد نے غزل میں یہ شعر لکھا تھا:

ہجر میں کیوں کر پھروں ہر سو نہ گھبرایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

خاں صاحب نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا: ع

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

اہلِ مذاق جانتے ہے کہ اب شعر کہاں سے کہاں سے پہنچ گیا ہے۔

ایک اور شخص نے الہی بخش کا سجع لکھا تھا: ع

مجھ گنہ گار کو الہی بخش

خاں صاحب نے فرمایا:

میں گنہ گار ہوں الہی بخش

تاریخیں:

تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے مگر ان کی طبع رسا نے اسے محسنات تاریخ میں داخل کر دیا۔ چناں چہ اپنے والد کی تاریخ وفات کہی:

بہ من الہام گشت سال وفات
کہ غلام نبی بہ حق پیوست

’غلام‘ کے اعداد کے ساتھ ’حق‘ ملائیں تو پورے سنہِ فوت نکل آتے ہیں۔ اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخِ وفات کہی:

خاک بہ فرق دولتِ دنیا
من فشاندم خزانہ بہ سر خاک

’خزانہ‘ کے اعداد ’سرِ خاک‘ یعنی ’خ‘ کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ھ ہوتے ہیں۔

تاریخِ چاہ:

آب لذت فزا بہ جام بگیر

’آب لذت فزا‘ کے اعداد ’جام‘ کے اعداد میں ڈالو تو ۱۲۶۵ھ حاصل ہوئے۔

ایک شخص زین خاں نام حج کو گیا، رستے میں سے پھر آیا۔ خاں صاحب نے کہا: ع

چوں بیاید ہنوز خر باشد

۱۲۵۶ھ

شاہ محمد اسحاق نے دلی سے ہجرت کی۔ خاں صاحب نے کہا: ع

گفتیم وحید عصر اسحاق
بہ حکم شہنشہِ دو عالم

بگذاشتہ وار حرب امسال
جا کردہ بہ مکۂ معظم

'وحید عصر اسحاق' کے اعداد 'مکہ معظم' کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور دار حرب کے اعداد اس میں سے تفریق کرو تو ۱۲۶۰ھ تاریخ ہجرت نکلتی ہے۔

ایک شخص قلعۂ دہلی سے نکالا گیا۔ انھوں نے تاریخ کہی: ع

از باغ خلد بیروں شیطانِ بے حیا شد

'باغ خلد' کے اعداد میں سے 'شیطان بے حیا' کے عدد نکال ڈالیں تو ۱۲۳۶ ہجری رہتے ہیں۔

سادی تاریخیں بھی عمدہ ہیں۔ چناں چہ خلیل خاں کے ختنے کی تاریخ کہی:

"سنت خلیل اللہ"

اپنی عمہ کے مرنے کی تاریخ کہی: ع

لھا اجرٌ عظیمٌ

اپنے والد کی وفات کی تاریخ کہی: ع

قد فاز فوزاً عظیماً

اپنی بیٹی کی ولادت کی تاریخ کہی:

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دختر مومن

'دختر مومن' کے اعداد میں سے 'نال' کے اعداد کو اخراج کیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی تاریخ:

دستِ بے دادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

الفاظِ مصرع آخر کے اول و آخر کے حرفوں کو گرا دو۔ بیچ کے حرفوں کے عدد لے لو تو ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں۔

ان کے معمے بھی متعدد ہیں مگر ایک لاجواب ہے۔ ایسا نہیں سنا گیا:

بنے کیوں کر کہ ہے سب کار اُلٹا
ہم اُلٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا (یعنی 'مہتاب رائے')

پہلیاں بھی کہیں؛ ایک یہاں لکھی جاتی ہے کہ گھڑیال پر ہے:

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے
نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور پر، وہ لٹکتا رہے
زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے
اسی طرح سے مار کھایا کرے

کوٹھے سے گرنے کے بعد انھوں نے حکم لگایا تھا کہ ۵ دن یا ۵ مہینے یا ۵ برس میں مرجاؤں گا۔ چناں چہ ۵ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود ہی کہی تھی:

”دست و بازو شکست“

مرنے کی تاریخ ایک شاگرد نے کہ:

ماتم مومن“

دلی دروازے کے باہر میدھیوں کے جانب غرب زیر دیوار احاطے میں مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے۔

روایت:

مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا۔ ایک خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں نے دو برس بعد خواب میں دیکھا کہ ایک قاصد نے آ کر خط دیا کہ مومن مرحوم کا خط ہے۔ انھوں نے لفافہ کھولا تو اس کے خاتمے پر ایک مہر ثبت تھی، جس میں 'مومن جنتی' لکھا تھا اور خط کا مضمون یہ تھا کہ آج کل میرے عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے، تم اُن کی خبر لو۔ صبح کو نواب صاحب نے دو سو روپے ان کے گھر بھیجے اور خواب کا مضمون بھی کہلا بھیجا۔ ان کے صاحب زادے احمد نصیر خاں سلمہ اللہ کا بیان ہے کہ فی الواقعہ ان دنوں میں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف تھی۔ برسات کا موسم تھا اور سارا مکان ٹپکتا تھا۔

☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

سید احمد خاں اور اُن کے کام

ان دنوں میں جناب مولوی سید احمد خاں بہادر تمام ہندوستان کی تربیت میں عموماً اور ہماری قوم کی تہذیب اور اصلاح میں خصوصاً جواں مردانہ سعی اور کوشش کر رہے ہیں اور اپنے اُس احسان کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس کے بوجھ سے ہم اور ہمارے اخلاف کبھی سبکدوش نہ ہوں گے۔

اہلِ ملک میں سے جو لوگ سید صاحب کی سرگرمی اور جاں فشانی کو شائبۂ اعتراضِ نفسانی سے پاک اور منزہ نہیں جانتے، یا اُن کی رائے کو قرینِ صواب نہیں سمجھتے، یا اُن کو مسلکِ ہدیٰ سے متجاوز رکھتے ہیں، اگرچہ میں نہ کبھی پہلے اُن کا ہم زبان ہوا، نہ اب ہوں اور امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے اُن کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی۔ لیکن الحمد اللہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیۂ نفسانی نہ تھا۔ لہٰذا میرے خلوص نے مجھے اس مرض سے نجات دی اور جو رائے میری اب ہے غالباً یہی قرینِ صواب بھی ہے۔

میرے نزدیک سید صاحب کی نسبت لوگوں کا سوءِ ظن بہ حسبِ اختلافِ طبائع ان چار وجہوں میں سے کسی نہ کسی پر مبنی ہے:

۱۔ یا تو یہ بات ہے کہ ہم جنسوں کی خیر خواہی اور ان کی بہبودگی کے لیے تہ دل سے کوشش کرنی اور اپنے عزیز وقت کا ایک معتد بہ حصہ خاص ایسے کام میں صرف کرنا اور بہ حسبِ مقتضائے مقام، عقلی اور مالی تدبیروں میں مضائقہ نہ کرنا اس زمانے میں ایسا نادر الوجود ہے کہ اگر مردانِ خدا میں سے کوئی جواں مرد اس راہ میں قدم رکھتا ہے تو وہ شائبۂ غرض سے پاک نہیں سمجھا جاتا، اور اُس کا خلوص ریا کاری کے سوا اور کسی بات پر محمول نہیں ہوتا۔

۲۔ یا جیسا کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے میں جن لوگوں نے گزشتہ زمانے کی رسوم و عادات پر اعتراض کیا ہے، یا سلف کے قانونِ معاشرت میں کوئی نیا انقلاب پیدا کرنا چاہا ہے، وہ ضرور ہدفِ طعن و ملامت

ہوئے ہیں۔ اسی طرح سید صاحب کے حسنِ قبول میں خلل واقع ہوا۔

۳۔ یا یہ کہ سید صاحب اپنی صاف باطنی اور کھرے پن سے بعض کلمات ایسے کہہ اُٹھتے ہیں جن کو سُن کر سامعین کا حوصلہ تنگی کرتا ہے اور وہ کلمات بجائے محبت کے اُن کے دلوں میں مخالفت کی بنیاد ڈال لیتے ہیں۔

۴۔ کیا عجب ہے کہ سید صاحب کا تقربِ سلطانی بھی کسی تنگ ظرف اور تنگ چشم کی نظروں میں کھٹکتا ہو۔

ان چاروں وجوہات میں سے کوئی وجہ ایسی نہیں معلوم ہوتی جس کی طرف کچھ التفات کیا جائے اور جس سے اُن کی حقیقی اور نفس الامری خوبیوں کو کچھ ضرر پہنچے۔

اور بعض لوگ سید صاحب پر جو اعتراض کرتے ہیں کہ اولاد کی دنیوی تعلیم میں اس قدر کوشش کرنی اور آدابِ دین سے بالکل کورا رکھنا کہاں تک قرینِ صواب ہے؟ سید صاحب پر یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ لباس وطعام وغیرہ میں ابنائے جنس کی مخالفت پر اس قدر مبالغہ کرنا جیسے کوئی فرض وواجبات پر کرتا ہے اور جو نتائج قوم کی تالیف اور موافقت پر مترتب ہوتے ہیں اُن پر لحاظ نہ فرمانا، کون سے مصلحت کا مقتضا ہے؟

پہلی بات کا جواب دینا ہمارے ذمے نہیں کیوں کہ جو امور سید صاحب کی ذاتِ خاص سے متعلق ہیں وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔

دوسرا امر بے شک ایسا ہے کہ جب تک اُس کا جواب نہ دیا جائے گا، اُس وقت تک سید صاحب اور اُن کے خاص مددگار اپنے ذمے سے فارغ نہ ہوں گے۔ اور میں صرف اس جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نے سید صاحب کے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا مگر اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ آج سید صاحب اپنی کوششوں کے اعتبار سے اس حدیث کے صحیح مصداق ہیں کہ "سید القوم خادمہم۔"

سید صاحب کے کارنامے:

۱۔ کتاب 'خطباتِ احمدیہ' جو انھوں نے لندن میں جا کر تالیف کی ہے، ظاہر ہے کہ اپنے لیے ایک عمدہ ذخیرہ آخرت کا مہیا کیا ہے اور کیا عجب ہے کہ فریضۂ حج جو باوجود استطاعت اور قربِ مسافت کے اُن سے ادا نہ ہو سکا، اُس کی تلافی اس تالیف سے ہو جائے، مگر قوم کو بھی اس احسان کی شکر گزاری سے چارہ نہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں اکثر مضامین اور خیالات ایسے ہیں جن میں ہم جناب مؤلف کو منفرد نہیں کہہ سکتے لیکن اور بہت سی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے اعتبار سے اس کتاب کو اثباتِ نبوت کی پہلی کتاب کہنا چاہیے اور جن کے لحاظ سے

یہ کہنا غیر موزوں نہیں کہ آج مولوی سید احمد خاں صاحب کے سوا دوسرے سے اس کام کا سر انجام ہونا محال تھا۔

۲۔ رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک خاصیت ہے اور جس کی حقیقت نہ جاننے سے سلطنت کی بڑی خوبی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی، اگر سچ پوچھیے تو اُس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا، اس کی کنجی سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں۔ ہم کو وہ زمانہ یاد ہے کہ ایام غدر کے بعد ہنوز بغاوت کی آگ مدھم نہیں ہوئی تھی اور گورنمنٹ کی نگاہ تمام ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً غضب آلود پڑتی تھی اور چند نااہلوں اور خیرہ سروں کے الزام نے برٹش انڈیا کی کل قوموں کو خوف و رجا اور امید و بیم کے بھنور میں ڈال رکھا تھا اور کیا دوست اور کیا دشمن اور کیا مخالف اور کیا موافق سب کے دلوں پر رعبِ سلطنت چھایا ہوا تھا۔ اُس وقت اس اولوالعزم جواں مرد نے وہ کام کیا جس سے گورنمنٹ کی حق پسندی اور حق شناسی رعایا پر اور رعایا کی بے گناہی اور بے جرمی گورنمنٹ پر "کالشمس فی رابعۃ النہار" آشکار ہو گئی۔ رسالۂ اسباب بغاوت ہند کا لکھنا اگرچہ سید صاحب کی آزاد اور بے باک طبیعت کی بے شمار موجوں میں اک موج تھی لیکن ہمارے گراں بار کرنے کو یہ احسان کچھ کم نہ تھا۔

۳۔ انگلستان سے جو وہ ہر فن اور علم کی منتخب کتابیں اپنے ساتھ لائے ہیں اور یہاں اُن کے اردو میں ترجمے کرانے کی سبیلیں نکالنے میں سرگرم ہیں، اگر غور سے دیکھیے تو یہ ہمارے اُن مقاصدِ جلیلہ میں سے ہے جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے سوا اور کسی سے نہ تھی اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں جن کے نہ ہونے سے ہم پر "انسان بالفعل" کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا۔

۴۔ پرچۂ تہذیب الاخلاق جو سید صاحب کی حسنِ توجہ سے ابھی جاری ہوا ہے یہ بھی ہماری حدتِ بصر اور تیزیِ نظر کے لیے ایک بہت عمدہ وسیلہ ہے۔ بعض لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "امر معاش میں اس قدر منہمک ہونے کی ترغیب دینی گویا امرِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا ہے، کیوں کہ چین، مصر اور یونان کی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی عقلِ معاش کو جس قدر ترقی ہوتی گئی، اس قدر عقلِ معاد میں تنزل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ امرِ دین میں ایسے کوتاہ بین اور عاقبت نا اندیش ہو گئے کہ اُن کی حماقت کی مثالیں شمار اور بیان کی حد سے باہر ہیں اور اب یورپ کی اعلیٰ درجے کی ترقی سے جو نتائج دین اور مذہب پر مترتب ہوئے ہیں وہ ایسے روشن اور ظاہر ہیں کہ اُن کے بیان کی حاجت نہیں۔" اگرچہ یہ اعتراض ایسا نہیں ہے جس سے "تہذیب الاخلاق" کی خوبی کو دھبہ لگے لیکن اس سے بچنے کے لیے میانہ روی اختیار کرنی

اور اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کرنا قرینِ صواب ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ اور اس پرچے کا مقبولِ خاص و عوام ہونا زیادہ تر اسی بات پر موقوف ہے۔

۵۔ ’’علی گڑھ سوسائٹی‘‘ جو اپنے بانی کے حسنِ سلیقہ اور نیک نیتی پر گواہی دیتی ہے اور جس کی دیکھا دیکھی اور بہت سی علمی مجلسیں ہندوستان میں منعقد ہوئیں، اگرچہ آج تک اُس کی خوبی کو نہیں پہنچیں، اُس کی مثال ہمارے نزدیک ایسی ہے جیسے ایک خشک پودے میں پانی دیا جائے۔ جس طرح پانی دینے سے خشک پودا اُسی وقت سرسبز اور بارور نہیں ہو جاتا، اسی طرح اس سوسائٹی کے فوائد اور منافعے اگرچہ بالفعل محسوس نہیں ہوتے، لیکن ہم لوگ اُن سے برابر متمتع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اب جو اس کے بانی اور سرگروہ اور میرِ مجلس یعنی مولوی سید احمد خاں بہادر عنقریب علی گڑھ میں رونق افروز ہونے والے ہیں، امید ہے کہ اُن کی موجودگی میں اُن کی کوششیں اور زیادہ بارآور ہوں گی۔

۶۔ کمیٹی خواستگارِ ترقیِ تعلیم، اہلِ اسلام، جس کے سرمنشا اور مہتمم سید صاحب ممدوح ہیں، اس کا قائم ہونا اُس مرض کا علاج ہے جس نے ہماری قوم میں اُنس باقی نہیں رکھا اور جو اس کمیٹی کے قائم ہونے سے پہلے لاعلاج معلوم ہوتا تھا۔

کاش ہمارے ملک کے دولت مند مسلمان اس کمیٹی کے مطالب اور مقاصد کو غور سے دیکھیں اور سمجھیں کہ سید صاحب نے اُن کے اور اُن کی قوم کے لیے کیسا اعلیٰ طریقہ نکالا ہے۔ اور وہ بارگراں جو سید صاحب نے محض بہ مقتضائے رقتِ جنسیت اپنے سر پر رکھا ہے، اس کے اٹھانے میں آپ بھی شریک ہوں اور صرف روپے پیسے ہی سے نہیں بلکہ جان و دل سے اُن کی امداد کریں۔

یہاں کے مسلمانوں میں جو روز بروز جہل پھیلتا جاتا ہے اور جس بات میں وہ ہندوستان کی عام قوموں میں ممتاز گنے جاتے تھے، اب اُسی بات میں سب سے زیادہ مبتذل ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب دولت مند مسلمانوں کی بے اعتنائی، تن آسانی اور نفس پروری ہے۔ کیا وہ اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ دلی اور لکھنؤ سے شہر، جو ہندوستان کے بڑے دارالعلم گنے جاتے ہیں، اُن میں کوئی اتنا نہ رہے جس سے یہ پوچھا جائے کہ نماز میں کتنے فرض ہیں اور وضو کن کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے؟ کیا وہ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ جو شائستہ قوم آج ہندوستان میں فرماں روا ہے اور جس کے زن و مرد اور پیر و جوان سب علم و دانش کے پتلے اور جہل و ناشائستگی کے دشمن ہیں، اُن کے عہد میں مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل و خوار نہ رہے؟

سید صاحب کی جو یہ تمنا ہے کہ مسلمانوں کے حسنِ اتفاق سے ہر ضلع میں کم سے کم ایک مدرسہ ایسا قائم ہو جس میں علوم قدیمہ اور فنونِ جدیدہ کی تعلیم بوجہِ شائستگی ممکن ہو، سو خدا تعالیٰ اُن کی یہ آرزو پوری کرے۔

ظاہراً اس کوشش کے بارور ہونے میں ابھی بہت دن باقی ہیں۔ ہاں اگر دولت مند اور ذی مقدور مسلمانوں نے اس مہمِ عظیم کا بوجھ صرف سید صاحب ہی پر نہ ڈالا اور اُن کے درد میں آپ بھی شریک ہوئے اور اپنے عیش و عشرت کے اوقات و مصارف کا ایک معتد بہ حصہ اُن کی غم خواری میں صرف کیا، تو البتہ خدا تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ ہندوستان کے پانچ سات بڑے بڑے شہروں میں ایسے مدرسوں کی بنیاد پڑ جائے اور جو تاریکی ساری قوم پر چھا رہی ہے اُس کے دُور ہونے کی کچھ کچھ امید بندھے۔

اگر مسلمانوں نے اب بھی بے پروائی کو کام فرمایا اور سید صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ پود نہ لگائی تو اُن کی وہی مثل ہوگی جیسا کہ امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے کہ جس وقت لین کسٹو کا وہ عہد نامہ لکھا گیا جو ۱۷۴۴ء میں سلطنت ورجینا اور چھ قوموں میں بمقام پنسل وینیا قرار پایا تھا تو اُس کے لکھے جانے کے بعد سلطنت ورجینا کے ایلچیوں نے امریکہ والوں سے کہا کہ ”وانمیر برگ میں ایک کالج ہے، اس میں اس ملک کے لڑکوں کی تربیت کے لیے کچھ روپیہ جمع ہے۔ اگر تم میں سے چھ قوموں کے سردار اپنے لڑکے کالج میں بھیج دیں تو ہماری سرکار سے ہر شے کا سرانجام ہو سکتا ہے اور یورپ کے کُل علوم اُن کو سکھائے جائیں گے۔“

اُن وحشیوں نے کہا ”پہلے ایک بار ہمارے لڑکوں نے اضلاع شمالی کے کالجوں میں تعلیم پائی تھی اور اُن کو تمہارے علوم سکھائے گئے تھے مگر وہ پڑھ لکھ کر آئے تو ہمارے کام کے نہ تھے۔ بھاگنا، جنگل میں رہنا، کوٹھا بنانا، ہرن پکڑنا، کچھ نہ جانتے تھے۔ ہم کو منظور نہیں کہ اپنی اولاد کو علم پڑھا کر اپنے کاموں سے بالکل کھو دیں۔“

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا منظور نہیں۔ نہ اُن کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود ہے بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔

وماعلینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

ایامِ تعطیل میں ایک سفر کی کیفیت

ایامِ تعطیل میں دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی غرض سے ہم کو چند مقامات میں دورہ کرنے کا اتفاق ہوا اور ہم دہلی سے علی گڑھ پہنچے اور جناب آنریبل سید احمد خاں بہادر کی کوٹھی پر ٹھہرے۔

علی گڑھ:

اب کی دفعہ ہم نے مدرسۃ العلوم کو تیسری بار دیکھا اور اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ مدرسے کو دیکھ کر ہم کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اولوالعزم اور مستقل مزاج آدمی اپنے ارادوں کی مزاحمت سے اور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

اُن لوگوں کے سوا جو عناد اور دشمنی سے اس مدرسے کے مخالف ہیں۔ باقی سب مسلمان رفتہ رفتہ اس کی قدر کرتے جاتے ہیں اور جن عمدہ اصول پر اس مدرسے کی بنیاد قائم کی گئی ہے اب ان کی خوبی و عمدگی سب پر ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وجہ سے طلبہ کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بہت سے بے خبر اور ناواقف لوگ جو اپنی اولاد کو یہاں بھیجتے ہوئے جھجکتے تھے اور ان کے مذہب و عقائد کے بدل جانے سے ڈرتے تھے وہ اب نہایت اطمینان اور دل جمعی سے اپنی اولاد کو وہاں بھیجنے لگے ہیں۔

یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ بانیِ مدرسۃ العلوم کے مذہبی اعتقادات اور رایوں کو مدرسۃ العلوم کی تعلیم میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ اس امر کا یہاں تک خیال رکھا جاتا ہے کہ رسالۂ تہذیب الاخلاق جو مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپ کر شائع ہوتا ہے، اُس کی کوئی کاپی مفت یا بہ قیمت کسی طالب علم کو نہیں دی جاتی۔

طلبائے مدرسہ کے افعال و اخلاق کی نگرانی پر یہاں وہ لوگ مامور ہیں جو جمہور اہلِ اسلام کے طریقے سے سرمو تجاوز کرنے کو بھی کفر جانتے ہیں۔ علی گڑھ میں ہم بعض ایسے دوستوں سے بھی ملے جو چند سال پہلے اس مدرسے کو ''دارالکفر'' سمجھتے تھے لیکن اب حد سے زیادہ اس کے مداح اور ثنا خواں ہیں اور اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں۔

مدرسے میں دو چار کے سوا، جو کہ مریض تھے، ہم نے سب مسلمان طالب علموں کو روزہ دار پایا۔ افطار کے وقت نماز کے چبوترے پر، جو بالفعل عارضی طور پر بنایا گیا ہے، سب جمع ہوتے تھے اور نہایت لطف کے ساتھ روزہ افطار ہوتا تھا۔ نمازِ عشا کے بعد جناب مولوی محمد امیر صاحب تراویح میں قرآن سناتے تھے اور اکثر طالب علم ان کا قرآن سنتے تھے۔ ایک روز جناب مولوی سید فرید الدین احمد خاں بہادر نے اور دوسرے روز ہمارے جلیل القدر میزباں (یعنی سید احمد خاں صاحب) نے بھی روزہ افطار کی تقریب میں اپنے دوستوں کو بلایا تھا اور ان دونوں صحبتوں میں ہم بھی شریک تھے۔

مدرسۃ العلوم کی تعمیر نہایت شدومد سے جاری ہے اور جس قدر کام اس میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اس کو دیکھ کر بے انتہا تعجب ہوتا ہے۔ مدرسۃ العلوم کے حامیوں اور کارپردازوں کی سرگرمی اور کوشش دیکھ کر اُن لوگوں کے دل میں بھی، جو مسلمانوں کی ترقی سے مایوس ہیں، ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ اس قوم کی ترقی کا اگر ذمہ دار ہو سکتا تو یہی مدرسہ ہو سکتا ہے۔ علی گڑھ میں پانچ روز ٹھہر کر ہم فیروز آباد، اٹاوہ، مین پوری اور کان پور ہوتے ہوئے ہمیر پور میں پہنچے۔

فیروز آباد:

فیروز آباد ضلع آگرہ کا ایک مشہور قصبہ ہے جس میں سرکاری تھانہ اور تحصیل بھی ہے۔ یہ قصبہ جیسا کہ مشہور ہے، فیروز خواجہ سرا کا آباد کیا ہوا ہے لیکن یہ ایک غیر محقق بات ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ فیروز شاہ کا آباد کیا ہوا ہو جیسے فیروز پور یا حصار فیروزہ وغیرہ۔

یہاں کھجور کے پٹھے کی پنکھیاں ایسی عمدہ بنتی ہیں کہ ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور بنتی ہوں۔ سادی پنکھیاں جن میں کسی قدر ریشم کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک روپیہ قیمت کی ہم نے بھی یہاں دیکھیں۔ اس کے سوا یہاں کی کوئی بات ذکر کے قابل نہیں ہے۔ یہاں کے مسلمان جو پہلے آسودہ اور مرفہ الحال تھے، اب اس قدر پست حال میں ہیں کہ وہاں کے ذی اعتبار باشندوں میں اُن کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

اٹاوہ:

اٹاوے میں ہم کو زیادہ ٹھہرنے کی مہلت نہیں ملی اور نہ اپنے شفیق میزبان کے مکان کے سوا کہیں جانے کا اتفاق ہوا۔

مین پوری:

مین پوری میں ہم دو روز ٹھہرے۔ خوش قسمتی سے ہم کو ایک دن اور ایک رات جناب میرزا عابد علی بیگ صاحب سب آرڈنیٹ جج کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی طریقہ معاشرت میں ہم نے وہی انوار و برکات مشاہدہ کیے جو علی گڑھ میں کیے تھے۔ جناب میرزا صاحب بھی اُسی ’’مردود گروہ‘‘ میں سے ہیں جو قومی ہمدردی کو راس الحسنات اور رخ العبادات جانتا ہے۔ جب ہم ان کے دولت خانے سے رخصت ہو کر ڈاک گاڑی پر پہنچے تو اُن کے دو آدمی ہمارے ساتھ تھے جن سے کوچبان کو معلوم ہوا کہ وہ صدر اعلیٰ کے ہاں سے آئے ہیں۔ اس بات نے ہم کو بہت تکلیف میں ڈالا کیوں کہ گاڑی کا کوچبان اتفاق سے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی نہایت متقی بھی تھا۔ اس نے یہ بات معلوم ہونے پر راستے میں ہم کو پانی پینے کے لیے اپنا کٹورا تک نہیں دیا ور ہم سے برابر ایسا پرہیز کرتا رہا جیسے بعض ہندو مسلمان سے کرتے ہیں۔ اول تو ہم کو اس سے بہت تعجب ہوا لیکن پھر یاد آیا کہ ہم نے اپنے عالی قدر میزبان کے ہاں برابر دو وقت میز پر کھانا کھایا تھا اور اسی لیے ہم سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔

ہمیر پور:

جب ہم کانپور میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ہمیر پور تک اُونٹ گاڑی کے سوا کوئی سواری نہیں جاتی۔ اس لیے لاچار اسی میں جانا پڑا اور اتفاقاً ہم کو اوپر کے درجے میں جگہ ملی۔ ہم کو یاد نہیں کہ ہم نے کبھی کسی سواری یا پیدل چلنے میں ایسی تکلیف اٹھائی ہو جیسی اس اونٹ گاڑی میں ہمیں پہنچی۔

ریل کے زمانے سے پہلے یہی سواریاں نہایت غنیمت سمجھی جاتی تھیں مگر اب تو اُن کے نام سے ہول آتی ہے۔ افسوس کی یورپ کی صنعتیں روز بروز ہم کو پرلے درجے کا آرام طلب اور راحت پسند بناتی جاتی ہیں اور اب وہ تمام اسباب اور ذریعے مفقود ہیں جن کے باعث سے کبھی کبھی ہم کو جفاکشی اور محنت کرنے کا بھی موقع ملتا رہے۔ ہمیر پور کو جاتے ہوئے پچھم کی طرف سڑک سے کسی قدر فاصلے پر ہم نے ایک مندر دیکھا جو بیربر کا بنایا ہوا مشہور ہے۔ گو یہ مندر کچھ زیادہ شان دار نہیں ہے مگر اس سنسان جنگل میں ایک ایسے زمانے کو یاد دلاتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں ’طلائی زمانہ‘ کہلانے کا مستحق ہے۔

اب ہم جمنا سے اُتر کو ہمیر پور پہنچے۔ ہمیر پور راجا ہمیر سنگھ کا آباد کیا ہوا مشہور ہے۔ جس کے خاندان کی عمارتوں کے کھنڈر اب تک وہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ کانپور سے چالیس میل جانب جنوب بہت بلندی پر

واقع ہے۔ اس کے شمال میں جمنا اور جنوب میں بیدوتی ندی بہتی ہے اور شرق میں ایک میل پر جا کر دونوں مل گئی ہیں۔ مغرب میں ایک نالہ ہے جو بیدوتی میں جا کر گرتا ہے۔ یہ نالہ برسات میں جاری ہو جاتا ہے اور ویسے ایام میں خشک رہتا ہے اور اس لحاظ سے ہمیر پور کو کبھی جزیرہ اور کبھی جزیرہ نما کہا جا سکتا ہے۔

قدیم باشندے یہاں کے زیادہ تر ہندو ہیں۔ شریف مسلمانوں میں صرف ایک سیدوں کا خاندان ہے جو اکثر خانہ نشیں اور بزرگوں کے متروکے پر قانع ہے۔ اس خاندان کے جتنے آدمی میں نے دیکھے ہیں سب پرانی روش کے بھولے بھالے سیدھے سادے سید ہیں جن پر زمانۂ حال کی چھینٹ بھی نہیں پڑی۔

اس مقام کی رونق زیادہ تر سرکاری ملازموں سے ہے اور یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہاں سرکاری ملازموں میں جس قدر پردیسی مسلمان ہیں، وہ برخلاف عام مسلمانوں کے باہم برادرانہ محبت اور برتاؤ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے درد اور دکھ میں شریک ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے تعصباتِ بے جا میں سب گرفتار ہیں۔ حقیقت میں ہمیر پور ایک ایسے گوشے میں واقع ہے جہاں زمانے کے شور و شغب کی آواز بہت کم پہنچتی ہے۔ مدرسۃ العلوم کا نام وہاں کے اکثر مسلمانوں نے کبھی کان سے بھی نہیں سنا اور جنہوں نے سنا ہے اُن کے ذہن میں اُس کی ایسی ہول ناک صورت سمائی ہوئی ہے کہ اس کے نام سے پناہ مانگتے ہیں۔

دلی سے ہمیر پور تک:

دلی سے ہمیر پور تک ہم کو شریف مسلمانوں کی اکثر صحبتوں میں بیٹھنے اور اُن کی بات چیت سننے کا اتفاق ہوا۔ تقریباً تمام مجلسوں کا رنگ ہم نے ایک ہی اصل پر دیکھا۔ وہی بے جا شیخی اور تعلّی اور ہر ایک پہلو سے اپنی تعریف نکالنی۔ لوگوں کے عیب ڈھونڈنے اور اُن کو برائی سے یاد کرنا۔ حاضرین کی خوشامد اور غائبین کی بدگوئی۔ بات بات میں فحش اور دشنام سے زبان کو آلودہ کرنا اور سب سے زیادہ خودغرضی اور تعصب کا بازار ہر جگہ گرم پایا۔

آگرے سے باندی کوئی تک:

مراجعت کے وقت ہم ایک دن آگرے میں ٹھہر کر الور پہنچے۔ یہاں ہم کو ”راجپوتانہ اسٹیٹ ریلوے“ میں بیٹھنا پڑا۔ چوں کہ یہ سرکاری ریل ہے اس وجہ سے ہم کو امید تھی کہ اس میں زیادہ آرام ملے گا مگر برخلاف اس کے سب سے زیادہ اسی میں تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اول تو اس میں انٹرمیڈیٹ کلاس کے نہ ہونے سے بڑا نقص ہے کیوں کہ متوسط الحال آدمیوں کے لیے یہ درجہ فرسٹ کلاس کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے گاڑیاں

اس قدر چھوٹی ہیں کہ ایک کمرے میں صرف چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ آدمی بٹھائے جانے کا حکم ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ جب تک ایک کمرے میں پورے آٹھ آدمی نہیں بیٹھ لیتے تب تک دوسرا کمرہ نہیں کھولا جاتا۔ حالاں کہ اکثر اسی کلاس کی پانچ پانچ سات سات گاڑیاں ٹرین میں بالکل خالی جاتی ہیں۔

ہم رات کی ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور ہماری گاڑی کے کسی کمرے میں آٹھ آدمی سے کم نہ تھے۔ نیند کے مارے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور تمام راستے مسافروں میں باہم تکرار ہوتی رہی۔ علاوہ ان ”خوبیوں“ کے یہ ریل اور ریلوں کی نسبت سست رفتار بھی بہت ہے۔ صبح کے سات بجے ہم باندی کوئی میں پہنچے اور دس بجے تک یہاں ٹھہرے رہے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ میل طول اور اسی قدر عرض کے میدان میں بالکل سنگین عمارتیں اس قدر بنائی گئی ہیں کہ بجائے خود ایک شہر آباد ہو گیا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں کسی قدر سرکاری فوج رکھی جائے گی۔

الور:

وہاں سے چل کر ساڑھے بارہ بجے ہم الور پہنچے اور دوپہر تک نئی سرائے میں جو کیڈل صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کے عہد میں تیار ہوئی ہے، ٹھہرے۔ اس سرائے کی عمارت بالکل سنگین ہے۔ ظاہراً ہندوستان میں یہ پہلی سرائے ہے جس کے نقشے میں ہر ایک مسافر کی آسائش اور تمام ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ رات کو ہمارے ایک معزز دوست نے ہم کو اپنے مکان پر بلا لیا اور پانچ روز تک ہم ان ہی کے مکان پر ٹھہرے رہے۔

الور کو ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہر کی آبادی عین دامن کوہ میں واقع ہوئی ہے اور اسی وجہ سے شہر کا شمالی حصہ جنوبی حصے سے کسی قدر بلند ہے۔ یہاں کے بازار اگرچہ بہت وسیع نہیں مگر پُر رونق ضرور ہیں اور عمارتیں اکثر سنگین ہیں۔

شہر کی عام عمارتیں کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتیں لیکن سرکاری محلوں سے راج کی پوری پوری شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ محل جو موتی ڈونگری کے باغ میں مہاراجا بنے سنگھ نے بنوایا ہے۔ عمارت کی خوبی کے علاوہ وہ ایک ایسے موقع پر واقع ہوا ہے جس سے اُن کی شان اور عظمت دس گنی ہو گئی ہے۔ محل کے اوپر کے درجے پر چڑھ کر جس طرف نظر ڈالیے زمین اور پہاڑ اور فرش زمردیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر چاب

تک وہاں بارش کم ہوئی تھی مگر پھر بھی وہاں کی قدرتی فضا دیکھنے کے قابل تھی۔

یہاں ایک اور مقام بھی کمال دل کش اور روح افزا ہے جو سیلی سیڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شہر سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ایک سیتلا کا مندر ہے، جس کو وہاں کے لوگ سیلی سیڑھ کہتے ہیں۔ (سیلی سیڑھ کے لفظی معنی ٹھنڈی سیتلا کے ہیں)

یہاں دو طرف سے پہاڑ آ کر مل گیا ہے اور ایک مثلث کی سی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اس مثلث کے گوشے میں ایک بڑا اور نہایت مستحکم بند باندھا گیا ہے جس میں وقتاً فوقتاً بارش کا پانی دونوں پہاڑوں سے جھر جھر کرا کٹھا ہوتا رہتا ہے اور یہاں سے الور تک ایک پختہ نہر بنی ہوئی ہے جس کے ذریعے سے بند کا پانی رستے کے تمام کھیتوں کو سیراب کرتا ہوا شہر تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر الور کے تمام باغات اور اس کے تمام سواد کو سال بھر تک سرسبز و شاداب رکھتا ہے۔ بند کے ایک جانب پہاڑ پر ایک نہایت پختہ گٹو گھاٹ تقریباً پاؤ میل اونچا بنا ہوا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ختم ہوتا ہے اور وہاں سرکاری محل بنے ہوئے ہیں یہ مہاراجا بنے سنگھ کی ایک نمودار یادگار ہے جو ہمیشہ ان کے عہد حکومت کو یاد دلائے گی۔

الور کا سواد نہایت دل کش اور دل ربا ہے اور تمام باغات سے گھرا ہوا ہے۔ موتی ڈونگری کے باغ کے سوا، جو کہ مشہور ہے، ایک کمپنی باغ بھی ہے جو مہاراا شیو دھیان سنگھ نے حضور ڈیوک آف ایڈنبرا کی تشریف آوری کے زمانے میں تیار کروایا تھا۔ یہ بھی ایک عمدہ پارک ہے۔

اس کے سوا کیڈل گنج، شفا خانہ اور اسکول وغیرہ کی عمارتیں جو کیڈل صاحب کے عہد میں بنی ہیں، نہایت عمدہ اور شہر کے لیے باعث زینت ہیں۔ ریاست الور کے پولیٹیکل حالات جس قدر ہم کو معلوم ہوئے ہیں، ان سے ریاست کی آیندہ بہبودی اور ترقی کی بہت کچھ امید ہوتی ہے۔

مہاراجا منگل سنگھ، جو تقریباً دو ڈھائی برس سے با اختیار ہوئے ہیں، ان کی تعریف میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر سابق جب سال گزشتہ کے ختم پر اجمیر میں تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے میو کالج کے طالب علموں سے خطاب کر کے ایک لمبی اسپیچ کی تھی جس میں مہاراجا منگل سنگھ کی شہ سواری، گولی اندازی، بہادری، جفاکشی، شائستگی اور عالی دماغی کی نہایت تعریف کر کے مخاطبین کو ان کی پیروی کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

مہاراجا صاحب نے اس نہایت قلیل زمانے میں، جو دو ڈھائی برس سے زیادہ نہ ہوگا، کئی ایسے کام

کیے ہیں جن کا ایک نوجوان ہندوستانی رئیس سے وقوع میں آنا نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلے جنوبی ہندوستان کا ایک سفر اختیار کیا جس میں کسی قدر بحری سفر اور جزیرۂ سیلون کی سیاحت بھی شامل تھی اور بہت شوق سے اپنا سفرنامہ بھی تیار کرایا۔ پھر بااختیار ہونے کے وقت خزانہ بالکل خالی تھا بلکہ ریاست کسی قدر مقروض تھی مگر اب سنا جاتا ہے کہ خزانے میں تقریباً ساتھ آٹھ لاکھ روپیہ جمع ہے۔ ہر جمعرات کے دن ایک عام دربار مقرر کیا، جس میں تمام ریاست کے مستغیثوں کو اجازت دی گئی کہ خود مہاراجا کے روبرو حاضر ہوکر عرض معروض کریں اور معمولی دربار جو ہر روز تین گھنٹے سے چار گھنٹے تک رہتا ہے اور جس میں کونسل کی تجویزات اور فیصلے پیش ہوتے ہیں، یہ اُس عام دربار کے علاوہ ہے۔ پولیس اور مال کا ازسرِنو انتظام کیا جس کی وجہ سے تقریباً پانچ سو روپے ماہوار کا اضافی عملہ پولیس اور عملہ مال کی تنخواہوں میں کیا گیا۔ سررشتۂ تعلیم میں بھی روزبروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔

ایک بڑا اسکول شہر میں عام رعایا کی تعلیم کے لیے جس میں انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے اور جو لڑکے یہاں سے انٹرنس پاس کرتے ہیں ان کو وظیفہ دے کر کسی کالج میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اگلے برس دو لڑکوں نے انٹرنس پاس کیا تھا، وہ دونوں لڑکے اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں ترقی تعلیم کے لیے بھیج دیے گئے اور آٹھ روپیہ ماہوار اُن کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

اس کے سوا ایک اور سکول شہر میں ہے جو خاص ٹھاکروں اور سرداروں کی اولادوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس مدرسے کی حالت ابھی تک کچھ اچھی نہیں ہے۔

علاقہ الور کے دیہاتی مدراس کی ٹھیک تعداد ہم کو یاد نہیں رہی۔ لیکن غالباً سو سے زیادہ اور ڈیڑھ سو سے کم ہیں۔

چودہ مدرسے زنانے بھی ہیں جن میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آرام طلبی اور سستی اور کاہلی جو ہندوستانی رئیسوں کی سرشت میں داخل ہے، وہ مہاراجا کے مزاج میں بالکل نہیں ہے اور سادگی اور بے تکلفی ایسی ہے کہ اہلِ یورپ میں بھی ایسی نہیں دیکھی گئی۔ البتہ شکار کا شوق جس قدر ہونا چاہیے اُس سے کسی قدر زیادہ ہے۔ باقی تعیش، لہو ولعب اور منکرات سے، جہاں تک ہم نے سنا ہے، بکلی نفرت ہے اور یہ تمام باتیں بشرطیکہ استقلال کے ساتھ قائم رہیں، ایسی ہیں جو انسان کی ترقی کی اصل اصول ہیں۔

ہم جناب ماسٹر سری رام صاحب کے، جو مہاراجا کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں اور جناب ماسٹر کنج بہاری لال صاحب ہیڈ ماسٹر ہائی سکول الور کے دل سے شکر گزار ہیں جن کی عنایت سے ہم نے الور کی خاطر خواہ سیر کی۔

پانچ روز الور میں ٹھہر کر ہم رمضان کی انتیسویں تاریخ کی دن کی ریل میں الور سے روانہ ہوئے اور شام کو دلی میں پہنچ گئے۔

☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

مدوجزرِ اسلام سے انتخاب

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا
نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور
کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے سامان تھے واں میسر
کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آبِ باراں پہ تھی زندگانی
زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں
لوؤں کی لپٹ بادِ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں
کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبعِ بشر تھی
خدا کی زمیں بن جتی سربسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا
کہیں آگ پُجتی تھی واں بے محابا
کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا
بتوں کا عمل سو بہ سو جا بہ جا تھا
کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی
وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نامِ حق کا نہ تھا کوئی جویا
قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزا پہ وہ نائلہ پر فدا تھا
اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے
نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اُس سے بھڑک اُٹھتا تھا ملک سارا
وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اک آگ ہر سُو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ
کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی
جُوا اُن کی دن رات کی دل لگی تھی
شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی
غرض ہر طرح اُن کی حالت بری تھی
بہت اس طرح ان کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں
یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحاؔ
ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت
کہ طالع ہوا ماہِ برج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت
کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت
پہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والاؔ
مرادیں غریبوں کی بر لانے والاؔ
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والاؔ
وہؔ اپنے پرائے کا غم کھانے والاؔ
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اک نُسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مِسِ خام کو جس نے کُندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

☆☆☆☆

الطاف حسین حالیؔ

غزلیات: دورِ اول

(۱)

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم
شوق تھا بادیہ پیمائی کا
اس سے نادان ہی بن کے ملیے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جب تک
ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل
مجھ کو ڈر ہے تری خودرائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں!
گل و بلبل کی شناسائی کا
مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں
ہو چکا کام توانائی کا
محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا
ہوں گے حالؔی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دُور ہے رسوائی کا

☆☆☆☆

(۲)

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
اے دل رضائے غیر ہے شرط رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا
دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائے گا
مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں، جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا
جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

☆☆☆☆

(۳)

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بُتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یا رب کہاں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم
لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی راز داں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم
دل کش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم
لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ؟
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم

☆☆☆☆

(۴)

ہے جستجو کہ خُوب سے ہے خُوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دُور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں
ہم جس پر مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں!

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
حالؔی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

☆☆☆☆

(۵)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

☆☆☆☆

(۶)

حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے
کب ملیں دل بر سے دیکھا چاہیے

ہے تجلی بھی نقاب روئے یار
اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے
غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اس کو لکھا چاہیے
ہے دل افگاروں کی دل داری ضرور
گر نہیں اُلفت مداوا چاہیے
ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے
دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیے
بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجیے اغماض جتنا چاہیے
شیخ! ہے ان کی نگہ جادو بھری
صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیے
لگ گئی چپ حالیؔ رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے

☆☆☆☆

(۷)

دُھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خودنمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
ملتے غیروں سے ہو، ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی
دل رہا پائے بندِ اُلفتِ دام
تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے
رکھے اُمید دل رہائی کی
شہر و دریا سے باغ و صحرا سے
بُو نہیں آتی آشنائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی
بخت ہم داستانیِ شیدا
تُو نے آخر کو نارسائی کی
صحبتِ گاہ گاہیِ رشکی
تُو نے بھی ہم سے بے وفائی کی
موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی
زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالیؔ
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

غزلیات: دورِ دوم

(۱)

کو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
زیرِ برقع تُو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت
ہٹ پہ اس کی اور پس جاتے ہیں دل
راس ہے کچھ اس کو خود رائی بہت
سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت
چُور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حُر
راحت اس تکلیف میں پائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری
ہیں فدائی کم، تماشائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

☆☆☆☆

(۲)

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ! مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
کیا خبر زاہد قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت
میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت
رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت
یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

☆☆☆☆

(۳)

جاذبِ رحمت ہے مقناطیسِ عصیاں اپنے پاس
رکھتے ہیں عاصی کمندِ صیدِ غفراں اپنے پاس
عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر درگزر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس
ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس
بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس
خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس
دست بردِ اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمد اللہ وہ مہرِ سلیماں اپنے پاس

دیکھنا حالؔی نہ دینا وضع فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس

☆☆☆☆

(۴)

اِک ہم کو مہم بہ سرِ ایام ہے درپیش
بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش
غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکۂ گردشِ ایام ہے درپیش
وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز
اب اس مرضِ صعب کا انجام ہے درپیش
کو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش
وہ وقت گیا نشہ تھا جب زوروں پہ اپنا
اب وقتِ خمارِ مئے گل فام ہے درپیش
اُمیدِ شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سننا ہمیں پیغام ہے درپیش
جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالؔی کو کوئی کام ہے درپیش

☆☆☆☆

(۵)

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص
حور و غلماں کے لیے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برا ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیوں کہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور رہنما ایک ہی شخص
قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص
جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص
گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ، مگر ہے بخدا ایک ہی شخص
اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالیؔ یہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

☆☆☆☆

(۶)

یاروں کو تجھ سے حالیؔ اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
غیبت ہو یا حضوری دونوں بری ہیں تیری
جب بد گمانیاں تھیں اب بد زبانیاں ہیں
کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کو باقی رنگیں بیانیاں ہیں
رحمت تری غذا ہے، غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں جتنی تیری جانِ جہانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
روتے ہیں چار ہم پر، ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش
حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

☆☆☆☆

(۷)

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے
واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار
اس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجیے

ضبط کیجیے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجیے
دوست کے تیور ہیں ہم ہر رنگ میں پہچانتے
بے تکلف ملیے ہم سے یا تکلف کیجیے
جب کہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول
شیخ لگتے ہاتھ اس پہ بھی تصرف کیجیے
وقت تھا جو کام کا حالیؔ گنوا بیٹھے اسے
جائیے اب عمر بھی بیٹھے تاسف کیجیے
تو بہ حضرت کی یونہی اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجیے

☆☆☆☆

(۸)

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہم نے لگا لی ہے یہ علت کیسی
جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیم خزاں
جن کی قسمت میں ہو کلفت انھیں راحت کیسی
جی کا الفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا
وہ تو آفت تھی ہمارے لیے الفت کیسی
جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع ناداں
قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی
عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ
جن کو کچھ کام نہیں یاں، انھیں فرصت کیسی
جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا
وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی

جانتا ہے وہی دل پر ہے گزرتی جس کے
ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی
ہم نے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک
ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی
جب کہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح
وحی بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی
نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حاؔلی انجام
یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی
☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

نظمیں: دورِ اول

جواں مردی کا کام

تھا کسی ملک میں اک دولت مند   حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند
دور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا   باپ بیٹوں کی جواں مردی کا
باپ ہوں جن کے مروت والے   بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمت والے
ہو چکا عمر کا جب سرمایا   ایک دن باپ کے جی میں آیا
گھر ہے تکرار کا یہ دولت و زر   مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر
جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم   آخر اک روز ہے مرنا تسلیم
بس کہ تھا اس کو بہت فکرِ مآل   ایک دن بیٹھ کے، سب مال و منال
اک گراں مایہ جواہر کے سوا   تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا
پھر کہا اُن سے کہ اے اہلِ ہنر!   باپ کی جان فدا ہو تم پر
تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی   یہ جواہر ہے امانت اُس کی
باپ نے اُن سے کیا جب یہ سخن   پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دُھن
کہ کوئی کارِ نمایاں کیجیے   جس طرح ہو یہ جواہر لیجیے
اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے   اُس کو یہ فکر سوا تھا سب سے
ایک دن اس کا کوئی واقفِ کار   کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص اور پیار
رکھ گیا آ کے جواں مرد کے پاس   ایک بھاری سی رقم بے وسواس
تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ   نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ
کچھ بھی نیّت میں گر آ جائے خلل   تو یہ تھا عین خیانت کا محل
جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے   وسوسے دل میں بہت سے آئے

مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری   لی تھی جن ہاتھوں اُٹھی ہاتھوں دی
نفسِ سرکش کو کیا مات اُس نے   دی رقم اور نہ دی بات اُس نے
صاحبِ زر نے جو کچھ نذر کیا   وہ بھی اُس دل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو آن کے دی جب یہ خبر   ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر!
اک برائی سے بچے تم تو کیا   اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا؟
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز   شرم کی جا ہے، تری عمرِ دراز!

* * *

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا   میں جو دریا کی طرف جا نکلا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفلِ صغیر   گر کے پانی میں چلا صورتِ تیر
تھا جہاں یار نہ کوئی یاور   ماں کا پہلو تھا نہ آغوشِ پدر
آنکھ تھی جانبِ مادر نگراں   ماں کنارے پہ ادھر تھی حیراں
گرچہ تھا کام خطرناک بڑا   پر اُسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر   جا پڑا نام خدا کا لے کر
جان تو جا ہی چکی تھی اُس کی   پر مری شرم خدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا   لا کے بیٹے کو دیا ماں سے ملا
باپ نے سُن کے یہ سب اُس سے کہا   کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا!
آدمیت کا کیا تم نے کام   جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے؟   نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے؟

* * *

پسرِ خورد کا اب سنیے بیاں   جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز   باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز!
بات کو لائقِ اظہار نہیں   آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
خوب اک روز گھٹا چھائی تھی   رات آدھی کے قریب آئی تھی
شبِ تاریک میں وہ ابرِ سیاہ   کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ

اک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا   خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا
ساتھ تم تھے نہ کوئی بھائی تھا   میں تھا اور عالمِ تنہائی تھا
کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ   جس سے آگے کو کُھلی راہ نگاہ
پڑی اک غار پہ واں میری نظر   جس کی صورت سے برستا تھا خطر
موت کھولے ہوئے تھی منہ گویا   جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک مرد غریب   جس کو روتے ہیں کھڑے اُس کے نصیب
جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی   یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی
جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش   غار کے منہ میں پڑا ہے مدہوش
اپنی ہستی کی نہیں اُس کو خبر   اور قضا کھیل رہی ہے سر پر
اجل آ جائے تو ہے روک نہ تھام   ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام
اتنے میں اور جو بجلی چمکی   شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی
مرد نکلا وہ شناسا میرا   تھا مگر خون کا پیاسا میرا
مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری   ایک مدت سے چلی آتی تھی
واں عداوت پہ گر آؤں اپنی   اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی
مارنا اُس کا نہ تھا کچھ دشوار   اک اشارے میں وہ تھا لقمۂ غار
آ گیا مجھ کو مگر خوفِ خدا   اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا
مرتے کو مارنا بے دردی سے   ہے بہت دُور جواں مردی سے
حوصلے کا ہے یہی وقت، کہ آج   ہے عدو اپنی مدد کا محتاج
جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار   کہ اسے کیجیے چل کر بیدار
واں سے جا اُس کو اُٹھا لایا میں   موت کی زد سے بچا لایا میں
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا   اُس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

سُن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا   اور چھاتی سے لیا اُس کو لگا
پھر بڑے بیٹوں کو بلوا کے کہا   بولو اب، کس سے ہوا کام بڑا؟

داستاں جب یہ سنی دونوں نے   باپ سے عرض کی یہ دونوں نے
خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف   پوچھیے ہم سے تو ہے یہ انصاف
جس جواہر کے طلب گار تھے ہم   اس کے لائق تھے نہ حق دار تھے ہم
اور کو اس کی ہوس ناحق ہے   حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے
باپ یہ سُن کے ہوا شاد بہت   اُن کے انصاف کی دی داد بہت
چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس   پہلے خالق کا کیا شکر و سپاس
پھر جواہر اُسے دے کر یہ کہا   لو، یہ ہو تم کو مبارک بیٹا!

☆☆☆☆

برکھارُت

گرمی کی تپش بجھانے والی   سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان   عارف کے لیے کتابِ عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی   وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات   وہ کون؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد   اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان   سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار   اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا   اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں   اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے   اور ہانپ رہے تھے چارپائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے   اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ   ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں ست   گھڑیال تھے رودبار میں ست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا   بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا

بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں   اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ   تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا   اور اَنس نکل رہا تھا سب کا
طوفان تھے آندھیوں کے برپا   اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لُو کے چلتے   شعلے تھے زمین سے نکلتے
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام   تھا آگ کا نام مفت بدنام
رستوں میں سوار اور پیدل   سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل
گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں   ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک   پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی   وہ بادِ سموم سے سوا تھی
بجھتی نہ تھی آتشِ درونی   لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک   جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک
ٹٹی میں تھا دن گنواتا کوئی   تہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سنسان   آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
چلتی تھی دکان جن کی دن رات   بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا   یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
تھا شہر میں قحط آدمی زاد   سلطان کا اک کنواں تھا آباد
پانی سے تھی سب کی زندگانی   میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں لپکتی   فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
پھل پھول کی دیکھ کر طراوت   پاتے تھے دل و جگر طراوت
کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی   بھر آتا تھا سن کے منہ میں پانی
تھے جو خفقانی اور مراقی   گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
کھانے کا نہ تھا اُنھیں مزا کچھ   آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
بن کھائے کئی کئی دن اکثر   رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر

شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے   مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے
اور صبح سے شام تک برابر   تھا العطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال   کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دم   تھے پانی کو دیکھ کرتے ”مم مم“
ہر بار پکارتے تھے ماں کو   ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لا کر   پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر
بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر   تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر
تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری   پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور   پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پُروا کی دہائی پھر رہی ہے   پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا   اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے   اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے   گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی   اک آتی ہے فوج اک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے   ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی   چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینہ کا ہے زمین پر دریڑا   گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی   آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں   جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی   قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے منہ پر   اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت   کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار   انکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی   عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار   دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل   ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو   اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سُو
کوئل کی ہے کُوک جی لبھاتی   گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے   سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر   پانی میں مگر، کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست   قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گِھر کے آسماں پر   کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ورد اہلِ تقویٰ   "یا رب لنا ولا علینا"
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا   کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو، گرو گرنتھی   گاتے ہیں بھجن، کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملھار گاتا   ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے   اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا   چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے   ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے
کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھشا   تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

* * *

ہیں شکر گزار تیرے برسات   انساں سے لے کے تا جمادات
دنیا میں بہت تھی چاہ تیری   سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت   راحت ملتی ہے بعدِ کلفت
شکریہ فیضِ عام تیرا   پیشانیِ دہر پر ہے لکھا
گلشن کو دیا جمال تُو نے   کھیتی کو کیا نہال تُو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا   کوئل کو الاپنا سکھایا

جب مور ہے ناچنے پہ آتا   آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا
کوئل کو نہیں قرار اک پل   ایسی کوئی تُو نے کوک دی کل
شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں   کیا پڑھ دیا آ کے تُو نے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا   اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن   کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ   اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ
دریا تجھ بن سسک رہے تھے   اور بن تری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تُو نے ڈال دی جان   اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی   ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی
جو دانے تھے خاک میں پریشان   سب آ کے چڑھائے تُو نے پروان
دولت جو زمیں میں تھی مخفی   آگے ترے اُس نے سب اُگل دی
پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر   واں سبزہ و گل ہیں جلوہ گستر
جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے   باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے   واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار   ہے بیر بہٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں   جھولے ہیں کہ سُو بہ سُو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن   جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری   اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی   جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے   اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے اُن میں کوئی ملھار گاتی   اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا   کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر   سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں   تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی   اور تیر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی   مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے   دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی   موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں   موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان   بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجدھار کی رو بھی زور پر ہے   مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

بیزار اک اپنی جان و تن سے   بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا   چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو   اک باغ میں ہے پڑا لب جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی   آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر تنے میں اک طرف سے اٹھا   اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم   اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے   تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے   یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم   وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا   اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
اے چشمۂ آبِ زندگانی   گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری   بستی ہے اُسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو   دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اول کہیو سلام میرا   پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا   فرقت میں تمہاری آئی برکھا

آتا ہے تمہارا دھیان جس دم   مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تو یونہی صبح و شام اکثر   تالاب میں تیرتے تھے جا کر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے   صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی ہات میں دیے ہات   پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا   میں تم کو ادھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو   دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار   جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی   چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی   پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد   جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی   فریاد یہ درد ناک اُس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز   پکڑا دل سن کے اُس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر   روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی   نکلا وہ ہمارا دوست حالؔی

☆☆☆☆

الطاف حسین حالؔی

نظمیں دورِ دوم

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدر داں اُن سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
"تعرف الاشیاء بالاضداد" ہے قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف، چپکے سے کہا
ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغ ارم

☆☆☆☆

قانون

کہتے ہیں ہر فرد انساں پر ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے کے سوا

اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا!
پر اسے دیتے ہیں توڑ ایک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کمزوروں کے لیے قانون وہ
اور نظر میں زور مندوں کی ہے لا

☆☆☆☆

تدبیرِ قیامِ سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اُسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

☆☆☆☆

قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہلِ ملک کو
گو کہ ان کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر

کارخانے کا یہ راجس کے کبھی چاقو نہ لیں
اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انھیں
ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا، قصہ مختصر
سن کے حالؔی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبع بشر

☆☆☆☆

الطاف حسین حالؔی

رباعیات: دورِ اول

ہو عیب کی خُو، یا ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور پھر عمر بھر کی عادت

☆☆

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ، وفا پہ، جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

☆☆

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے
اک خستہ جگر کی رات کیوں کر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے

☆☆

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ؟
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

☆☆

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

☆☆☆☆

الطاف حسین حالؔی

رباعیات: دورِ دوم

ہستی تری کو نہیں ہے محتاجِ دلیل
صبرِ دلِ مضطر کی مگر کیا ہے سبیل
یہ طبعِ خسیس مطمئن ہو کیوں کر
بے دیکھے ہوا نہ مطمئن جب کہ خلیل

☆☆

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور
ادراک سے اوجھل تو نظر سے مستور
یہ حسرتِ دید دل میں قائم رکھیو
بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نُور

☆☆

سقراط منادی میں تری کام آیا
سر تیرے لیے حسین نے کٹوایا
مر کر کوئی پائے یا سر کٹوا کر
پایا تجھے جس نے اُس نے سب کچھ پایا

☆☆☆☆

الطاف حسین حالی

مرثیۂ غالب کے چند بند

جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر
تُو نے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ
ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی
صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس
جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے
شان ہو جس میں دل ربائی کی
جنس کاسد سے ناروا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنجِ شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

☆☆☆☆

الطاف حسین حالؔی

طنزیہ و مزاحیہ شاعری

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا زینت و اسباب پہ جو لوگ
اتراتے ہیں، اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے

حالؔی نے کہا جن کو ہے اترانے سے نفرت
اترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے

☆☆☆☆

سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیے سیّد سے صاف اے حضرت والا نہیں

کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں

آپ بھی نام خدا، ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ
اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں

خود نبوت پر سنے ہیں ہم نے ایراد آپ کے
اور اُلوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں

چشمِ بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سیّد پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں

سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے، سن لو صاحب، تم سے کچھ پردا نہیں

رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

☆☆☆☆

قحطِ اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم پُرنم، اپنا تھا یا پرایا

دنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مریدِ صادق
یہ کہہ کے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا

ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اس کو بھی رلایا

☆☆☆☆

رؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت
بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا

بولے آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
عاملانِ شہر مدعو اس کے رہتے ہیں سدا

ضلع کے حکّام کا ادنیٰ اشارہ چاہیے
پھر کوئی دیکھے سخاوت اس کی اور بذل و عطا

یادگاریں جتنی ہیں اعیان دولت کی بنیں
ان میں صرف اس کی رقم ہے سب کے چندے کے سوا

پالکی یا ویگٹ ہے جو سواری اس کے پاس
اہل کاروں کے لیے ہے وقف، بے چون و چرا

کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس
اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رو و ریا

جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ ان سے حالؔی نے بصد منت کہا

عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ایمان کی تعریف

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف
تو دی چراغ سے اس کو بہ آب و تاب مثال

کہا فتیلۂ اقرار بالساں ہے ضرور
جہاں ہو آتش تصدیق و روغن اعمال

کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل
نہیں ضرور فتیلے کا جس میں استعمال

☆☆☆☆

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں (غزلیات در زمینِ حالی)

یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں (انتخابِ شعرِ حالی)

دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

(پاکستانی زبانوں کے ادب پر حالی کے اثرات)

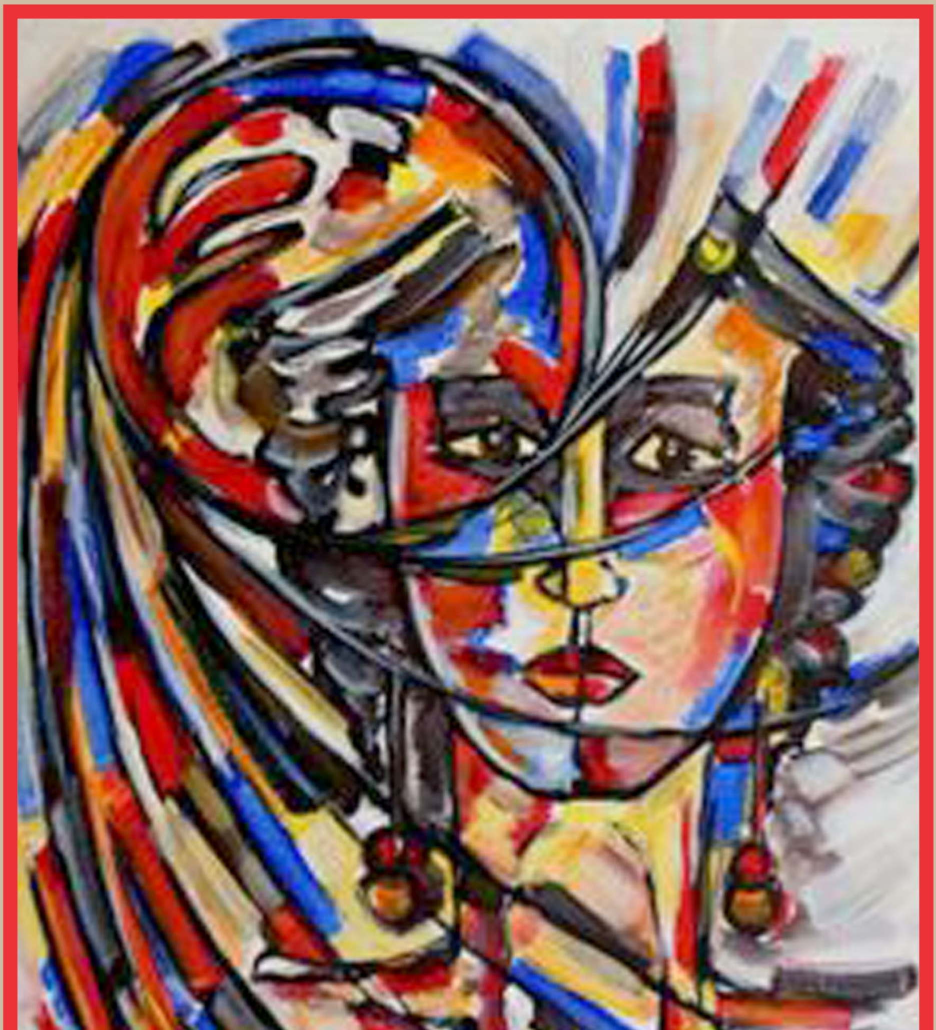

نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں (انتخابِ نثرِ حالی)

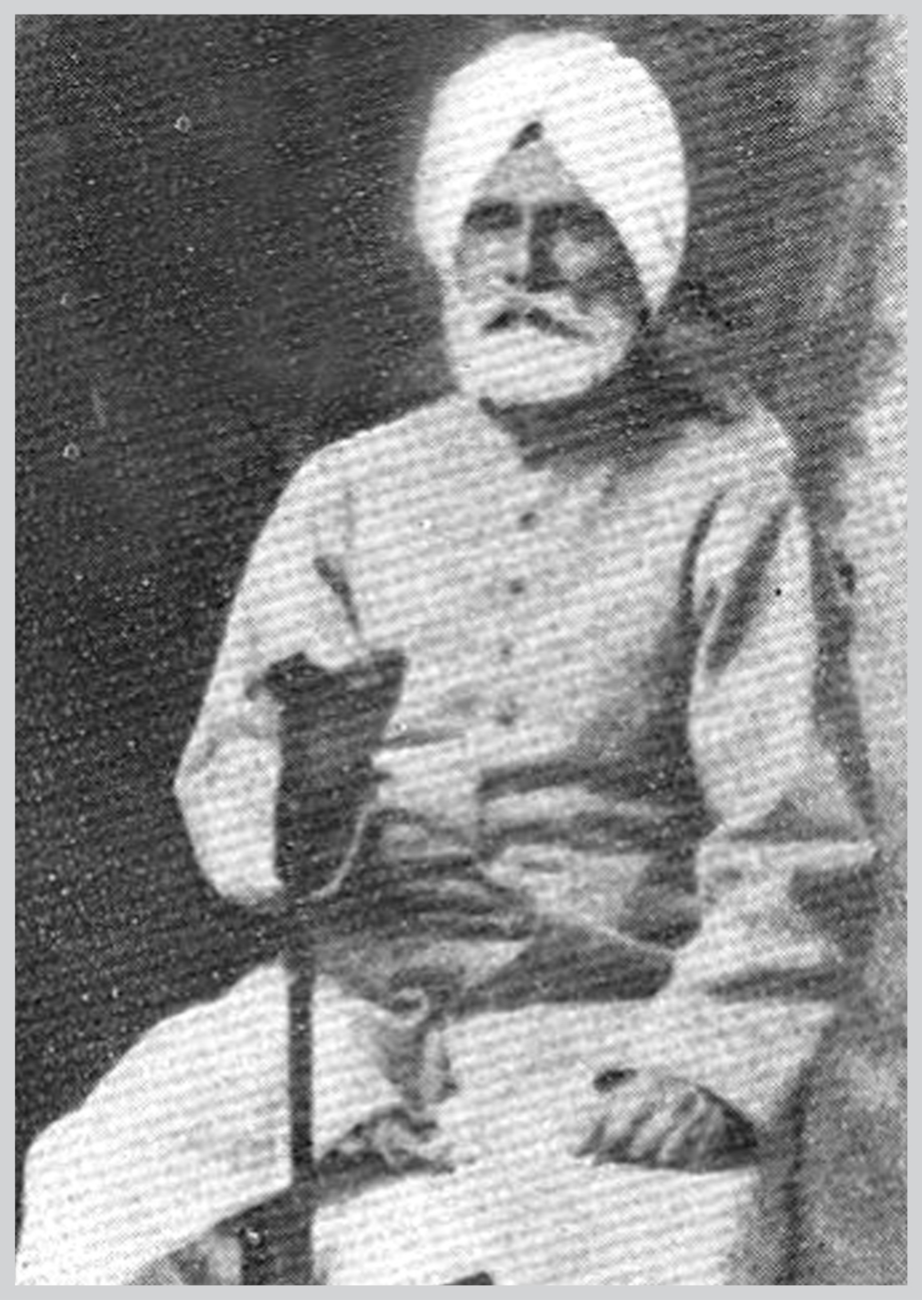

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر (توشۂ خاص)

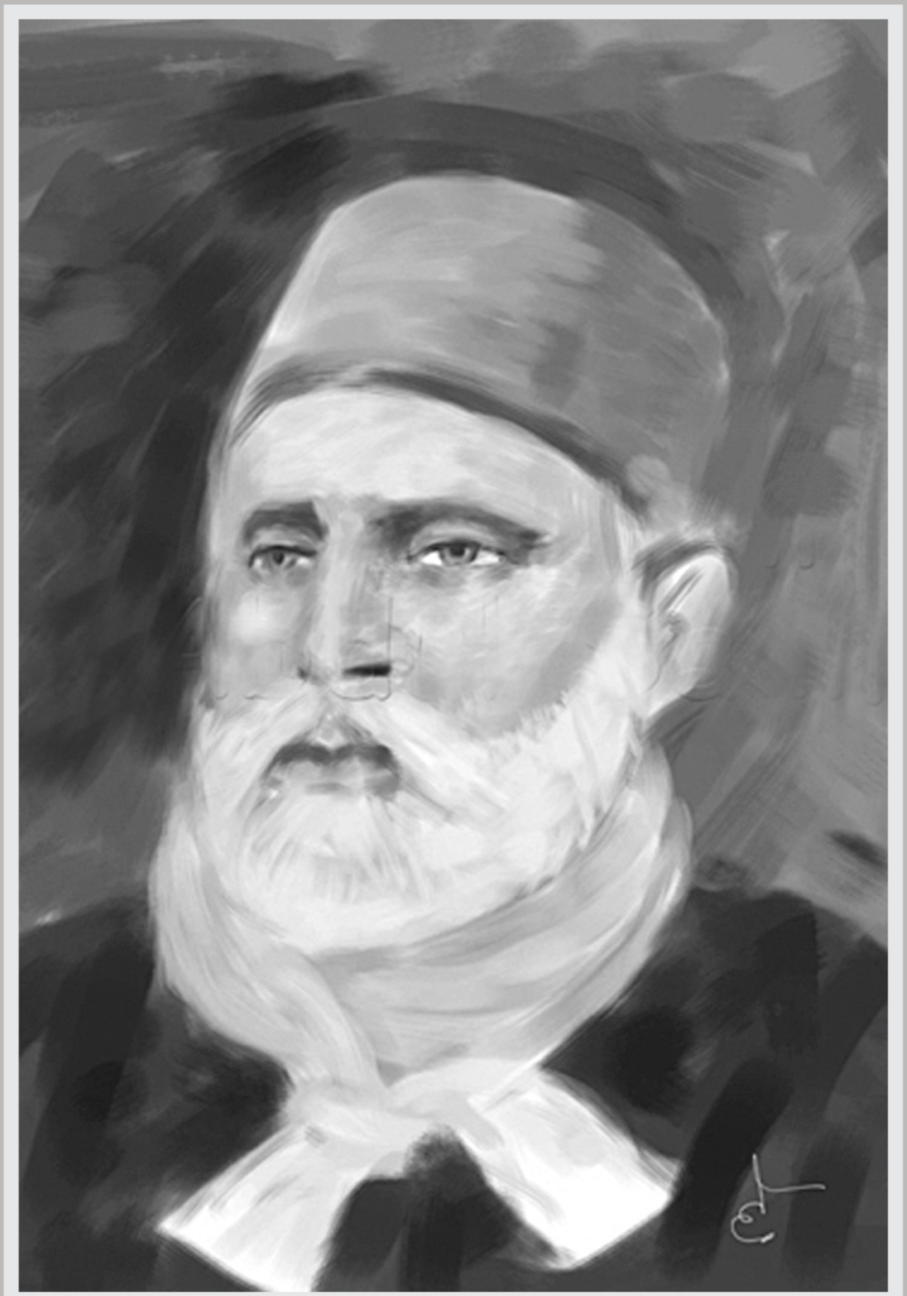

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں (مضامین)

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

January to March 2015

ISSN: 2077-0642

ادبیات کے خصوصی شمارے

ادبیات
بچوں کا ادب
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
1894 - 1982
اکادمی ادبیات پاکستان

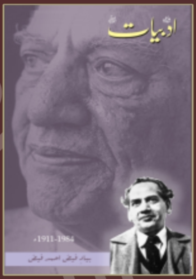
ادبیات
1911-1984

ادبیات
بچوں کا ادب
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
1914-1983
1923-1987
1923-2002
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
1931-2008

ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk